قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

مارچ 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

امیر خسرو کی مثنوی 'مطلع الانوار'

بچوں کا ادب سطحِ اول کے حوالے سے

اسماعیل میرٹھی کی مثنوی 'پن چکی'

مجروح سلطانپوری

ساحر کی ساحرانہ شاعری

حنیف کیفی

2020 کا فکشن اور فکشن تنقید

شہر آگرہ

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

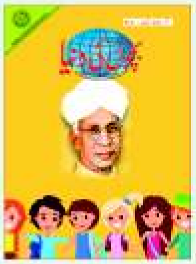

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:03، مارچ 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

نقد و نگاہ

امیر خسرو کی مثنوی 'مطلع الانوار' — عبدالحق 9

بچوں کا ادب سطح اوّل کے حوالے سے — ذکیہ مشہدی 11

ڈاکٹر معین الحق: بہ حیثیت مترجم تاریخ فیروز شاہی — علیم اشرف خان 13

اسماعیل میرٹھی کی مثنوی پن چکی کا جائزہ — محمد مستمر 16

مجروح سلطانپوری کا ابتدائی ادبی سفر — امین احسن 18

جموں و کشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ — محمد یاسین گنائی 21

صدی شخصیت

ساحر کی ساحرانہ شاعری — قیوم بدر 25

ذکر حنیف کیفی

حنیف کیفی — کوثر مظہری 27

حنیف کی شاعری میں دردِ انسانیت — اظہر ابرار 30

حنیف کیفی: کوائف و کیفیات — محمد اکرام 32

جائزہ

2020 کا فکشن اور فکشن تنقید — اسلم جمشید پوری 36

زبان و تعلیم

بچوں میں تحصیل زبان سے متعلق نفسیاتی نظریات — آفاق ندیم خان 40

خراج عقیدت

مختار شمیم — رؤف خیر 43

زبیر الحسن غافل — عبدالغنی 46

ماہ و انجم

کوثر چاندپوری کی افسانہ نگاری — شاداب تبسم 48

ہرچرن چاولہ بہ حیثیت افسانہ نگار — تسنیم فاطمہ 51

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت — زاہد احسن 54

نگر نگر اردو

شہر آگرہ کا ادبی تعارف — محمودہ قریشی 56

خصوصی گفتگو

سیفی سرونجی سے انٹرویو — استوتی اگروال 60

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — زیب النسا 64

نیا آسمان نئے ستارے

اردو کتب و رسائل و جرائد کی اشاریہ سازی — محمد غازی فہیم الدین 66

یادیں باتیں

خضرِ بے منزل: حسن بشیر مرحوم — سید صفدر 68

طب اور ادب

دردِ دل — اشرف آثاری 71

فلم

مجروح سلطان پوری اور فلمی نغمے — سریتا چوہان 73

کمپیوٹر

ورک شیٹ کو سجانا 75

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 77

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنسی علوم کے حوالے سے اردو زبان بے مایہ ہے، اس کے اندر جدید تکنیکی علوم اور موضوعات کو انگیز کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اردو محض شعر و غزل اور داستان و افسانے کی زبان ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اردو زبان سائنسی اور علمی مضامین ادا کرنے کی قدرت سے محروم ہے۔ آج بھی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو زبان میں سائنسی و تکنیکی علوم کے بیان و اظہار کی قدرت نہیں ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی مضامین اردو زبان میں بہت پہلے سے لکھے بھی جا رہے تھے اور دیگر زبانوں سے اردو میں ان کے ترجمے بھی ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں شہرہ آفاق دہلی کالج کا ذکر ضروری ہے کہ اس میں تمام جدید علوم مثلاً جغرافیہ، ریاضی اور کیمیا وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی سے تقریباً بہت سے سائنسی کتابوں کے ترجمے کیے جا چکے تھے۔

اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن میں تمام علوم (بشمول سائنس) کی تدریس اردو زبان میں کی جاتی تھی جبکہ اس جامعہ کا ایک وسیع شعبہ تصنیف و تالیف کا بھی تھا جہاں ہمہ وقت سائنسی و علمی تراجم کا کام جاری رہتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ ہی کے تحت سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ بھی باقاعدگی کے ساتھ کیا گیا، تاکہ انھیں درس و تدریس میں استعمال کیا جا سکے۔ یہ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز حقیقت ہے کہ 1947 تک تقریباً پانچ لاکھ سائنسی و علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا جا چکا تھا۔

اسی طرح اردو زبان میں سائنسی ترجمے کی خدمت 1862 میں سرسید احمد خان کے ذریعے قائم کردہ 'سائنٹفک سوسائٹی' نے بھی انجام دی۔ اس سوسائٹی کے تحت اردو زبان میں سائنسی مضامین کا نہ صرف ترجمہ کیا جاتا تھا بلکہ باقاعدہ اجتماعات اور جلسوں میں انھیں حاضرین کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ بعد کے ادوار میں اردو میں کئی سائنسی رسائل بھی نکالے گئے۔ جن میں انجمن ترقی اردو ہند کا رسالہ 'سائنس' خصوصاً قابل ذکر ہے۔ سہ ماہی سائنس کی دنیا اور ڈاکٹر اسلم پرویز کی ادارت میں ماہنامہ سائنس شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اردو رسائل اور اخبارات میں سائنسی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے جدید سائنسی موضوعات پر اب تک بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

الغرض اردو اور سائنس کے باہمی روابط یا اردو زبان میں سائنسی موضوعات کے اظہار و پیشکش میں کمزوری کا مفروضہ تاریخی اعتبار سے غلط ہے، گرچہ اس غلطی کا سلسلہ آج تک چلا آ رہا ہے اور عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اردو زبان یا اردو والوں کا مزاج سائنسی نہیں ہے۔ ہمیں سب سے پہلے تو مضبوطی کے ساتھ اس مفروضے کو رد کرنے کی ضرورت ہے، جب تک یہ واہمہ ہمارے ذہن و دماغ سے دور نہیں ہوتا، اس وقت تک اردو میں سائنسی و تکنیکی تعلیم کے مسائل و مشکلات حل نہیں ہوں گے۔

اس مفروضے سے نمٹنے اور اردو میں سائنسی و تکنیکی تعلیم سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد ہمیں اردو نصاب کو اس طرح ترتیب دینا ہوگا کہ اس میں موجودہ دور کے عالمی مسائل اور سائنس و ٹیکنالوجی کی معلومات بھی موجود ہوں۔

ہمیں اپنے ذہن میں یہ بات بٹھانی ہوگی کہ جس طرح مذہب اور سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں اسی طرح کسی زبان اور سائنس میں بھی کوئی تصادم نہیں ہے۔ زبان اور سائنس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ سائنسی تعلیم و ترقی کسی مخصوص زبان کے ساتھ مربوط نہیں ہے، بلکہ سائنس انسان کی تحقیق، محنت اور جستجو سے ترقی حاصل کرتی ہے۔

اردو میں تدریس کے لیے سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا اس دور کی اہم ضرورت ہے۔ تاکہ نئی نسل کو اردو زبان کے ذریعے سائنسی موضوعات سے متعارف ہونے اور سائنس کا ذوق و شوق پیدا کرنے کا موقع ملے۔ ہمیں ترجمہ نگاری کے ذریعے مغربی ممالک کے ترقی یافتہ سائنسی اور ٹیکنالوجی کے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوگا اور اس کے بعد انھیں درس و تدریس کے سہارے لوگوں میں عام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ادارہ جاتی سطح پر منصوبہ بندی بہت ضروری ہے۔

شیخ عقیل احمد

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

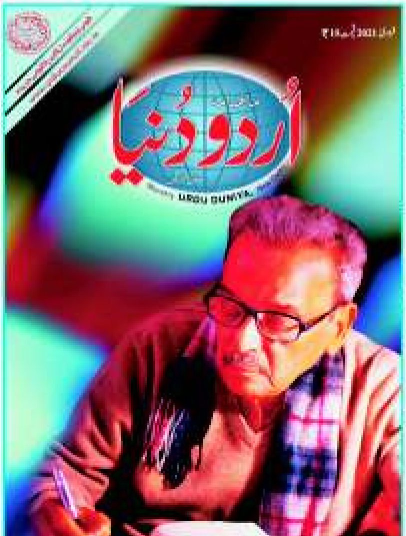

ابھی نئے سال 2021 کا پہلا شمارہ میرے مطالعے میں ہی تھا کہ دوسرا شمارہ (فروری 21) بھی مل گیا۔ آپ جس پابندی وقت اور نہایت اہتمام کے ساتھ 'اردو دنیا' کو شائع کر رہے ہیں وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ لاک ڈاؤن جیسے حالات میں بھی 'اردو دنیا' وقت پر اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کرنا میری نظر میں ایک بڑی اہم اور تعجب خیز بات ہے کہ ان حالات میں رسالہ نہ آن لائن شائع ہوا اور نہ کبھی ناغہ ہوا ہے۔ یقیناً اردو رسالوں کی دنیا میں 'اردو دنیا' کی اشاعت واقعی ایک ریکارڈ ہے اور ہر شمارہ خوب سے خوب تر کی کوششوں کا آئینہ دار ہے۔ اس سلسلے میں آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔

تازہ شمارے کے سرورق پر محترم شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم کی تصویر دیکھ کر بے اختیار آنکھوں کے سامنے ان کی شخصیت اور فن کے کئی جہان روشن ہو گئے۔ واقعی وہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ ان کی رحلت سے اردو ادب کا ایک بڑا اور ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ مرکزی حکومت کے ایک اہم محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہتے ہوئے آپ نے اردو زبان و ادب کی جو مثالی خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ نے اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا اور اپنی بے مثال تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں سے ادب کے دامن کو مالا مال کیا اور ہر فن میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ وہیں ادب میں جدیدیت کی تحریک کے ذریعے آپ نے ادب میں اس وقت کے ادبی جمود کو توڑا اور لکھنے والوں کو متحرک کیا۔ اس تحریک کے آپ بانی رہے اور آپ کے رسالہ 'شب خون' نے اس تحریک کو مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ 'یادِ فاروقی' کے تحت اُن کی شخصیت اور فن پر' آپ نے فوری طور پر اور اتنے کم وقت میں ایک نہیں دو نہیں چار مضامین کی شمولیت سے اردو ادب کی اس عظیم شخصیت کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اردو رسالوں میں سب سے پہلے ان کی خدمات پر گوشۂ اعتراف اردو دنیا نے کیا ہے جسے آپ کے ادارتی کمال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس رسالے کی ترتیب و تہذیب اور تدوین سے ہر شمارے میں ایک ندرت اور جدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے مشمولات قابل مطالعہ اور وقیع ہوتے ہیں۔ وہیں ان کا انتخاب بھی لاجواب ہوتا ہے۔ اس کی داد نہیں دینا ادبی بددیانتی کے مترادف ہوگا۔ ساتھ ہی مستقل کالم بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور تازہ ترین ادبی صورت حال سے اردو کے عام قاری کو واقف کرواتے ہیں۔ غرض ہر بار 'اردو دنیا' کو صوری و معنوی اعتبار سے ایک مکمل اور منفرد رسالہ بنانے میں آپ کی کوششیں اور کاوشیں لائق صد ستائش ہیں۔ آپ کی اس کامیابی پر دلی مسرت ہوئی ہے۔

❖ **ڈاکٹر عظیم راہی**: کریم کالونی، روشن گیٹ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

فاروقی سرورق سے مزین فروری 2021 کا اردو دنیا نظر نواز ہوا، خدائے بزرگ اس رسالے کو تادیر سلامت رکھے۔ اداریہ بہت خوب بہت اچھا ہے۔

نارنگ صاحب کا یہ کہنا کہ فاروقی کے بغیر اردو ادب ادھورا ہے، ایک مبنی برحق بیان ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ نارنگ اور فاروقی تک اردو ادب مکمل تھا لیکن ایک چراغ بجھ جانے کے باعث یقیناً اب اردو ادب ادھورا ہو گیا۔ دوسری طرف یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ذوق کی حیات میں غالب کا انتقال پرملال ہو گیا۔

مرحوم کے بارے میں میں تو یہی کہوں گا کہ

وہ یقیناً قابل تقلید تھے — مستند وہ ماہر تنقید تھے
کہہ رہی ہے دیکھیے خلق خدا — شمس صاحب لائق تائید تھے
آپ ہی سے نام ہے اس کا ہنوز — آپ ہی شبخون کی تمہید تھے

شعر شور انگیز کی کیا بات ہے — آپ ہی اس کی خوشی تھے عید تھے
شمس کی فکر رسا تھی معتبر — وہ سراپا جہل کی تردید تھے
کہہ رہے ہیں کارنامے شمس کے — محترم تنقید کی تجدید تھے
آپ کی ہر دل عزیزی خوب تھی — آپ شہر فن میں شوق دید تھے
منسلک زندہ دلی تھی آپ سے — زندگی سے آپ کب نومید تھے
شخص بھی تھے شخصیت بھی شمس جی — وہ سراپا صورتِ تشدید تھے
منفرد تھی شخصیت مرحوم کی — آپ محوِ مستقل تسوید تھے
دیکھنے والوں نے دیکھا ہے انھیں — شمس صاحب عالم تجوید تھے

❖ **شکیل سہسرامی**: نزد رحمان مسجد، بمن پورہ، راجہ بازار، پٹنہ 14

فروری ماہ کے شمارے کے اداریے میں اس بار مدیرِ اعلیٰ جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے جنت نشین ہو چکے شعرا کی عظیم ادبی خدمات اور ان کی وراثت کو مستقبل میں بھی رواں دواں کیے رکھنے کے لیے ان کی سنتانوں کے ذریعے اردو زبان کو فروغ دینے اور اس کے ارتقا کی خاطر مناسب اور کارگر 'اقدام' اٹھانے پر زور دینے کی ضرورت کی صحیح خط کشی کی ہے۔ انھوں نے ایک مدیر کے ناطے اپنے فریضے کو انجام دیا ہے، جو کہ ایک ذمے دار عالم و فاضل مدیر ہونے کا مستند ثبوت ہے۔ فقط ایک سال کے دوران ہی جنت نشین ہوئے اردو زبان کے عظیم ادبا کی بابت اتنا معیاری مواد جمع کر کے شائع کرنا آپ کے ادارے کا کمال ہے۔ یہی اس شمارے کا ایک اہم جمع نقطہ ہے۔

'اردو دنیا' کے سابق نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی نے ایک قابل ادیب محمد خلیل صاحب کی سائنس جیسے موضوع پر خدمات کو بخوبی نشان زد کرنے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ انھوں نے جتنے معقول سوالات کیے ہیں، محمد خلیل صاحب نے اتنے ہی موزوں و مناسب جوابات دے کر اپنی قابلیت کا جامع ثبوت فراہم کیا ہے۔

جناب جاوید احمد نے شاعر نذیر بنارسی کی شاعری میں عصری حسیت کے گوناگون زاویے نشان زد کیے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار عوام میں زبان زد ہو کر ان کی مقبولیت کو چار چاند لگاتے رہے ہیں، مثلاً 'آسماں سے اُتارا گیا/ زندگی دے کے مارا گیا'' وغیرہ۔ آخر میں یہ شعر: ''وقت کی قدر کرو...' وغیرہ۔

اس شمارے کے آخری صفحے 98 پر اردو ادب میں مروجہ ہو چکے غلط ترتیب والے لفظ ''معرکۃ الآرا' کا استعمال متنازعہ فیہ ہے۔ پروفیسر علم الدین کے ایک پرانے مضمون 'غلطی ہائے مضامین : لسانی سیاحت'' (غالباً جریدہ 'ایوانِ اردو' کے اپریل سنہ 2017 کے شمارے میں شائع) میں یہ صحیح درج کیا گیا تھا: ''معرکۃ الآرا' میں 'معرکۃ' 'ال' عربی (لفظ) ہے، جبکہ 'آرا' آراستن مصدر سے فارسی ہے (یعنی عربی اور فارسی دو مختلف زبانوں کا باہم میل غیر ضابطہ ہے، جس کا معنی ہے 'سجانے والا، آراستہ کرنے والا'۔ 'آرا' پر 'ال' لگانا خلافِ قواعد ہے، یہ اصل میں 'معرکہ آرا' ہے۔ یعنی زبردست، پُر زور۔ اس لاحقے (Suffix) کی دیگر مثالوں میں سے بزم آرا، حسن آرا، صف آرا اور تبسم آرا کثر استعمال ہوتی ہیں''۔ (صفحہ 12)

مرحوم جناب جون ایلیا کا یہ ایک شعر ہی اس تبصرہ 'لہجے اور اسلوب کے نئے پن' کو صحیح ٹھہراتا ہے ''یوں جو تکتا ہے آسمان میں تو/ کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا۔''

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

اردو دنیا فروری 2021 اردو زبان و ادب کی قد آور شخصیت اور علم و ادب کے ماہ تمام... مرحوم جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی ذہانت اور متانت سے بھرپور تصویر سرورق کی قدر و قیمت اور نقد و فن کے چندے آفتاب و ماہتاب کی علمی و ادبی دلکشی کو درشاتا ہوا باصرہ نواز ہوا۔ متشکرم

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بہر کیف!

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

آمین!

تمام مشمولات پر مغز عمدہ اور اعلیٰ نصابی معیار و میزان کے عین مطابق ہیں۔ نئے موضوعات پر مشتمل ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ پسند آیا۔ اردو دنیا کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت انھیں انفرادی خصوصیات بطور خاص اداریہ کی مرہون ہے۔

❖ **رضوانہ پروین**: پٹنہ، بہار

پہلی تخلیق پہلا تاثر

ایک تخلیق کار یا قلم کار پہلا اسکول، پہلی کتاب، پہلا بستہ، پہلا استاد، ماسٹر جی کی پہلی چھڑی کی مار کبھی بھی نہیں بھولتا۔ میرے پاس بھی یادوں کی پوٹلی میں کچھ ایسے ہی سنہرے پل قید ہیں جس نے میرے آگے کے سفر کو طے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سب سے پہلے اپنی ڈائری میں لکھنا شروع کیا۔ میری ڈائری میں میرے سارے اچھے برے تجربات و مشاہدات قید ہوتے تھے۔ عید کی خوشی ہو، یا نئے کپڑے سلے جانے کی خوشی، کسی نے گھر سے جاتے ہوئے پیسے دیے، تو کسی نے بلاوجہ ڈانٹ دیا ہو، اسکول میں کسی سے لڑائی ہوئی ہوں، کم مارکس ملے ہو یا کلاس میں فرسٹ آنے کی خوشی ہو، استاد سے ملا انعام ہو یا فیرویل پارٹی وہ سب میری ڈائری میں محسوسات کی شکل میں قید ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے میرا رجحان قصے کہانیوں میں اتنا بڑھا کہ وہ کب کہانی کی صورت میں کاغذ پر اترنے لگا مجھے بھی پتہ نہیں چلا۔ میں نے لکھنا بہت کم عمر میں سیکھ لیا تھا لیکن یہ لکھنا کیسا تھا، کیا تھا کچھ خبر نہیں تھی، نہ کبھی کسی کو دکھانے کی ہمت، کیا سوچیں گے لوگ، کیا بیوقوفی ہے یہ؟ یہ سب فالتو باتیں کون پڑھے گا؟ کوئی زبان و بیان کی غلطی ہوئی تو؟ کسی نے ڈانٹ دیا تو؟ کہیں میرا مذاق نہ بن جائے جیسے نہ جانے کتنے خیالات نے مجھے اندر سے جکڑ رکھا تھا۔ اس لیے کبھی دوستوں سے بھی بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شاعری کا شوق بھی دل میں دبا رہا کہیں لوگ مجھے غلط نہ سمجھ لیں، اب ان نادانیوں پر صرف مسکرانا آتا ہے لیکن دل و دماغ کی یہ جنگ کبھی مجھے احساس کمتری میں بھی مبتلا کر دیا کرتی تھی۔ خیر میں اسکول سے الہ آباد یونیورسٹی پہنچی۔ اساتذہ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ پتہ لگائیں کہ ان کے طلبا، کورس کی پڑھائی کے علاوہ بھی کچھ جانتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے پتہ ہی نہ چلا کہ کون لکھتا ہے کون نہیں، نہ طلبا میں اس طرح کا کوئی تجسس یا شوق۔ یہاں بھی ڈائری میں حروف قید ہوتے رہے۔ آخر کار میں دہلی آئی جس نے مجھے پنکھ دے دیا....... آج میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی کی اردو تنظیموں کی تربیت نے مجھے مجھ سے ملا دیا۔ مجھے ہمت اور حوصلے سے بھر دیا۔ میری دبی کچلی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کا پلیٹ فارم دیا۔

خیر تو میں یہ بتا رہی تھی کہ دہلی آ کر میں نے دیکھا کہ بی۔ اے کے طلبہ بھی صاحب کتاب ہیں۔ ہر کسی کی تخلیق شائع ہو رہی ہے میں نے بھی جاننے کی کوشش کی کہ اخباروں اور رسالوں میں شائع کیسے ہوتے ہیں؟ کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات نقش تھی کہ رسالوں میں بہت بڑے لوگ ہی شائع ہوتے ہوں گے، مجھ جیسے طالب علم کا لکھا

کون پڑھے گا؟ لیکن میری یہ غلط فہمی دور ہوئی اور میں نے ہمت کر کے اپنے مضامین رسالوں میں بھیجنے شروع کر دیے، وقت گزرتا رہا لیکن کہیں کچھ نہ ہوا۔ مجھے لگا میں صحیح تھی کون پڑھے گا مجھے۔ ایک دن جامعہ کے گراونڈ میں بیٹھ کر میں اپنی سہیلی سے رسالوں میں مضامین کیسے شائع ہوتے ہیں؟ کے موضوع پر بات کر رہی تھی کہ اس نے NCPUL کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہاں سے کئی اردو کے معیاری رسالے نکلتے ہیں۔ جو پورے ہندستان میں شوق سے پڑھے جاتے ہیں تم اس میں کیوں نہیں بھیجتی۔ میں نے پہلی بار NCPUL کا نام سنا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے کام کرنے والے ہندستان کا سب سے بڑا ادارہ۔ یہ سنتے ہی مجھے NCPUL کی آفس دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میری خوشی دوگنا یہ جان کر بڑھ گئی کہ جامعہ سے جسولہ بالکل پاس ہے جہاں NCPUL کا مین آفس ہے۔ خیر میں NCPUL کے شاندار آفس میں گئی لال بلڈنگ دیوار اینٹوں کے کانسپٹ والی۔ ڈھال والی سیڑھی سے چڑھ کر مین گیٹ شیشے کا دروازہ پار کرتے ہی بالکل سامنے گارڈ بھائی شاندار بلیک ہیٹ، آسمانی شرٹ، بلیک پینٹ پہنے کرسی پر بیٹھے دیکھتے ہی آنے کی وجہ پوچھی اور رجسٹر میں انٹری کرائی۔ میں نے لائبریری آنے کی وجہ لکھی، کیونکہ لائبریری میں ہی رسالوں سے جڑی انکوائیری کے لیے ساجدہ اپی بیٹھی ہوتی ہیں جو کہ مجھے وہاں جا کر پتہ چلا۔ میں نے NCPUL سے نکلنے والے رسالے اردو دنیا، بچوں کی دنیا اور فکر و تحقیق کی ممبر شپ لی، جو آج تک ہوں۔ وہاں کا مخلص اسٹاف جس نے مجھے نہ صرف رسالوں کے بارے میں بتایا بلکہ مجھے ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ای میل ایڈریس دیا کہ اس میں مضامین بھیجو۔ مجھے یاد ہے کہ تبصرے کے لیے 'پنچھی جہاز کا' کے عنوان سے کتاب ملی۔ میں اردو تبصرے سے بھی پہلی بار واقف ہوئی۔ خیر میں خوشی خوشی گھر واپس لوٹی اور پوری محنت سے کتاب کا ایک ایک ورق پڑھا اس پر تبصرہ لکھ کر میل کر دیا یہ سوچ کر کہ شائع تو ہوگا نہیں لیکن چلو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ مہینہ بھر گزر گیا اور پھر ایک دن موبائل پر گھنٹی بجی رسیو کیا تو آواز آئی۔

ہیلو........ آپ صالحہ صدیقی صاحبہ بول رہی ہیں۔ جی! بول رہی ہوں آپ کون؟ ادھر سے آواز آئی آپ کا تبصرہ ہمارے رسالے میں شائع ہوا ہے برائے مہربانی اپنا ہوم ایڈریس ایس ایم ایس کر دیں۔ یہ سن کر میری سانسیں تھم گئیں، یقین نہیں ہو رہا تھا کہ واقعی میرا تبصرہ اردو دنیا میں شائع ہو چکا ہے۔ خوشی سے میں سُن پڑ گئی۔ ادھر سے ہیلو ہیلو کی آواز آتی رہی پھر میں نے کہا جی! ابھی سینڈ کرتی ہوں۔ کہہ کر فون کاٹ دیا اور جلدی جلدی ایڈریس ٹائپ کر کے سینڈ کر دیا۔ اب تو ایک ایک دن گزرنا مشکل۔ روز رات کو سوچتی پیج کیسا ہوگا؟ میرا نام لکھا ہوگا؟ کور پیج کیسا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ نہ جانے کتنے سوالات ذہن میں گھومتے اور انھیں سوالوں میں الجھی نیند کی آغوش میں چلی جاتی۔ خیر ایک ہفتے تک شدت سے انتظار اور تجسس میں کاٹنے کے بعد رسالہ میرے ہاتھوں میں تھا گرین کلر کا خوبصورت کور پیج اس رسالے ہی میں میرا تبصرہ 'پنچھی جہاز کا' مبصر صالحہ صدیقی (ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) پرنٹ تھا۔ رسالہ دیکھنے کا یہ منظر ہمیشہ ہمیش کے لیے میرے ذہن و دل میں قید ہو کر رہ گیا۔

یہ تھا میرا اردو دنیا میں شائع ہونے کا ''پہلی تخلیق کا پہلا تاثر''۔ دہلی میں بیٹھے اسکالرس اور طلبہ کے لیے شاید کچھ بھی نہ ہو مگر میرے لیے وہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ اس کے بعد میرے اندر ایک نیا کانفیڈنس آیا میں نے لکھنا اور شائع ہونا شروع کر دیا۔ اللہ کا کرم ہے وہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

❖ **صالحہ صدیقی**: الہ آباد، یوپی

✍ جون 2020 کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا اور تاخیر سے خط لکھنے کا باعث کشمیر کے حالات اور کورونا وائرس وبا ہے۔ رسالہ 'اردو دنیا' میں میری پہلی کاوش! جب مجھے ایک دوست نے واٹس آپ پر میسج کے کہ آپ کا مضمون 'اردو دنیا' میں شائع ہوا ہے۔ تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا اور میں نے جلدی سے NCPUL کی ویب سائٹ کھولی اور جون 2020 کا شمارہ دیکھا جس میں میرا مضمون بعنوان 'دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا' چھپا ہوا تھا۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے 'اردو دنیا' اور 'فکر و تحقیق' کا میں خریدار ہوں۔ دونوں رسائل میں ہمیشہ معیاری مضامین ہوتے ہیں۔ دونوں رسائل نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ رسائل ہم طلبہ اور طالبات کے ذہنی معیار کو بلند کرنے اور ادب فہمی میں نہایت معاون ثابت ہوتے ہیں۔

❖ **سجاد احمد صوفی**: حاجن بانڈی پورہ، کشمیر

■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

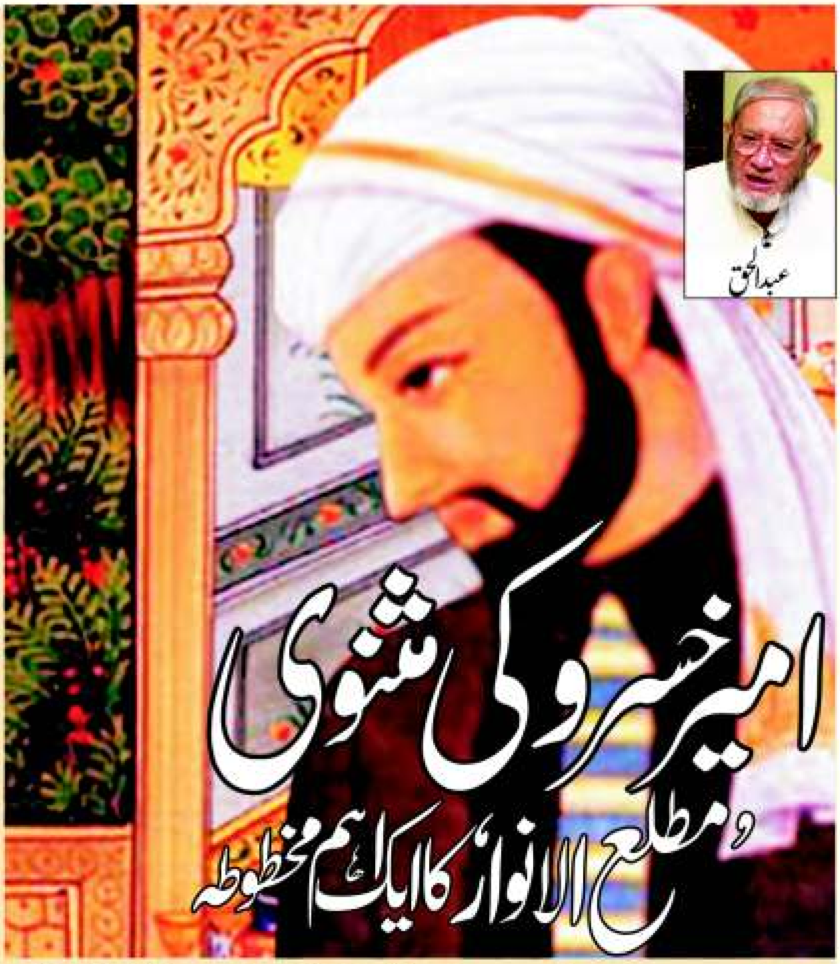

امیر خسرو کی مثنوی
مطلع الانوار کا ایک اہم مخطوطہ

عبدالحق

امیر خسرو فارسی ادب کے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی بزرگی اور عوامی مقبولیت میں خانقاہی سلسلے خواجہ نظام الدین اولیا اور شاہانِ وقت کی نسبتیں بھی شامل ہیں۔ یہی مراسم بہت حد تک ان کی شعری تخلیقات میں تصوف و تاریخ کے حوالے سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا سب سے بڑا تخلیقی سرمایۂ ثروت ان کی مثنویاں ہیں جن میں ان کے تخیل کی بے کرانی اور روز و شب کے مشاہدات کی دنیا آباد ہے۔ غزلیں دوسری جہات اور مختلف اظہار سے معمور ہیں۔ ان میں شبیہ و شخصیت کی دوسری صورتیں بھی موجود ہیں۔

راقم کے نزدیک خسرو اس لیے بھی محترم ہیں کہ اقبال نے کئی مقام پر شعری نذرانے پیش کیے ہیں جن میں عقیدت و احترام کے ساتھ فکر و نظر کی ہم خیالی اہمیت کی حامل ہے۔ ہندوستان کے فارسی شعرا میں چند ہی اقبال کو عزیز ہیں جن میں نظیری نیشاپوری، بیدل اور غالب کو علامہ نے جس طرح یاد کیا ہے وہ بہت ہی معنی خیز اور فکر آفریں ہے۔ نظیری ہندوستان کے نہ تھے مگر زندگی کا آخری حصہ مسکن و مدفن کے طور پر ہندوستان ہی ہے۔ نظیری کو اقبال نے جو خراج پیش کیا ہے وہ مولانا رومی کو بھی نذر نہ کر سکے۔ بیدل شناسی پر اقبال نے کتاب لکھنے کی کوشش کی جو مکمل نہ ہو سکی۔ حالی کے بعد اقبال دوسرے غالب شناس ہیں۔ غالب شناسی میں آج تک ان کا کوئی حریف پیدا نہ ہو سکا۔ اس پہلو پر ابھی تک ہماری توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ اقبال نے آخری کلام ارمغان حجاز کی رباعی میں دعا مانگی ہے۔

عطا کن شورِ رومی، سوزِ خسرو
عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
چناں بابندگی درسا ختم من
نہ گیرم گر میرا بخشی خدائی

یہ آخری تخلیق کا حوالہ تھا۔ ان کی پہلی تصنیف کا اعتراف بھی خیال افروز ہے۔

خسروِ شیریں زباں رنگیں بیاں
نغمہ ہائش از ضمیر کن فکاں

شاعری کو ضمیر کن فکاں کہنا اقبال کی جرأت گفتار کی مثال ہے اور تعارف و تحسین کا بے باک اقرار ہے۔ فارسی میں اقبال نے خسرو کی زمین میں کئی غزلیں رقم کی ہیں۔ خسرو شناسی سے متعلق یہ تمہیدی کلمات تھے جو سخن گستری کے طور پر تحریر کیے گئے۔ مقصد تو ان کے ایک اہم مخطوطے کا سرسری تعارف ہے تاکہ تفہیم خسرو کے لیے ان کے قلمی نسخوں پر نظر رہے۔ یہ بہت ہی افسوس ناک پہلو ہے کہ خسرو کے کلام کی تدوین اور متون کی تصحیح پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ ہم شکر گزار ہیں کہ ظاہر احمد اوغلی نے 1975 میں ماسکو سے مطلع الانوار کے سب سے قدیم مخطوطے کو شائع کیا تھا۔ یہ مخطوطہ 760ھ کا رقم کردہ ہے۔ ابھی حال ہی میں مریم زمانی نے تہران سے تصحیح شدہ ایڈیشن شائع کیا ہے جو قابل قدر اور بہت وقیع ہے۔

ابو محمد الیاس بن یوسف نظامی گنجوی (1140-1202) نے شعری تخلیق میں ایک انوکھی مثال قائم کی ہے۔ ان کی پانچ مثنویاں خمسۂ نظامی یا پنج گنج کے نام سے مقبول ہوئیں۔ ان کی پیروی میں کئی شعرا نے مثنویاں تخلیق کیں۔ امیر خسرو، مولانا جامی اور علی شیر نوائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظامی کی مثنوی 'مخزن الاسرار' بنی نوع انسان کی بزرگی اور حسنِ اعمال و افکار پر مشتمل ہے۔ انسانی کردار کے مختلف اور متنوع پہلو کہانی یا حکایت کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ امیر خسرو (1252-1324) نے بھی اپنے خمسے کا آغاز 'مخزن الاسرار' سے کیا اور 'مطلع الانوار' نام رکھا۔ جو 'وسط الحیات' 'قران السعدین'، 'فتح الفتوحات' کے بعد 698ھ میں رقم کی گئی۔ اس کا بھی مرکزی خیال اور اس

کے متعلقات ہیں یہ 13332 اشعار پر مشتمل ہے۔ تصوف کے فکری و عملی آہنگ سے اسے مربوط کیا گیا ہے۔

امیر خسرو فارسی ادب میں ایک نادر روزگار تخلیق کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدرت نے انھیں بے پناہ تخلیقی توانائی بخشی تھی۔ بیش و کم کے ساتھ وہ ایک درجن شعری مجموعوں کے مالک ہیں جن میں مطلع الانوار کو اولیت کے علاوہ ایک انفرادیت حاصل ہے۔ ان کی دوسری مثنویاں داستانوی رنگ و آہنگ سے معمور ہیں۔ شیریں، خسرو،

لیلیٰ مجنوں، آئین سکندری، ہشت بہشت وغیرہ مگر مطلع الانوار کا بنیادی موضوع انسان اور اس کے روز و شب کے اذکار ہیں۔ اس کی فضیلت اور فیوض کی برکتوں کا بھی بیان ہے۔ انداز بیان داستانوی اور حکایاتی ہے۔ مطلع الانوار کئی بار شائع ہوئی ہے اور اس کے کئی مخطوطے محفوظ ہیں۔ راقم ایک نئے اور اہم مخطوطے کو متعارف کرانا چاہتا ہے جو ذاتی ذخیرے میں محفوظ ہے۔ یہ بہت قدیم نہ سہی لیکن پھر بھی چار سو سال سے زائد پہلے رقم کیا گیا ہے۔ اس میں ترقیمہ ہے جس میں 1000ھ درج ہے۔ مولانا شبلی نے شعر العجم جلد دوم میں لکھا ہے:

''مخزن الاسرار کا جواب ہے 3331 شعر ہیں۔ دو ہفتہ میں تمام ہوئی سال اختتام 698ھ ہے۔ تصوف کے مضامین ہیں پنج گنج کے سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔'' (شعر العجم، نقش اول، ص 140)

یہ مخطوطہ برسوں سے میرے پاس ہے مگر کبھی متوجہ نہ ہو سکا۔ کورونا کی قید نے وقت گزاری کے لیے مخطوطات کی طرف متوجہ کیا۔ دیوانِ بیدل کے ایک قدیم نسخے کے مطالعے کے بعد زیر نظر مخطوطہ سامنے آیا۔ یہ عام کتابی سائز میں ہے۔ کاغذ خاصا قدیم ہے۔ روشنائی بھی پھیکی ہوگئی ہے۔ یہ بہت زیادہ کرم خوردہ بھی ہے۔ اشعار اہتمام سے لکھے گئے ہیں۔ مثنوی کے انداز پر مصرعے آمنے سامنے ہیں۔ نظامی کے بحر اوزان کا خیال رکھا گیا ہے بلکہ ہر جگہ خسرو نے پیروی کی ہے۔ ہر صفحے پر تقریباً پندرہ اشعار درج ہیں۔ تحریر خطِ نستعلیق میں ہے۔ کہیں کہیں رواں تحریر بھی موجود ہے۔ مختلف مقالوں کی ابتدا نثری عنوان سے ہوتی ہے جو مطلع الانوار کا انداز ہے۔ کاتب نے یکسانیت کا خیال نہ رکھ کر کئی صفحوں پر آڑی ترچھی سطروں میں اشعار قلم بند کیے ہیں۔ کاغذ کی کفایت کے سبب حاشیوں پر بھی اشعار درج ہیں۔ یہ مخطوطہ شروع کے ایک صفحہ سے محروم ہے۔ میری بدتوفیقی ہے کہ اس وقت مطلع الانوار کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے جس سے متن کا مقابلہ کیا جا سکے اور شعری متون کے اختلاف یا الحاق پر گفتگو کی جا سکے۔ صرف اس کے مختصر تعارف پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔ نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخطوطے کا آغاز ہوتا ہے۔ حمد کا حصہ نہیں ہے۔ کچھ صفحات آب رسیدہ بھی ہیں۔ کاتب نے عجلت پسندی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ کاغذ و کتابت موسمی موثرات سے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ جلد ساز نے بہت احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔

ترقیمہ کی عبارت بہت واضح اور مکمل ہے۔ کاتب بہت ہی غیر معروف ہے اور خوش خط بھی نہیں ہے۔ ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"تمت کتاب عالی جناب مطلع الانوار تصنیف حضرت امیر خسرو دهلوی فی التاریخ هفتم شهر جمادی الاوّل 1000ھ در مقام جین پور سرکار روهتاس بعنایت الهی بخیر و عافیت انجام رسانید۔ اگر سهوی و خطاے که شعار انسان است بظهور آید به قلم زود رقم به صحت رسانید وکاتب این کتاب عالی بود خلیل الرحمن جعفری به شوق تمام و اشتیاق کمال در تسوید این شعر نگار زدم۔"

ترقیمہ میں تقریباً ہر تفصیل درج ہے جس سے کسی شک و شبہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس عبارت کے بعد کاتب کے قلم سے کچھ مفردات کے نام اور نسخۂ علاج کا بھی ذکر ہے۔ جو مخطوطات کے مزاج میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ درد دنداں کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ ایک دعا کے الفاظ بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔

اس خطی نسخے کے ابتدائی اشعار موجود نہیں مگر مثنوی کے آخری اشعار محفوظ ہیں۔ ترقیمہ سے قبل کے چند اشعار قابل ذکر ہیں۔

وه که همه عمر بیاری گذشت
دل نه ازیں جاه کاری گذشت
هر چه دریں شعبده بستم امید
نامه سیه کردم ودیده سفید
روز قیامت که کنیدم خطاب
هیچ ندانم که چگویم خواب
یارب از ایں جواب خودم
همه تو بیا موز جواب خودم

مخطوطہ کے آخری صفحے کے دیگر شعر میں اشعار کی تعداد کا ذکر ہے جو اختتام سے پہلے گیارہواں شعر ہے۔ تین ہزار تین سو بتیس کے اعداد قلم بند کیے گئے ہیں اور دو ہفتہ کے اندر مثنوی لکھی گئی۔

در همه بیت آوردی اندر شمار
سیصد ودو بر شمه و سه هزار
از اثر اختر گردوں خرام
شدید و هفته ایں مهِ کامل تمام
چرخ که خورشید جهانش نوشت
مطلع انوار خطابش نوشت

یہ خطی نسخہ 99 ورق پر مشتمل ہے۔ کاغذ ہلکا ہے اور درمیان میں چند ورق دبیز کاغذ کے مشتمل ہیں۔ مخطوطہ بہت ہی کرم خوردہ اور بوسیدہ ہے۔ بڑی مشکل سے لپٹے ہوئے اوراق کو الگ کیا گیا ہے۔ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے متن کی قرأت بہت مشکل ہوگئی ہے۔ دوسرے نسخوں کی مدد سے صحت کا امکان ہے۔ تدوین کے لیے تمام متون کو پیش نظر رکھ کر مطلع الانوار کا مطالعہ ممکن ہو سکے گا۔ خسرو کی یہ پہلی مثنوی ہے اور پنج گنج کے سلسلے کی ایک بازیافت بھی ہے۔ انسان کی برگزیدگی اور حکیمانہ افکار سے معمور اس تخلیق کی ایک انفرادی اہمیت ہے۔ قدامت اور کرم خوردگی کی وجہ سے اشعار کا پڑھنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ بعض محفوظ صفحات کا متن بہتر ہے۔ مگر ان صفحات کی تعداد بہت کم ہے۔ کاتب نے حکایت کے نمبر اور عنوانات کے لیے کہیں کہیں جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ مقالہ چہاردہم کے بعد یہ اہتمام باقی نہیں ہے جس سے کاتب کی لاپرواہی کا گمان ہوتا ہے۔ مخطوطے میں موجود ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں۔

ز آبِ حیاتش که تادم رسید
قطره.................. رسید
جام شراب که پیمبر خورد
جرعه آه جام علی نیز خورد

یہ نعت دوم کے آخری اشعار ہیں۔ اس کے بعد نعت سوم شروع ہوتی ہے۔

اے بخت گنج خدا را کلید
دهراں گنج تو کردی پدید

اندیشہ ہے کہ مخطوطے میں شروع کے ایک دو ورق غائب ہیں۔ زیر نظر مخطوطے کی اہمیت قدامت کے اعتبار سے نہ سہی مگر خسرو کی باقیات کے گوہر گراں مایہ کی حیثیت سے قابل قدر ضرور ہے۔

■

> امیر خسرو فارسی ادب میں ایک نادر روزگار تخلیق کار کی حیثیت رکھتے ہیں. قدرت نے انہیں بے پناہ تخلیقی توانائی بخشی تھی. بیش و کم کے ساتھ وہ ایک درجن شعری مجموعوں کے مالک ہیں جن میں مطلع الانوار کو اولیت کے علاوہ ایک انفرادیت حاصل ہے. ان کی دوسری مثنویاں داستانوی رنگ و آہنگ سے معمور ہیں.

Prof. Abdul Haq
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:09350461394

ذکیہ مشہدی

بچوں کا ادب

سطح اول کے حوالے سے

اردو میں ادب اطفال پر کافی عرصے سے گفتگو ہورہی ہے۔ مضامین لکھے جارہے ہیں اور سیمنار بھی منعقد ہوئے ہیں۔ کورونا نے یہ تبدیلی ضرور پیدا کی ہے کہ اب جو سیمنار ہورہے ہیں وہ ویبینار (آن لائن سیمنار) میں تبدیل ہوگئے ہیں لیکن بہرحال تبادلہ خیال جاری ہے اور اردو میں بچوں کے ادب میں کمی کی طرف توجہ دلائی جاتی رہی ہے۔ سچ پوچھیے تو ادب کی اتنی کمی بھی نہیں ہے۔ کمی ہے دراصل اس ادب کی جو بچوں کے لیے پُرکشش اور قابل توجہ ہو، جو انھیں پڑھنے کی ترغیب دے۔ آج کل ویسے بھی مطالعے کا شوق اور ضرورت دونوں کم ہوچکے ہیں اور اس کی وجہ ہم سب کو معلوم ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے موبائل فون اور ٹی وی پر مصروف نظر آتے ہیں۔ موبائل تو اب ایک وبا کی صورت اختیار کرچکا ہے اور والدین پریشان نظر آتے ہیں کہ بچوں کو اس سے کس طرح چھٹکارا دلایا جائے۔ مطالعے کی عادت بڑوں میں بھی کم ہوگئی ہے اس لیے ان لوگوں کو جو ادب اطفال سے وابستہ ہیں اپنی تخلیقات کے متن اور متن کی پیش کش، دونوں کو مزید پُرکشش بنانے کی ضرورت ہے۔ اردو میں بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں، نظموں اور ڈراموں وغیرہ میں وہ معیار نظر نہیں آتا جو انگریزی یا دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں ملتا ہے۔ شاید ہم اپنے بچوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے یا شاید ہم اپنے بچوں کو ابھی تک سمجھ نہیں سکے۔ ویسے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں کمی بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے لیکن یہ چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر بچوں کو خاطر خواہ کہانیاں، نظمیں، ڈرامے وغیرہ ملیں تو وہ یقیناً دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ بچوں کی دلچسپی بڑھے گی تو رسالوں، کہانیوں اور کارٹون سیریز وغیرہ کی مانگ بڑھے گی۔ کارٹون سیریز کو الگ کتابوں کی صورت میں بھی شائع کیا جاسکتا ہے۔

بچوں کے لیے جو کتابیں تیار کی جائیں ان میں پہلی شرط عمر کا اختصاص ہے یعنی کس عمر کے بچوں کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے کئی کتابیں دیکھی ہیں جن میں دو ایک کہانیاں چھ سات سال کے بچوں کے معیار کی تھیں اور پھر اچانک زقند بھر کر دس اور دس سے زیادہ عمر کے بچوں کے ذہنی و لسانی معیار تک پہنچ گئی تھیں۔

ایک ہی کتاب میں عمر کا حیطہ (Range) زیادہ وسیع نہیں ہونا چاہیے۔ میرا ذاتی خیال جو تجربے اور مطالعے پر مبنی ہے، یہ ہے کہ تین سال کی رینج کافی ہے۔ مثال کے طور پر سات سے نو، دس سے بارہ وغیرہ۔ اس طرح یہ متعین ہونا چاہیے کہ کتاب میں شامل کہانیاں اور مضامین کس عمر کے بچوں کے لیے ہیں۔

یہ مضمون قلم بند کرتے ہوئے مجھے بچوں کا ایک بہت مقبول رسالہ یاد آیا جو شمع گروپ سے شائع ہوتا تھا اور آج بھی یاد کیا جاتا ہے... کھلونا۔ یہ آٹھ سے دس گیارہ سال کے بچوں کے لیے ایک بہت پیارا رسالہ تھا۔ آج شاید بچوں کا کوئی پرچا اتنا مقبول نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس وقت اردو آج سے زیادہ پڑھی اور پڑھائی جارہی تھی۔ اسکول میں نہیں تھی تو والدین گھر پر اردو پڑھانے کا اہتمام کرتے تھے۔

میرے بچپن کی یادوں میں ہندی کا ایک رسالہ بھی ہے جسے میں نے نو دس سال کی عمر کے بعد نہیں دیکھا۔ یہ الٰہ آباد سے شائع ہوتا تھا اور اس کا نام تھا للا۔ میرے خیال میں یہ میری اس عمر سے بھی پہلے بند ہوگیا تھا اس لیے کہ اس کے شمارے میں نے دیکھے وہ اسکول کی لائبریری میں تھے اور وہ تازہ پرچے نہیں تھے۔ میری عمر ستر سے تجاوز کرچکی ہے اس لیے یہ بہت پرانی بات ہے۔ لیکن اس کی دو ایک نظمیں آج بھی یاد ہیں۔ میں ان کا ذکر اس لیے کررہی ہوں کہ دلچسپ نظمیں اور کہانیاں بچوں کو اتنی مسرت بخشتی ہیں کہ وہ طویل عرصے تک یاد رہ جاتی ہیں۔ ایک نظم یوں شروع ہوئی تھی 'بچہ چوہا گھر سے نکلا، یوں ہی کرنے سیر۔' پھر اس چوہے کا پورا خاندان اس نظم میں آجاتا ہے۔ چاچا، ماما، نانا، دادا... وہ سب مل کر ایک کے اوپر ایک چڑھ جاتے اور ناریل کے تیل کی ایک بوتل تک پہنچ کر تھوڑا تھوڑا سا تیل پی کر خوشی خوشی کود کود کر واپس ہولیتے ہیں۔ جانور، چڑیاں، پرندے اور ان کی حرکتیں بچوں کو خاص طور پر پُرکشش نظر آتی ہیں۔ مجھے اس نظم کا ایک حصہ اسی لیے یاد رہ گیا۔

جو بچے تعلیم حاصل کررہے ہوتے ہیں وہ چھ سے سات کی عمر میں عبارت پڑھنا سیکھ لیتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور نظمیں پڑھ لیتے ہیں۔ خواہ روانی سے، خواہ کچھ اٹک کر۔ اس سے پہلے کی اسٹیج میں وہ انفرادی لفظ پڑھ اور سمجھ لیتے ہیں ان کی اور تصویروں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی ان کے ادراک کے حیطے میں ہوتی ہیں۔ اس اسٹیج کے لیے انگریزی میں بڑی خوب صورت اور دلچسپ بورڈ بکس (Board books) آتی ہیں۔ میں نے اردو میں اس طرح کی کتابیں نہیں دیکھیں اگر ملتی ہیں تو اسے میری کوتاہ علمی پر محمول کیا جائے۔ ننھے بچوں کے لیے، جو پڑھنا شروع کررہے ہیں یہ بہت کارآمد ہیں۔

بچوں کے مصنفین کو بچوں کی نفسیات کی کچھ معلومات بہم پہنچا لینی چاہئیں۔ موٹے طور پر ہم میں سے بیش تر لوگ بچوں کے متعلق کافی کچھ جانتے ہیں لیکن بچوں کی نفسیات کا علم ہو تو معلومات منظم ہوتی ہیں۔ اس کے لیے کسی کورس کی ضرورت نہیں ہے۔ عام لوگوں (Lay persons) کے لیے عام فہم زبان میں کتابیں دستیاب ہیں۔ مثلاً ایک کتاب ہے "Child Development Made Easy" یہ Made simple سیریز ہیں جن میں

کئی علوم کو سادہ و آسان طریقے سے عام لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ رُوپا اینڈ کو نے William Heinemann Ltd., London کے تعاون سے شائع کی ہیں۔ یہ محض مثال ہے۔ میں خصوصی سفارش نہیں کر رہی ہوں۔ اس قسم کی بہت سی کتابیں مل جائیں گی جو بچوں کی نفسیات سے واقف کراتی ہیں۔ یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ عمر کی کس اسٹیج میں بچوں کی خصوصی دلچسپیاں کیا ہوتی ہیں، ان سے کتنی تفہیم کی امید کی جائے، الفاظ کے ذخیرے کی توقعات کیا ہوں۔ یہ ایک اوسط درجے کے معاملات ہیں۔ بچوں میں انفرادی فرق (Individual differences) ہوتے ہیں۔ کچھ بچے اوسط سے کم اور کچھ اوسط سے زیادہ ذہین وطباع ہوتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا اساتذہ اور سرپرستوں کا کام ہے۔ مصنّفین کو اوسط درجے کی صلاحیتوں کو ذہن میں رکھ کر متن تیار کرنا چاہیے۔

بچے جب گرد و پیش سے آگاہ ہونا شروع ہوتے ہیں اس وقت سے ہی وہ پرندوں، جانوروں، رنگوں اور متحرک چیزوں میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ دلچسپی بارہ تیرہ سال کی عمر تک برقرار رہتی ہے وہ ان چیزوں کی کہانیاں بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ سات آٹھ بلکہ اس سے بھی کچھ آگے تک بچے مافوق الفطرت ہستیوں جیسے پریوں، بَونوں، بولنے والے جانوروں وغیرہ کی کہانیوں کو سچ سمجھتے ہیں اور ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عناصر ان میں خوف نہ پیدا کریں۔ خوف پیدا کرنے والے عناصر سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر ذکر ناگزیر ہو تو اس میں یہ ضرور آنا چاہیے کہ عقل کا استعمال کر کے اور خوف پر قابو پا کر اس عنصر سے عہدہ برآ ہونا کیوں کر ممکن ہوا۔ مشہور زمانہ کہانی لٹل ریڈ رائڈنگ ہڈ میں نے اردو میں ''ننھی لال چتّی'' کے عنوان سے پڑھی تھی۔ اس میں ایک بھیڑیا آخر کو شکست کھاتا ہے اور اسے ننھی لال چتّی کی نانی کو واپس اُگلنا پڑتا ہے۔ میں نے یہ کہانی خود سنی اور پڑھی۔ اپنے بچوں کو سنائی اور پڑھوائی اور پھر اپنے پوتوں/ نواسے کو سنائی۔ چار پانچ سال کے بچے نانی کے واپس مل جانے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ کئی بچوں کو میں نے قدرے خوف زدہ اور پھر تالیاں بجا کر خوش ہوتے پایا۔ میرا چار سالہ نواسہ ایک بار مجھ سے ناراض ہو گیا تو کہنے لگا ''اس نانی کو بھیڑیا کب کھائے گا۔'' پھر قدرے مایوس ہو کر بولا۔ ''لیکن نانی تو بھیڑیے کے پیٹ میں سے پھر نکل آتی ہے۔'' یہ بچہ آج چودہ سال کا ہے۔ میں اکثر یہ کہہ کر چھیڑتی ہوں کہ اس نانی کو بھیڑیے نے ابھی تک نہیں کھایا، بڑی بدمزہ نانی ہے۔ اس طرح کی انگریزی کہانیوں کو ہم ہمیشہ اردو کا جامہ پہنا سکتے ہیں۔ میری والدہ انگریزی داں نہیں تھیں لیکن انھیں سنڈریلا کی کہانی معلوم تھی۔ میں نے بچپن میں انھیں سے سنی۔ وہ سنڈریلا نہ کہہ کر کچھ اور نام لیا کرتی تھیں۔ جب میں نے انگریزی میں کہانی پڑھی تو یہ نام جانا۔ بہرکیف بچے اس طرح کی مافوق الفطرت کہانیوں کو سچ سمجھتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مضامین فطرت میں بکھرے پڑے ہیں۔ واقعات بھی بکھرے پڑے ہیں۔ بس دیدۂ بینا چاہیے کہ ان سے بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں بُنی جائیں۔ اور یوں کہ وہ انھیں خوشی خوشی پڑھیں۔

بچے براہ راست دی جانے والی نصیحتوں سے زیادہ خوش نہیں ہوتے۔ نصیحتیں ویسے ہی بے چاروں کو قدم قدم پر ملتی رہتی ہیں۔ اب کہانیوں میں بھی پند و نصائح ملیں تو وہ بھاگ نکلیں گے۔ لیکن انھیں سکھانا بھی ہے۔ بہت کچھ سکھانا ہے۔ اس لیے سکھایئے لیکن بالکل بالواسطہ (Indirect) طریقے سے۔ کہانی میں نصیحت یا سبق یوں چھپے ہوئے ہوں جیسے شکر چڑھی گولی کے اندر تلخ دوا چھپی ہوتی ہے۔ کہانی ختم ہو تو بچہ خود محسوس کرے کہ اس میں کیا سبق تھا۔ فوری طور پر نہ محسوس کرے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اسے سیکھنے کے لیے وقت چاہیے۔ بچپن صرف مسرتوں سے اٹکھیلیاں کرنے کا نام ہے۔ تا حال چین میں سات سال تک بچوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی تھی، کسی طرح کا ڈسپلین ان پر نافذ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جو تربیت ہوتی تھی وہ بہت تیزی سے اثر کرتی تھی اور پچھلے سات سالوں کی بھرپائی ہو جاتی تھی۔ چینی آج بھی اس اصول پر کاربند ہیں یہ مجھے نہیں معلوم لیکن یہ اصول زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ نوبل انعام یافتہ مصنفہ پرل. ایس. بک نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے۔ ان کا انتقال ہم سب کی یادداشت میں ہے یعنی 1973۔ اس لیے یہ زیادہ پرانی بات نہیں۔ ہم اس اصول کا اطلاق اپنے یہاں نہیں کر سکتے کہ ہمارا معاشرہ مختلف ہے لیکن اس سے یہ ضرور سیکھ سکتے ہیں کہ بچوں کو پند و نصائح سے نہ لادا جائے تو ان کی ذہنی نشوونما کے لیے بہتر ہوگا۔ کہانیاں صرف انھیں گرد و پیش سے واقف کرائیں، وہی بہتر ہے۔ میں نے ایک بورڈ بک میں مختصر ترین الفاظ میں یہ دیکھا کہ کس طرح ایک ہزار پایہ (Caterpillar) تتلی میں تبدیل ہوتا ہے۔ یہ انگریزی کتاب چار سال کے بچے نے بڑے شوق سے دیکھی اور الفاظ میں اضافے کے ساتھ تتلی بننے کے مختلف مرحلوں کو ذہن میں جذب کیا۔ کیا ہم اسی طرح کی چیزوں سے ابتدا نہیں کر سکتے۔ بورڈ بکس نہ سہی، عام پتلی پتلی کتابیں بھی ایسی باتیں سکھا سکتی ہیں۔

بچوں کی کہانیاں طویل نہیں ہونی چاہئیں۔ ان کی توجہ دیر تک ایک موضوع پر برقرار نہیں رہتی۔ الفاظ کا بوجھ ان پر نہ ڈالا جائے۔ روزمرہ کے الفاظ، چھوٹے چھوٹے جملوں میں پرونا ان کے لیے مناسب ہوتا ہے۔

اور سب سے اہم بات۔ بچوں کی کہانیوں میں تشدد نہیں ہونا چاہیے۔ معاشرے میں تشدد بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ جلد یا بہ دیر اس سے آگاہ ہوں گے ہی۔ بہتر ہوگا ہم انھیں خوف زدہ کرنے یا تشدد کو تسلیم کرنے کے منفی اقدار نہ دیں۔ میں یہ خصوصی طور پر اس لیے کہہ رہی ہوں کہ بچوں کے ادب پر مبنی ایک ورک شاپ میں ایک ایسے مصنف کی طویل کہانی سنی جو فرقہ وارانہ فساد کی بھیانک تصویریں پیش کر رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اس لیے کہ وہ مصنف بچوں کے لیے ہی لکھتے آئے ہیں۔

آج کل اور بھی کچھ باتوں کا دھیان رکھا جانے لگا ہے۔ مثلاً وہ الفاظ نہ استعمال کیے جائیں کسی ذات، فرقے یا پیشہ ورانہ جماعت کی تضحیک ہوتی ہو۔ یہ رجحان انگریزی میں بھی آیا ہے جہاں پہلے سے رائج الفاظ جیسے نگر (nigger)، جیپ (Jap) اور اسکیمو وغیرہ اب استعمال نہیں ہوتے۔ مصنّفین کو اس طرف بھی توجہ مرکوز کرنی ہے۔ بنیادی اصول متن کو دلچسپ اور قابل فہم بنانا ہے۔ اگر مضمون/ کہانی/ نظم قابل فہم ہے اور جس عمر کے بچوں کے لیے تخلیق کیا گیا ان کو پڑھنے کی ترغیب دیتا اور انبساط بخشتا ہے تو مصنف کامیاب ہے۔

میں نے یہاں صرف ابتدائی سطح پر توجہ دی ہے۔ دس برس ہوتے ہوتے بچوں کی دلچسپی کے موضوعات بدلنے لگتے ہیں۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اب غیر مرئی تصورات کو بھی سادہ و آسان پیرائے میں سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے لکھنا دوسرے سروکاروں کا متقاضی ہوتا ہے لیکن بنیادی اصول وہی ہوتے ہیں... سادگی، دلچسپی، عمر سے تطابق۔

ادب اطفال ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ اس کے متعدد پہلو ہیں۔ میں نے صرف ایک پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے اس سلسلے میں دوسرے مصنّفین بھی اظہار خیال کریں گے تا کہ نئے لکھنے والے استفادہ کر سکیں اور جو لکھتے آ رہے ہیں وہ تخلیقات کو بہتر بنا سکیں۔

■

Zakia Mashhadi
F-1, GRAND Pallavi Courd
Judges Court Road
Patna - 800004 (Bihar)
E-mail.: zakia.mashhadi@yahoo.com

ڈاکٹر معین الحق بہ حیثیت مترجم تاریخ فیروز شاہی

علیم اشرف خان

فارسی ہندوستان میں کئی صدیوں تک سرکاری، درباری، علم و ادب فرہنگ و ثقافت اور علم دانی و علم فہمی کی زبان رہی ہے۔ عہد وسطی میں تاریخ لکھنے کا رواج فارسی زبان میں شروع ہوا اور سب سے پہلے ہندوستان میں حسن نظامی نیشاپوری نے عہد مملوک میں قطب الدین کی فتوحات اور تاریخ کو فارسی میں رقم کرکے فارسی تاریخ نویسی کی باقاعدگی سے داغ بیل ڈالی جسے ہم 'تاج المآثر' کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کے بعد منہاج الدین بن سراج الدین نے طبقات ناصری تحریر کی اور پھر تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی آتی ہے جسے ہم کسی حد تک طبقات ناصری کا تکملہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ تاریخ فیروز شاہی وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر طبقات ناصری ختم ہوتی ہے۔

تاریخ فیروز شاہی، مؤلفہ ضیاء الدین برنی میں سلاطین دہلی کے 92 سالہ عہد کی تاریخ ملتی ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی 662ھ/ 1265 عیسوی سے سلطان فیروز شاہ کے چھٹے سال جلوس 752ھ/ 1357 عیسوی تک کی تاریخ درج ہے۔ ضیاء الدین برنی عہد وسطی کے مؤرخین میں ایک مدبر اور مفکر مؤرخ ہیں جن کی زندگی کا کینوس نہایت وسیع و عریض ہے اسی لیے تاریخ فیروز شاہی کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں برنی نے تاریخ کو اپنے ارد گرد محور قرار دے کر نہایت مناسب اور مفکرانہ انداز میں تاریخ رقم کی ہے جس کے باعث کسی حد تک برنی کی ذاتی صفات اور منصفانہ تاریخ نویسی کا حق ادا ہو گیا ہے اور بلاشبہ ہم اسے ابوالفضل کی تاریخ اکبر نامہ کے لیے تیار کیا جانے والا منصوبہ کہہ سکتے ہیں گویا یہ تاریخ عہد وسطی کی تاریخ نویسی کے لیے ایک معتبر اور مستند Trend setter کہی جا سکتی ہے۔

برنی سترہ سال تک محمد بن تغلق کے دربار سے وابستہ رہنے کے بعد سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں صرف چند سال ہی بقید حیات رہا اس زمانے میں جن مصائب، آلام اور تنگدستی و عسرت کا اسے منھ دیکھنا پڑا وہ بہت عبرت انگیز ہے۔ برنی نے اس تنگدستی اور عسرت میں حضرت نظام الدین اولیا کی صحبت میں رہتے ہوئے دار فانی سے کوچ کیا امیر خورد کرمانی نے سیر الاولیا میں اسی رابطے اور توسط کا استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''از دنیا بہ دار عقبیٰ مردانہ و عاشقانہ خرامید''

(تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی، ص 312)

ہیروڈوٹس کو بابائے تاریخ کہا جاتا ہے مگر طرز خاص میں تاریخ نویسی چودھویں صدی میں ابن خلدون کی مرہون منت ہے جس نے عالم اسلام ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں تاریخ کے تصور کو وسعت دے کر انسان کی اجتماعی اور عمرانی زندگی کو اس کا موضوع قرار دیا تھا اور اس انداز کا وہ موجد ہے جس میں فلسفہ تاریخ کا مطالعہ ہو۔

برنی اشخاص کے مطالعے میں طبقہ بندی کو پسند کرتا تھا اس لیے تاریخ فیروز شاہی میں بار بار وہ ارذال و اشراف کا ذکر کرتا ہے۔ برنی تاریخ کو 'سرمایۂ اعتبار اولوالابصار' مانتا ہے، اسی کے ساتھ وہ حدیث کے مطالعے کو تاریخ نویسی کی کامیابی کی دلیل مانتا ہے۔ جب وہ فن تاریخ کے فوائد کا ذکر کرتا ہے تو اس میں بالخصوص یہ ذکر درج ہے کہ تاریخ حکمرانوں کے لیے مخصوصا مفید ہے۔ تاریخ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ گذشتہ ہزار سالوں کے انسانی تجربات وحوادث اور واقعات کو مختصر وقت میں پیش کر دیتی ہے۔ برنی نے تاریخ نگاری کی شرائط میں ان تمام ہدایتی اصولوں کو بخوبی واضح کر دیا ہے جو عادلانہ اور منصفانہ تاریخ نویسی کا جزو لاینفک ہیں۔ مؤرخ کو ذاتی سماجی تعصبات اور اثرات کے ساتھ قومی عصبیت، نسلی امتیاز، مذہبی فوقیت، توہم پرستی اور صادق القول بھی ہونا چاہیے۔ تاریخ فیروز شاہی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اس کے اردو ترجمے کے مقدمے میں یہ تحریر کیا ہے:

''تاریخ فیروز شاہی ہمارے تاریخی ادب میں کلاسیکی مقام رکھتی ہے اور اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اہم ترین معاصر ماخذ میں شمار ہوتی ہے۔ بعض واقعات کے بیان میں برنی نے اختصار ملحوظ رکھا ہے مثلاً غیاث الدین تغلق اور اس کے بیٹے محمد بن تغلق کی زرعی اصطلاحات کے بیان کو وہ اگر تفصیل سے لکھتا تو اقتصادی تاریخ کے مطالعے کے لیے بہت مفید مواد دستیاب ہو سکتا تھا۔ مگر چند واقعات کو چھوڑ کر جن کے بیان میں اس نے اختصار سے کام لیا ہے بقیہ واقعات اور مسائل پر اس کے بیانات خاصے مفصل ہیں۔'' (ایضاً ص 22-23)

بالعموم تاریخ فیروز شاہی کا انداز نگارش سہل اور رواں ہے مگر کئی مرتبہ ایسے مواقع بھی آئے ہیں جہاں برنی اپنے مقصد سے بھٹک گیا ہے مثال کے طور پر معز الدین کیقباد کا عہد 1387 سے 1390 عیسوی تک نہایت مختصر اور غیر اہم ہے لیکن برنی نے اس سلطان کے عیش و طرب کا ذکر دس صفحات میں کیا ہے مزید برآں اسے وہ اپنی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتے ہوئے اس حصے کو 'قبۃ التواریخ' کہتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ برنی اس عہد میں ایک شیر خوار بچہ تھا اور اس کی اطلاعات کا منبع یا تو متقدمین مؤرخین کی اطلاعات یا سنی سنائی باتیں ہی تھیں اور یہ عہد اس کا معاصر عہد نہیں ہے۔

مجموعی اعتبار سے برنی کی تاریخ کو ہر دور کے مؤرخ نے مستند اور قابل اعتنا سمجھا ہے یہ دوسری بات ہے کہ برنی کی حیات میں تاریخ فیروز شاہی کو شہرت نہ ملی اور نہ اس کا کوئی صلہ ہی مل سکا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصنف اور اس کی تصنیف دونوں کی دوامی شہرت سے اس کی تلافی ہو گئی ہے۔ برنی نے اپنے عہد اور معاصرین کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے لکھا ''مرغان و ماہی در چمن آسودہ اند

الّا کہ م'' اور برنی کا یہ بیان حق بجانب ہے مگر بعد کی نسلوں کی قدر دانی نے اس کی یہ شکایت دور کردی ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کے اردو ترجمے سے متعلق معروضات پیش کرنے سے قبل لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مطبوعہ اشاعتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے:

1 سب سے پہلے تاریخ فیروز شاہی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سے 1862 عیسوی میں شائع ہوئی جسے سرسید احمد خاں نے کیپٹن ڈبلیو سیو نالیس اور مولوی کبیر الدین کی نگرانی میں ایڈٹ کیا۔

2 دوسری مرتبہ تاریخ فیروز شاہی کو کلکتہ کے ناشر مولوی ولایت حسین نے 1891 عیسوی میں شائع کیا تھا جو 516 صفحات پر مشتمل تھی۔

3 تیسری مرتبہ تاریخ فیروز شاہی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے 1930 عیسوی میں شائع ہوئی۔

(مآخذ از فہرست کتابہای چاپی فارسی، خانبا بامشار، جلد اول، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران، ایران 1352 خورشیدی، ص 735)

یوں تو تاریخ فیروز شاہی کو مؤرخین نے مختلف زمانوں میں اپنی تاریخ میں جگہ دی ہے مگر خاص طور سے وہ تاریخیں جنھوں نے تاریخ فیروز شاہی کو اپنے مآخذ و منابع میں درج کیا ہے وہ:

1 عہد اکبری کی طبقات اکبری (100ھ) میں خواجہ نظام الدین احمد بخشی (ہروی) نے استفادہ کیا ہے۔

2 عہد اکبری کی تاریخ حقی (1005ھ) میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے استفادہ کیا ہے۔

3 عہد اکبری کی تاریخ معصومی یا تاریخ سندھ (1009ھ) میر محمد معصوم بھکری نے بخوبی استفادہ کیا ہے۔

4 عہد اکبری کے شاہکار اکبر نامہ (1010ھ) میں ابوالفضل نے تاریخ فیروز شاہی کی روش تحریر سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔

5 عہد جہانگیری کی مآثر رحیمی (1052 ہجری) میں خواجہ عبدالباقی نہاوندی نے فہرست منابع میں اس کا ذکر کیا ہے۔

6 عہد شاہجہانی کی تاریخ مجالس السلاطین (1058ھ) میں محمد شریف دکنی نے درج کیا ہے کہ اس نے وقت کی کمی کے باعث تاریخ فیروز شاہی سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا خلاصہ اپنی تاریخ میں کیا ہے۔

7 عہد عالمگیری (1068-1118ھ) تاریخ مراۃ العالم کے مؤلف بختاور خان نے فہرست مآخذ میں تاریخ فیروز شاہی کا ذکر کیا ہے۔

8 خلاصۃ التواریخ (1107ھ) میں سجان رائے بٹالوی نے اپنے منابع کی فہرست میں تاریخ فیروز شاہی کا ذکر کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ اس نے اس کی تلخیص سے استفادہ کیا ہے۔

یہ بھی ایک ناقص فہرست، اگر اس سلسلے میں مزید تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تاریخ فیروز شاہی کے بعد لکھی جانے والی تمام مستند اور معتبر تاریخوں میں مؤرخین نے براہ راست یا بالواسطہ تاریخ فیروز شاہی سے مدد لی جس نے تاریخ فیروز شاہی کے مستند اور معتبر ہونے پر تاریخ مہر ثبت کردی ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کا اردو ترجمہ جو مورد بحث ہے وہ ڈاکٹر سیّد معین الحق کا ہے اسے اردو سائنس بورڈ نے لاہور (پاکستان) سے دو مرتبہ شائع کیا ہے البتہ میرے نزدیک اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو 1990 عیسوی میں شائع ہوا تھا اس کا مختصر تعارف اس طرح ہے:

(1) فہرست: 23 صفحات (2) مقدمہ: 34 صفحات (3) دیباچہ ضیاء الدین برنی: 31 صفحات (4) متن ترجمہ: 768 صفحات (5) اشاریہ اعلام: 42 صفحات (6) اشاریہ اماکن: 12 صفحات (7) اشاریہ کتب: 5 صفحات (8) سنہ اشاعت: 1999 عیسوی، سلسلۂ مطبوعات نمبر 43 (9) ناشر اردو سائنس بورڈ، لاہور (پاکستان)، (10) طابع: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور (پاکستان)

فہرست کے عنوانات ہیں:

1 مقدمہ از سید معین الحق، جس میں تاریخ فیروز شاہی، اس کے مؤلف، اس کے عہد اور اس کی تاریخ نویسی پر سیر حاصل اور مبسوط اطلاعات دی ہیں۔

2 دیباچہ از ضیاء الدین برنی، جس میں برنی نے واقعات اور فیروز شاہی کی وجہ تالیف پر قدیم زمانے سے اپنے عہد تک کے واقعات کو اعلیٰ نثری پیرائے میں بیان کیا ہے۔ تاریخ نویسی کے فوائد نیز تاریخ نویسی کی شرائط اور خصوصیات کا بھی مدلل بیان کیا ہے۔ مقدمے میں بڑی وضاحت اور صراحت سے وہ رقم طراز ہے:

''میں یعنی ضیاء الدین برنی، مؤلف تاریخ فیروز شاہی، فارسی مؤرخین میں اس لحاظ سے منفرد ہوں کہ میں نے اپنی تصنیف کے دیباچے میں فن تاریخ نویسی کے شرائط و لوازم، اس کے فوائد اور لوگوں کی اس سے دلچسپی کا ذکر کیا ہے ان مسائل پر بحث کرنے سے جو قدرے طویل معلوم ہوتے ہیں، میرا مقصد یہ تھا چونکہ علم تاریخ میں مجھ کو بہت سی خوبیاں اور فوائد نظر آتے ہیں اسی لیے میں نے ارادہ کیا کہ میں بھی ایک فارسی تاریخ لکھوں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کو آدم اور ان کے جڑواں بیٹوں مہتر شیث جو ابوالانبیاء ہیں اور کیومرث جو ابوالسلاطین ہیں، ان کے بیان سے شروع کروں اور انبیاء و سلاطین کی تاریخ نسلاً بعد نسل اور عہداً بعد عہد مرتب کرتا ہوا اخبار و آثار مصطفیٰ علیہ السلام تک کی اولاد میں جو آخری بادشاہ تھا، لے آؤں اور اس کے بعد خلفا و سلاطین اسلام کا حال سلطان عصر (یعنی فیروز شاہ تغلق) کے عہد تک لکھوں جن کے نام نامی سے میں نے اس کتاب کو معنون کیا ہے۔''

تاریخ فیروز شاہی میں درج ذیل آٹھ سلاطین کے حالات و واقعات درج ہیں:

الف: سلطان معز الدین کیقباد جو سلطان غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا اور اس نے تین سال حکومت کی۔

ب: سلطان جلال الدین فیروز خلجی جس نے سات سال حکومت کی۔

د: سلطان علاء الدین خلجی جس نے بیس سال حکومت کی۔

ہ: سلطان قطب الدین پسر سلطان علاء الدین جس نے چار سال اور چار ماہ تک حکومت کی۔

و: سلطان غازی الدین تغلق جس نے چار سال اور چند مہینے تک حکومت کی۔

ز: سلطان محمد بن تغلق شاہ جس نے ستائیس سال تک حکومت کی۔

ح: سلطان العصر والزماں فیروز شاہ جو اس وقت دہلی میں حکمراں ہیں، خداوند عالم بہت سالوں تک ان کی حکومت قائم رکھے۔

4 برنی نے تاریخ فیروز شاہی 758ھ مکمل کی تھی۔

5 برنی نے اپنی تاریخ کے ضمن میں ایک قطعہ اس شکایت کے ساتھ درج کیا ہے کہ اس کی تاریخ مقبول اس لیے نہیں ہو سکی کیونکہ علم تاریخ میں کوئی ایسا عالم نہیں تھا جو میری تاریخ کی قدر و اہمیت جانتا۔

گر بگویم کہ نیست در عالم
مثل تاریخ من کتاب دگر
چون درین علم عالمی نبعد
کہ کند گفتۂ مرا باور

(ایضاً، ص 68)

تاریخ فیروز شاہی کے اردو ترجمے کی خوبیاں درج ذیل ہیں:

تاریخ فیروز شاہی کے مترجم ڈاکٹر سید معین الحق فارسی تاریخی متون کے اردو تراجم میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جو ان کے غائر مطالعے اور مواد پر دقیق نظر کے غماز ہیں۔ مترجم کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت ہے اسی لیے انھوں نے معتبر مترجم کا بخوبی حق ادا کیا ہے بطور مثال:

1 مترجم کو تاریخی متن کے ترجمے میں ان کی اسلامی تاریخ کی معلومات، واقعات سنین نہایت معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے ضیاء الدین برنی کے مقدمے

میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت دس سال اور نو مہینے بیان کی گئی ہے مگر مترجم نے فٹ نوٹ میں اضافہ کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مدت جمادی الثانی 13 ہجری سے ذی الحجہ 23ھ تک (یعنی دس سال چھ ماہ اور چند روز تھی) نہ کہ بقول برنی دس سال اور نو مہینے یہ سہو برنی سے ہوا ہے اس کی نشاندہی مترجم نے حواشی میں درج کی ہے۔

2 مترجم نے آیات قرآنی کے تراجم اور ان کی توضیحات فٹ نوٹ میں درج کی ہیں۔

3 اقوال بزرگان کو بھی فٹ نوٹ میں حوالہ کے ساتھ درج کیا ہے۔

4 مترجم نے متن کے اختلاف نسخ کو بھی فوٹ نوٹ میں درج کیا ہے۔

5 جگہ جگہ متن اور مقدمہ برنی میں اشخاص، کتب، جگہوں اور روایتوں کی وضاحت نہایت مناسب اور مستند طریقے سے کتابوں سے استناد کرتے ہوئے درج ہوئی ہیں جیسے عوفی کی کتاب کا نام برنی نے جامع الحکایات لکھا ہے مگر فاضل مترجم نے کتاب کا نام تصحیح کے بعد جوامع الحکایات ولوامع الروایات درج کیا ہے جو صحیح ہے۔

(ایضاً،ص 55)

ایک جگہ صفحہ 61 پر تاریخ عرائسی کے متعلق برنی رقم طراز ہے کہ "امام ثعلبی نے جو ایک بے نظیر مؤرخ ہیں تاریخ عرائسی میں لکھا ہے۔" اس پر مترجم نے فٹ نوٹ میں توضیح دیتے ہوئے لکھتا ہے: "یہ ثعلبی دوسرے مؤرخ ہیں، ان کا نام ابواسحٰق بن ابراہیم نیشاپوری معروف بہ ثعلبی ہے، ان کی تصنیف 'العرائس' عام طور پر 'عرائس المجالس فی قصص الانبیا' کے نام سے مشہور ہے برنی کو امام ثعلبی (صاحب یتیمۃ الدھر) اور ان کے نام میں مغالطہ ہوگیا ہے۔

6 مترجم نے متن میں مذکور مراتب اور عہدوں کی نہایت جامع وضاحت فٹ نوٹ میں درج کی ہے۔ مثال کے طور پر صفحات 78 سے 80 تک فٹ نوٹ میں حاجب، سلاحدار، جاندار، سہالحشم، نقیب، شحنہ، شحنۂ پیل اور آخر بیگ کی نہایت اہم اور کارآمد وضاحت کی ہے جو عہد وسطیٰ کے مؤرخین اور دانشوروں کے لیے، نیز ریسرچ اسکالرس کے استفادے کے لیے بھی مفید ہے۔

7 مترجم نے برنی کی رائے کو رد کرتے ہوئے صفحہ 99 کے فٹ نوٹ میں درج کیا ہے "برنی نے ایک مثالی مسلم حکمراں کے لیے جو خصوصیات اور کارکردگی لازمی قرار دی ہے اس سے مکمل طور پر اتفاق ممکن نہیں ہے۔"

8 مترجم نے صفحہ 103 پر مولانا برہان الدین بلخی کے ذکر میں ان کے نام کے سلسلے میں 'اخبار الاخیار فی اسرار الابرار' کے حوالے کے طور پر ان کا نام شیخ برہان الدین محمود ابو الخیر اسعد بلخی لکھا ہے اور یہ وضاحت بھی دی ہے کہ وہ علوم شریعت وطریقت میں ماہر تھے۔ مترجم نے اس طرح مستند ترجمے کی روایت کو برتتے ہوئے دیگر منابع و مآخذ سے اطلاعات بہم پہنچائی ہیں جو معیاری ترجمہ کی خصوصیت ہے۔

9 صفحہ 215 پر ضیاء الدین برنی نے سلطان بلبن کے پوتے اور بغراخاں کے بیٹے سلطان معز الدین کیقباد کا سال جلوس 685 ہجری درج کیا ہے جبکہ مترجم نے تاریخ مبارک شاہی اور فتوح السلاطین کے حوالے سے سال جلوس 686 ہجری بتایا ہے جو صحیح ہے اور مترجم کے تاریخی شعور کی بیّن دلیل ہے۔

10 ڈاکٹر سیّد معین الحق مترجم تاریخ فیروز شاہی نے کئی جگہوں پر علی گڑھ کے نسخے کو دوسرے ایڈیشن پر اس لیے ترجیح دی ہے کہ اس کی عبارت بامعنی اور درست ہے۔ اس ترجمہ میں بار بار عبارتوں میں ایلیٹ اور ڈاؤسن کی تاریخ کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ اوصاف اچھے مترجم کی نیز معیاری ترجمے کی روایت کی سند اور مترجم کے معتبر ہونے پر مہر ثبت کرتی ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کے اردو ترجمے کے چند نقائص درج ذیل ہیں:

1 صفحہ 103 پر جہاں مولانا برہان الدین بلخی کا ذکر آیا ہے وہاں مترجم نے لشکر کے قاضیوں کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ان کو بحرمان کہا جاتا ہے مزید اس بحرمان پر سوالیہ نشان بھی لگا ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مترجم متن میں بحرمان سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا تھا اس لیے اس نے سوالیہ نشان لگا کر متن کو چھوڑ دیا ہے جبکہ صحیح لفظ 'بحری اور بحریان' ہونا چاہیے تھا کیونکہ فوائد الفواد کے اردو ترجمے میں خواجہ حسن نظامی نے اس اصطلاح کی وضاحت میں درج کیا ہے "لشکر کے قاضی بحری کہلاتے ہیں"

(فوائد الفواد (اردو ترجمہ)، دہلی اردو اکادمی، دہلی 1990، ص 408)

یہ غالباً مترجم کو ترجمہ کرتے وقت اس کی اطلاع نہیں تھی۔

2 صفحہ 386 پر مترجم نے سلطان جلال الدین کے لشکر کا ہندوستانیوں پر تیروں سے حملے کا بیان کیا ہے وہاں یہ درج ہے:

"جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور سلطان جلال الدین کے مقدمۃ الجیش نے ہندوستانیوں (نواحی دہلی اور بنگال کے درمیان یعنی اودھ اور اس کے قرب وجوار کے اضلاع کے لوگ) پر تیر برسانے شروع کیے تو ہندوستانی جو آب گرفتہ (یعنی وہ لوگ جو پانی کے فساد سے پیدا ہونے والی بیماری میں ہوتے ہیں) اور سست مزاج تھے۔ چاول اور مچھلی کھاتے اور کھٹے انگوروں کی شراب پیتے تھے اور بہت شور وشغب کر رہے تھے ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔"

یہاں مترجم نے آب گرفتہ کی جو توضیح کی ہے وہ صریحاً غلط ہے آب گرفتہ کے معنی سڑے ہوئے پھل، پلپلے، یا پلپلے یا موٹے لوگ جو ظاہراً پانی بھرے تھے لیکن اندر سے کھوکھلے اور کمزور ہوتے ہیں اگر اس طرح کے معنی کیے جاتے تو زیادہ مناسب اور صحیح ترجمہ ہوتا۔

3۔ اصطلاحی اشتباہات کے علاوہ متن ٹائپ کی غلطیاں بھی رخ پا گئی ہیں مثلاً صفحہ 395 پر شیر خوارگان جو فٹ نوٹ میں لکھا گیا ہے وہ غلطی کے باعث ٹائپ سے شیر خواگاران ہوگیا ہے جبکہ متن میں اس کے معنی شیر خوار کے ہی ہیں۔

بہرحال مترجم کے خصائص اس کے نقائص سے کہیں بالا ہیں اس لیے وہ ایک اچھے مترجم کہے جاسکتے ہیں۔ مترجم نے بعض جگہوں پر متن کی تصحیح کے لیے تغلق نامہ، خزائن الفتوح، نہ سپہر، اور دوسری معاصر تاریخوں جیسے عصامی کی فتوح السلاطین وغیرہ سے بھی اختلافات کو برطرف کیا ہے جو نہایت اہم ہے۔

مزید برآں مترجم نے مسالک الابصار، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، نفحات الانس، فتوح السلاطین، ریاض السلاطین، طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، مشارق الانوار، خزینۃ الاصفیا، تذکرۂ علمائے ہند، تیمور نامہ اور انشا ماہرو کے غیر مطبوعہ قلمی نسخوں سے بھی ترجمے میں متن کے لیے استفادہ کیا ہے۔ انگریزی کتابوں میں کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی، رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق سے بھی متن کی درستگی میں اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر سیّد معین الحق صاحب نے تاریخ فیروز شاہی کے اردو ترجمے سے اردو ادب کو غنی کیا ہے اور عہد وسطیٰ کی تاریخ پر ان کا احسان مسلّم ہے۔

فہرست مآخذ ومنابع

1 تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی، مقدمہ اردو ترجمہ از سید معین الحق سلسلۂ مطبوعات نمبر 43، اردو سائنس بورڈ، لاہور (پاکستان) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، (پاکستان)، 1991 عیسوی۔

2 تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی، تصحیح سر سید احمد خان، مولوی کبیر الدین، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، 1862 عیسوی۔

3 فوائد الفواد، ملفوظات حضرت نظام الدین اولیا، جامع، امیر حسن سجزی دہلوی، مقدمہ اردو ترجمہ از خواجہ حسن نظامی، دہلی اردو اکادمی، دہلی، 1990 عیسوی۔

■

Prof. Aleem Ashraf Khan
Dept of Persian, Delhi University,Delhi - 110007
Mob.:9315174986

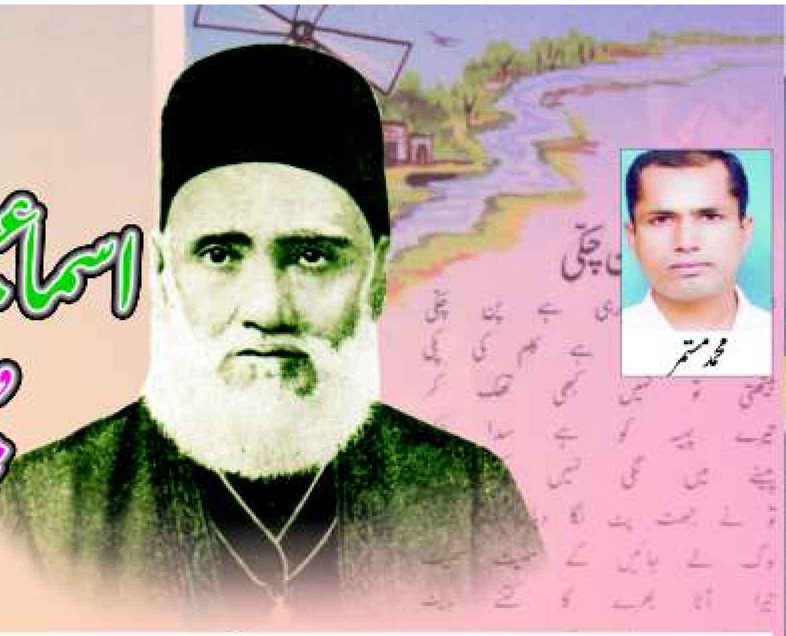

اسماعیل میرٹھی کی مثنوی 'پن چکی' کا جائزہ

محمد مستمر

اسماعیل میرٹھی فقط اپنے عہد کے ہی بڑے شاعر نہیں تھے بلکہ وہ ہر دور کے بڑے شاعر رہیں گے۔ انھوں نے جہاں بچوں کے لیے لکھا وہیں بڑوں کے لیے بھی ادب تخلیق کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی شہرت و مقبولیت بطور ادبِ اطفال مسلم و مستحکم ہے۔ ابتدا میں انھوں نے غزلیں کہیں لیکن بعدازاں وہ منشی ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد سے وابستگی کے سبب مکمل طور پر نظموں کی طرف متوجہ ہو گئے اور جلد ہی پوری اردو دنیا میں ان کی نظموں کا ڈنکا بجنے لگا۔ لہٰذا ان کی شناخت بطور ادبِ اطفال افقِ ادب پر نقش ہو گئی۔

انھوں نے طبع زاد نظمیں بھی سپردِ قلم کیں اور انگریزی نظموں کا بھی ترجمہ کیا لیکن ان کے ترجموں پر بھی اصل کا گماں ہوتا ہے۔ ترجمہ شدہ نظموں میں بھی وہی تاثیر و توانائی، نفسیاتی پہلو، بچوں کی زندگی سے متعلق لوازمات نیز شگفتگی و شائستگی، سنجیدگی و متانت اور تخلیقی رویے موجود ہوتے ہیں جو ایک طبع زاد تخلیق میں نہاں و نمایاں ہوتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے بے شمار نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں جو مقبولیت و بلندی اور سروری و سرتاجی ادبِ اطفال کے حوالے سے ان کو حاصل ہے شاید ہی وہ کسی شاعر کے حصے میں آئے ہو۔ ہماری گائے، اسلم کی بلی، تاروں بھری رات، پن چکی، برسات کی بہاریں، ایک جگنو اور بچہ، چھوٹی چیونٹی، ایک گھوڑا اور سایہ، برسات، نصیحت، بارش کا پہلا قطرہ، رات، کچھوا اور خرگوش، سچ کہو، گرمی کا موسم، ہوا اور سورج کا مقابلہ، دال کی فریاد، چھوٹے کام کا بڑا نتیجہ، ایک پودا اور گھاس، قوسِ قزح، طمع کی انگوٹھی، تھوڑا تھوڑا مل کر بہت ہو جاتا ہے، اونٹ، شفق وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو بچوں کی نفسیات پر رقم کی گئی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ جنھیں بچے آسانی سے سمجھ سکیں کیونکہ موصوف اپنی نظموں میں اُسی معیار کی زبان استعمال کرتے ہیں جس سے بچوں کے ذہن تک صحیح ترسیل و ابلاغ ہو سکے۔ یعنی وہ اپنی نظموں میں عام فہم اور با محاورہ زبان کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ با محاورہ زبان بچوں کے ذہنوں پر اثر چھوڑنے کی صلاحیت زیادہ رکھتی ہے۔ ان کی نظموں کے مصرعے اور شعر آج بھی اُسی طرح مناسب، موزوں اور چست و درست ہیں جیسے کہ وہ اپنے زمانے میں تھے۔

اگرچہ آج بہت سے تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی بلکہ سائنسی و تکنیکی اور صنعتی و حرفتی بدلاؤ آ چکے ہیں تاہم اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی اہمیت و افادیت اُسی طرح مسلم و مستحکم ہے۔ اسماعیل میرٹھی اپنی نظموں میں ایک ماہرِ نفسیاتِ اطفال کے طور پر نمودار ہوتے ہیں۔ جس کا اساسی پہلو یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں، مرئی اشیا، قدرتی مناظر اور عام سے موضوع میں بھی نصیحت آمیز، سبق آموز اور دلچسپی سے پر باتیں بیان کر جاتے ہیں جن کے ذریعے بچوں کی اصلاح کرنا، ایک اچھی اولاد بنانا اور ایک اچھا شہری بنانا ہوتا ہے۔

آج ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی سائنسی اشیا، تکنیکی کل پرزوں، انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سے ہم آہنگ و منطبق ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ عرصے میں بے شمار چیزیں، الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب متروک ہو چکی ہیں۔ اب وہ ہمارے ماضی کا حصہ اور سرمایہ ہیں۔ ہماری نئی نسل نہ ان سے واقف ہے بلکہ ان کی شکل و صورت سے بھی بے نیاز ہے۔ 'پن چکی' اکیسویں صدی کی نسل اور بچوں کے لیے ایسی ہی غیر مانوس چیز اور غیر ضروری سا لفظ ہے۔ لیکن ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم نئی نسل کو ان غیر مانوس و متروک اشیا کے بارے میں بتائیں جو کبھی انسانی زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ جیسا کہ میں نے سبق عرض کیا ہے کہ اسماعیل میرٹھی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور عام سے موضوع میں بھی سبق آموز اور دلچسپی سے پر باتیں بیان کر جاتے ہیں جن میں ساتھ ساتھ مقصدیت بھی ہوتی ہے۔ 'پن چکی' بھی ایسا ہی موضوع ہے۔

سب سے پہلے تو ہمارے بچوں کے لیے یہ جاننا لازم ہے کہ آخر 'پن چکی' کیا ہے؟ 'پن چکی' دو لفظوں کا مرکب ہے۔ پن اور چکی یعنی پانی کی چکی یا پانی سے چلنے والی چکی۔ اس کا حساب بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ آج کے دور میں ٹربائن (Turbine) تکنیک سے بجلی بنائی جاتی ہے۔ یہ بغیر تیل کے چلتی تھی اور اس سے آٹا پیسا جاتا تھا۔ یہ تکنیک وہیں کامیاب تھی جہاں پر نہریں ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی دوآبہ کے کچھ علاقوں میں 'پن چکی' کو چلتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ نہال مسوری نزد ڈاسنا ضلع غازی آباد، بھولا کی جھال ضلع میرٹھ، ماکڑی نزد سیانہ ضلع بلند شہر میں ابھی بھی اس سائنسی و تکنیکی دور میں پن چکی رائج ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے نظم 'پن چکی' کے حوالے سے بچوں کو بہت کچھ بتانے کی کوشش کی ہے۔ 'پن چکی' ایک استعارہ ہے، مسلسل کام میں لگے رہنے کا۔ کیونکہ مسلسل کام میں لگے رہنے سے ہی انسان ترقی کے زینے سر کرتا ہے۔ سماج میں اپنا مقام و مرتبہ بناتا ہے نیز اپنی ایک امیج قائم کرتا ہے، 'پن چکی' ایک تمثیل (Analogy) ہے، ایک علامت (Symbol) ہے۔ ایسی تمثیل و علامت جو اصول و استحکام و تسلسل (Law, Strength, Continiuty) کا مرکب و معجون ہے۔ 'پن چکی' کا اطلاق اُن محرکات و لوازمات سے ہے جہاں بچے کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ موصوف کا مقصد 'پن چکی' کے تعلق سے معلومات فراہم کرانا نہیں بلکہ وہ 'پن چکی' کے ذریعہ اصل میں بچوں کو زندگی کی معنویت و اہمیت بتانا چاہتے ہیں۔ نیز 'پن چکی' انسانی زندگی سے متعلق خارجی تحریک کا وہ استعارہ اور تمثیل ہے جہاں سے بچے کے اندرونی نظام اور داخلی خلیوں میں ذاتی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسے

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی
دھن کی پوری ہے کام کی پکّی
بیٹھی تو نہیں تھک کر
تیرے پہیے کو ہے سدا چکّر
ختم تیرا سفر نہیں ہوتا
نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا
مینہ برستا ہو یا پانی آندھی
تونے چلنے کی ہے شرط باندھی

نہر پر چلنا اور دُھن کا پورا ہونا، تھک کر نہ بیٹھنا، پہیے کو سدا چکّر، سفر کا ختم نہ ہونا، چلنے کی شرط باندھنا، یہ ایسے اعمال و افعال اور حرکات و محاورات ہیں جن میں اصول، استحکام اور تسلسل جیسے نفسی عناصر پیوست ہیں۔ ''دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی'' اس مصرع میں شاعر بچوں کو بتانا چاہتا ہے کہ تم اپنے کام میں سرگرم رہو اور اپنے کام کے تئیں پکّے رہو، ثابت قدم رہو۔ 'پہیے کو سدا چکّر' بھی ایک اشارہ ہے، مسلسل کام میں لگے رہنے کا۔ اور جس طرح 'پن چکّی' کا سفر پورا نہیں ہوتا اسی طرح زندگی کا سفر بھی پورا ہونے والا نہیں۔ اگر اس فانی دنیا کا سفر پورا بھی ہو گیا تو اگلی دنیا کا سفر شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ بقول فانی بدایونی۔

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

انسان کی زندگی کا سفر بھی 'پن چکّی' کی طرح پورا ہونے والا نہیں اور پھر '' تونے چلنے کی ہے شرط باندھی'' اس مصرع میں کلمۂ مشروط (Apodosis) بچے کی خلیات (Cells) اور اعصابی نظام(Nervous System) میں پختہ عزم و ارادہ کو جنم دیتا ہے اور پھر مصرع اولیٰ ''مینہ برستا ہو یا پانی آندھی'' میں مشکلوں سے مقابلہ کرنے کی بات کی ہے، مصیبتوں سے ٹکرانے کی بات کی جا رہی ہے۔ اور پھر یہ شعر۔

تو بڑے کام کی ہے اے چکّی
مجھ کو بھاتی ہے تیری لے چکّی

مذکورہ شعر میں شاعر کو 'چکّی' کی 'لے' کا بھانا' فعل و محاورہ حرکی عمل کی نشاندہی اور چکّی کی معنویت و مقصدیت کو واضح کرتا ہے۔ لفظ 'لے' سے جو سماعی پیکر متشکل ہوتا ہے اس سے فن پارہ میں ابعادِ ثلاثہ کا جنم ہوتا ہے۔ ویسے تو پوری نظم حرکی عمل کی علامت ہے نیز پوری نظم کا سماعی پیکر معنی خیز ہے تبھی تو شاعر ذیل کے شعر میں 'لے' لفظ کی روشنی میں بچوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

علم سیکھو! سبق پڑھو بچو!
اور آگے چلو، بڑھو بچو!

چنانچہ شاعر ہمہ طور پر اپنے مقصد کی طرف مراجعت کر جاتا ہے۔ اب وہ تمثیلی و استعاراتی عمل سے گزرتا ہوا براہ راست بچوں سے مخاطب ہے۔ نیز ابلق ایام اور تسلسلی نظام (Continuity System) کی اہمیت سے بچوں کو آگہی حاصل کرا رہا ہے۔ ایسا نہیں کہ فنکار کھیلنے کودنے کے حق میں نہیں بلکہ ذیل کے شعر میں بھی وہ شرط قائم کر رہا ہے یعنی پہلے کام اور پھر کھیل کود۔ اب یہ کام ظاہری بات ہے بچوں کے تعلق سے پڑھنے لکھنے کا ہی کام ہوگا... نا۔ جیسے۔

کھیلنے کودنے کا مت لو نام
کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام

مذکورہ شعر دیکھیے کہ آج ضرب المثل بن چکا ہے اور وقتاً فوقتاً ماں باپ بچوں کو بطور نصیحت و اصلاح کے سناتے بھی ہیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں ایک اثر چھوڑ رہا ہے۔ دل و دماغ پر نقش قائم کرتا چلا جاتا ہے۔ شعر میں ایک تناسب و توازن اور گہرائی و گیرائی ضم ہوگئی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کا سب سے خاص فنی وصف یہی ہے کہ وہ اپنی نظموں میں توازن و تعادل(Equilibrium) اور تناسب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیونکہ زندگی کی معنویت و مقصدیت توازن و تناسب میں ہی تو قائم ہے جیسے۔

جب نبڑ جائے کام، تب ہے مزا
کھیلنے کھانے اور سونے کا

مذکورہ شعر میں جہاں توازن و تناسب قائم ہے تو نفسیاتی عوامل بھی شامل ہیں کہ کیسے بچے کی دلچسپی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اسماعیل میرٹھی بچے کی تعلیم و تربیت کے ساتھ لہو و لعب پر بھی دھیان دیتے ہیں لیکن شعر میں پھر کلمۂ مشروط کو قائم رکھتے ہوئے بچے کی ذہن سازی کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعر میں لفظ 'مزا' سے واقعی بچوں کو بھی مزا آتا ہے۔ حظ و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ 'جب اور تب' حرفِ شرط نے بالکل واضح کر دیا کہ کھیلنے کھانے، سونے وغیرہ کا موقوف کام کے نبڑ جانے پر ہے نہ کہ پہلے آپ کھیلیں کودیں اور کام کو بعد میں پورا کریں اور اب آخری یہ دو شعر بھی دیکھتے چلیں۔

دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ
نہ کہ اُکتا کے خامشی کے ساتھ
دیکھ لو چل رہی ہے پن چکی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکی

چنانچہ 'پن چکّی' ایک مثبت تسرع (Positive Accelaration) ہے۔ جہاں منفیت کا شائبہ نہیں۔ یہ 'پن چکّی' ایسا تسرُع ہے جو ''جلدی سے دیری بھلی'' کہاوت کی تردید کرتا ہے۔ ایکسی لیریشن میں ارتقائی پہلو پیوست ہے جو انسان بالخصوص بچوں کو آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اب ان آخری دو شعروں کو دیکھیے کہ چلتے چلتے بھی اسماعیل میرٹھی شرطیہ وصف کو ملحوظ رکھتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں اور شاید اسماعیل میرٹھی بھی، کہ یہ شرطیہ انداز ہی برے کاموں کا نفسیاتی امتناع ہے۔ کیونکہ ہم روزمرہ کی بول چال میں بھی بچوں کو انتباہ کرتے وقت' حروف شرط' یا 'حروف تاکید' کا استعمال کرتے ہیں جس سے بچوں کے اندر وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو انھیں اچھا شہری اور ایک مہذب انسان بناتا ہے۔ اور پھر'' دیکھ لو چل رہی ہے پن چکّی'' مصرع میں بصری پیکر کے ذریعے زور دیا جا رہا ہے۔ 'دیکھ لو' اور اس 'دیکھ لو' میں شاید تمام نظم کا نچوڑ اور لب لباب شامل کر دیا ہے جو ایکسی لیریشن، نامیاتی اور حیاتیاتی ارتقا کا ضامن ہے۔ نیز اسماعیل میرٹھی کا منضبط مشاہدہ (Controlled Observation)، نامیاتی و حیاتیاتی ارتقا (Organic Evolution) ایسے نفسی عناصر کو جنم دیتا ہے، جہاں سے بچے کی نشو و نما ہوتی ہے اور اس کا لسانی و اخلاقی سفر شروع ہوتا ہے۔ ان تمام فنی تخصیص کے ساتھ مثنوی کا جولب و لہجہ اور آہنگ نیز نشیب و فراز ہے وہ یوریت کا حامل نہیں بلکہ نظم میں ابھرنے والا سماعی پیکر ایک نغمگی اور موسیقی کا احساس کراتا ہے۔ بہرکیف مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی 'پن چکّی' اسماعیل میرٹھی کی ایک اثر انگیز، معنی خیز، حرکی توانائی سے پُر، اور با مقصد نظم ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ آج بھی بچوں کے لیے درس و نصیحت کا سامان ہے جس سے ہم روگردانی نہیں کر سکتے۔

آخر میں اس پہلو سے بھی نقاب کشائی کرتے چلیں کہ اسماعیل میرٹھی کی 'اردو زبان کی دوسری' کتاب میں یہ نظم چودہ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ اس نظم میں دو شعر اور ہیں جو نظم کے درمیانی حصہ میں شامل ہیں۔ یعنی یہ نظم سولہ اشعار کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ دو شعر بھی یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

پانی ہر وقت بہتا ہے ڈھل ڈھل
جو گھماتا ہے آکے تیرے کل
کیا تجھے چین ہی نہیں آتا
کام جب تک نبٹ نہیں جاتا

■

Dr. Mohd. Mustamir
Mohalla Ikraam, Punjabi Chowk
Tehseel: Rampur, Maniharam
District: Saharanpur - 247451 (UP)
Mob.:9023746092

مجروح سلطانپوری کا ابتدائی ادبی سفر

امین احسن

مجروح سلطانپوری نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا وہ دور غلامی سے نجات کی عظیم الشان تحریک کا زمانہ تھا۔اس زمانے میں جذبۂ قوم پرستی بین الاقوامیت میں اور ذاتی مسائل اورغم ومسرت اجتماعیت میں تبدیل ہورہے تھے۔غزل کی تہذیبی وثقافتی اور جمالیاتی قدروں پر ہر چہار جانب سے نہ صرف یلغار ہورہی تھی بلکہ عہد رفتہ کی تغزلانہ شان،اشاریت،رمزیت اورایمائیت کی شگفتگی وشادابی پر بھی سوالیہ نشان لگ رہے تھے۔پرانی قدروں اورہیئتوں پرنئی حقیقتوں اورمماثلتوں کے مابین مکالماتی اورتحریری بحث ومباحثے،تنقید وتبصروں کی زورآزمائی اورکشمکش روزوشب جاری تھی اوراس بات پر خصوصی توجہ دی جارہی تھی کہ شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی اوراس سے بھی آگے زندگی کی حقیقتوں وسچائیوں کوناقدانہ شعور کے ساتھ برتنے اورپیش کرنے جیسی کوئی چیز ہے یانئی معنویت وانفرادیت،انداز وآہنگ،لب ولہجہ اوراسالیب نو کی آمیزش سے ادبی لغت کونئے تقاضوں سے ہم آہنگ وہم آمیز کرنے کادوسرانام ہے۔ایسے تجرباتی دور میں مجروح نے نہایت خاموشی اورخوبصورتی سے نہ صرف عہد رفتہ کی روایتوں اورقدروں کوشگفتہ وشاداب کیا بلکہ ادب کی نئی امکانی وسعتوں اوربلاغتوں کے حسین امتزاج سے عہد حاضر کی دھڑکنوں وترقی پسندی کے مفاہیم اوراپنی انانیت اورخودداری کے جواہر بیش بہاسے لیلائے شاعری یعنی اردوغزل کے دامن کومزید وسعت بخشی۔اسی لیے ان کی شاعری زیادہ بلیغ اورزیادہ وسیع ہوگئی ہے۔ان کے بارے میں یہ بات یقینی طور پرکہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے 'پرآشوب معرکۂ ادب' میں غزل کوسرفرازی بھی عطا کی اوراسے مجروح ہونے سے بچایا بھی۔اس کی سخت جانی کو ثابت بھی کیااورفنی لطافتوں کوخاص تیوروں سے آشنا بھی کیا۔

عام طور پر شخص سے شخصیت بننے کاسفرنہایت دشوارکن اورکٹھن ہوتاہے اور دیکھا جائے توقطرے کے گہر بننے کے مترادف ہوتاہے۔ان کااسرارالحسن سے مجروح بننے تک کاسفرخاصا طویل اوردلچسپ ہے۔یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم سلطانپور میں ہوئی۔ان کے والد محکمۂ پولیس میں ملازمت سے وابستہ تھے۔تبادلے،ہجرت اورنقل مکانی توپیشۂ ملازمت کے جزولاینفک ہوتے ہیں۔کبھی یہاں توکبھی وہاں کا سفر جاری رہتاہے۔جب ان کے والد کاتبادلہ ٹانڈہ فیض آباد(امبیڈکرنگر) میں ہواتواس وقت ان کی عمرتقریباًبارہ سال تھی۔ان کی تاریخ پیدائش اورابتدائی دور میں شاعری سے وابستگی کے سلسلے میں ادباوشعرا کی آرا الگ الگ ہیں۔خود مجروح کے بیانات بھی مختلف اور متضاد ہیں۔مجروح شناسی کے لیے ان آرا پرنظرڈالنا ضروری معلوم ہوتاہے۔پروفیسرعلی احمد فاطمی (الہ آباد یونیورسٹی) اپنے مضمون 'تین ترقی پسند شاعر۔سردار،مجروح اورکیفی' میں رقم طراز ہیں:

''اردو کے ممتازترقی پسند شاعرمجروح سلطانپوری کا اصل نام اسرارالحسن خاں تھا۔وہ 1921 میں پیداہوئے۔''

ڈاکٹرسیمارضوی (لکھنؤیونیورسٹی) 'ترقی پسندغزل گوئی کی ایک معتبر آواز (مجروح سلطانپوری)' میں ان کاذکرکچھ اس طرح کرتی ہیں:

''اسرارالحسن خاں مجروح سلطانپوری: پیدائش18/جون 1920 وفات 24 /مئی 2000''

اس سلسلے میں ڈاکٹر بشریٰ بانوصدرشعبۂ اردومیرٹھ کالج کی رائے درج ذیل ہے:

''مجروح سلطانپوری کی پیدائش 1919 میں اعظم گڑھ میں ہوئی۔''

(بحوالہ مضمون۔مجروح سلطانپوری کی شاعرانہ عظمت)

درسی کتاب 'تاریخ ادب اردو' کے مصنف پروفیسر نورالحسن نقوی نے بھی مجروح کی پیدائش 1919 پر ہی اتفاق کیاہے اورپروفیسرخلیق انجم 'گل کاری وحشت کاشاعر: مجروح' کے سوانحی خاکے میں ذکرکرتے ہیں:

''ایک دفعہ میں نے مجروح صاحب سے ان کاسنہ ولادت دریافت کیاتوانھوں نے بتایا کہ وہ یقین کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن کچھ شواہد ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتاہے کہ وہ 1915 یا 1916 میں اترپردیش کے ضلع سلطانپور میں قصبہ گنجہڑی میں پیداہوئے تھے۔لیکن مجروح کی وفات کے بعدان کے صاحبزادے نے انگریزی میں مجروح صاحب کاجو خاکہ مرتب کیاہے اس کے مطابق وہ پہلی اکتوبر 1919 کوپیداہوئے تھے۔''

مرزاسلیم بیگ کاانٹرویوبعنوان 'مجروح سلطانپوری سے تفصیلی گفتگو' جومقام اورکلام نامی کتاب میں شامل ہے۔جسے فیروزاحمد دہلوی نے مرتب کیاہے۔جس میں مجروح خودفرماتے ہیں:

''اب والدہ سے پوچھا کہ ہم کب پیداہوئے تھے۔کہنےلگیں جمعہ کادن رہا۔تیسرے دن عید تھی۔اب ہم نے اپنی بہن سے پوچھاتویہ ہماری بہن جوہیں وہ ہم سے ڈھائی سال بڑی ہیں۔اب ڈھائی سال کم جولگاتے ہیں اس کے حساب سے 1921 ہوناچاہیے لیکن اندازہ کرکے ہم نے 1919 مشہور کردیااورہمارے جتنے انٹرویو اب تک ہوئے ہیں سب میں سنہ 19 ہی بتایاہے۔''

مذکورہ بالا اقتباسات اور بیانات میں کافی تضاد بھی

ہے اور زمانی فرق بھی۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اب تک ان کی تاریخ پیدائش تحقیقی بنیاد پر نہیں پیش کی گئی ہے۔ جہاں تک ہماری تحقیق و جستجو ہے، اس میں کسی شک اور شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ مجروح کا داخلہ مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ ضلع فیض آباد (امبیڈکر نگر) شعبۂ عربی و فارسی میں درجۂ نظامیہ میں یکم/ جولائی 1928 کو ہوا تھا۔ مدرسے کے داخلہ رجسٹر میں ان کی تاریخ، پیدائش یکم جولائی 1916 اور پتا و سکونت موضع گنجہری ضلع سلطانپور درج ہے۔ لیکن مسلسل غیر حاضری کی بنیاد پر 31 مارچ 1929 کو نام خارج کر دیا گیا ہے۔ ان کا دوبارہ داخلہ 14/ اکتوبر 1929 کو کیا گیا ہے اور اندراج رجسٹر میں 1931 میں مولوی امتحان میں کامیابی درج کی گئی ہے۔ ایک بار پھر مسلسل غیر حاضری کی بنیاد پر ان کا نام 29/ فروری 1931 کو خارج کیا گیا ہے۔ تیسری اور آخری مرتبہ ان کا داخلہ یکم مارچ 1934 میں درسِ نظامیہ میں درج کیا گیا ہے اور مسلسل غیر حاضری کی بنیاد پر ان کا نام 1935 میں خارج کیا گیا ہے۔

اس طرح مجروح کی مدرسے میں داخلے کے وقت عمر بارہ سال تھی۔ انھوں نے ٹانڈہ میں بحیثیت ایک طالب علم کے تقریباً سات سال گذارے اور سنِ بلوغیت و ایامِ جوانی کی دہلیز پر پہنچے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پرورش و پرداخت ٹانڈہ میں ہی ہوئی۔ مدرسے سے مسلسل غیر حاضر رہنا اور کئی مرتبہ نام خارج ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کا رجحان یا تو مذہبی تعلیم کی طرف نہیں تھا یا ان کا وقت کسی اور مصروفیت میں گذرتا تھا۔ اس کا اعتراف انھوں نے ایک انٹرویو میں کیا ہے:

''فیض آباد میں ایک مشہور قصبہ تھا۔ 'ٹانڈہ' وہاں کی کام دانی بہت مشہور تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈھاکہ کی ململ کسی زمانے میں بہت مشہور تھی۔ تو ٹانڈہ سے تین میل دور ایک زمینداروں کی بستی تھی۔ وہاں ہماری بہن بیاہی گئی تھیں اور ٹانڈہ میں مدرسہ بہت اچھا تھا اور وہاں عربی کی تعلیم بہت عمدہ دی جاتی تھی۔ پھر جو کچھ تعلیم میں نے حاصل کی، وہیں سے حاصل کی۔''

(بحوالہ 'مجروح سلطانپوری: مقام اور کلام'، مرتبہ: ڈاکٹر فیروز احمد 2008، ص 262)

مدرسے کے اندراجات اور ان کے خود کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور ذہنی پرورش و پرداخت میں سرزمین ٹانڈہ کا نہایت اہم اور کلیدی رول رہا ہے۔ مجروح سے وابستہ بہت سی باتیں مثلاً شعر و شاعری سے شغف، عشق و ہجرت، ڈرامہ و آرٹ سے لگاؤ وغیرہ کا ذکر اکثر بزرگوں سے سنا ہے۔ راقم الحروف کے محلے میں قائم 'مومن لائبریری' میں ان کے قریبی دوست رفیق احمد صباغ صاحب اکثر کتابوں کے سلسلے میں آیا کرتے تھے۔ وہ مجروح کا کلام نہایت مترنم آواز میں (دیکھ زنداں سے پرے اور دیگر کلام) سناتے تھے۔ ان سے وابستہ کچھ باتیں بھی بتاتے تھے۔ انھوں نے ہی بتایا:

''مجروح کو موسیقی، آرٹ اور شاعری سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ قرب و جوار اور اطراف ٹانڈہ میں شادی بیاہ اور تیو ہاروں پر ہونے والی تقاریب جیسے مشاعرے، قوالی، ڈرامہ اور نوٹنکی وغیرہ میں شرکت کا جنون اس قدر تھا کہ وہ مدرسے کے اصول و ضوابط سے روگردانی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اکثر راتوں کو مدرسے کی چھت پر چڑھ کر عمارت کے باہری حصے میں بنے کھانچے دار ستونوں کے سہارے اُتر کر باہر نکل جایا کرتے تھے۔ یہ نہایت جوکھم بھرا اور جان لیوا قدم ہوتا تھا۔ آج بھی ان ستونوں کو دیکھ کر دل و دماغ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر شوق اور جنون کی کارفرمائی خطرات اور حادثات کو پسِ پشت کر دیا کرتی ہے۔''

انھوں نے شاعری کا آغاز کب کیا؟ یہ سوال تحقیق طلب ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی مختلف رائے ہے۔ ان کے بچپن کے دوست حکیم اتن صاحب کے مطابق ''انھوں نے سلطانپور میں پہلی غزل کہی۔'' (بحوالہ ماہنامہ 'چراغ'، بمبئی)

'گل کاریِ دشت کا شاعر' (مرتبہ: پروفیسر خلیق انجم) میں شامل انٹرویو میں مجروح خود کہتے ہیں:

''دیکھیے موزوں طبیعت شاید بچپن سے ہی تھی۔ .... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں تیسرے درجے میں پڑھتا تھا۔ تو ٹیکسٹ بک میں ایک نظم پڑھائی جا رہی تھی۔ تو پرائمری اسکول کے ٹیچر کی تعلیم ہی کیا ہوتی ہے؟ تو وہ شعر کو غیر موزوں پڑھ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا ''نہیں ماسٹر صاحب، ایسے نہیں، ایسے ہونا چاہیے۔'' وہ کوئی نظم تھی۔ 'جگنو' کے متعلق اب یاد نہیں ہے۔''

(گل کاریِ دشت کا شاعر ص 263)

مجروح کو موسیقی، آرٹ اور شاعری سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ قرب وجوار اور اطراف ٹانڈہ میں شادی بیاہ اور تیو ہاروں پر ہونے والی تقاریب جیسے مشاعرے، قوالی، ڈرامہ اور نوٹنکی وغیرہ میں شرکت کا جنون اس قدر تھا کہ وہ مدرسے کے اصول وضوابط سے روگردانی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

یہ اقتباس دلالت کرتا ہے کہ مجروح کو زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ظاہر ہے درجہ سوم کا یہ طالب علم غیر معمولی اور خداداد صلاحیت کا مالک تھا جسے اتنی کم عمری میں شاعری کا اتنا ادراک و شعور تھا کہ وہ اپنے اُستاد کو صحتِ الفاظ اور موزونیت کے ساتھ شعر پڑھنے کے لیے نشاندہی کرتا ہے اور ایسا طالب علم یقیناً شعر کہنے کی صلاحیت سے متصف ہوگا۔ بس اسے تھوڑا سا مناسب اور موافق ماحول فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ جس زمانے میں ان کا داخلہ مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ میں ہوا۔ اس وقت وہاں کا علمی اور ادبی ماحول کافی سازگار تھا۔

یہ حسنِ اتفاق ہی تھا کہ ٹانڈہ میں انھیں بزرگ طبیب و شاعر حکیم خلیل الرحمٰن (تلمیذ حکیم اجمل خاں)، اُستاد الشعرا ڈاکٹر محمد ایوب ذوقی، حکیم عبد الجلیل، نور الحق فگار، محمد مدنی بیکس، ہندی گورکھپوری، منشی افضال اللہ، مجاہد آزادی منشی احمد کریم کامل اور سہراب آزاد جیسے شعرا کا ساتھ ملا۔ جس میں ہر کوئی جداگانہ صلاحیت کا مالک تھا۔ پروفیسر محمود الٰہی زخمی صاحب کی راقم الحروف سے ذاتی گفتگو کا حوالہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ:

''ڈاکٹر ذوقی، فگار، مجروح، مدنی بیکس، اور مجاہد آزادی منشی احمد کریم کامل وغیرہ زود گو شاعر تھے اور فی البدیہہ شعر کہنے میں حد درجہ مہارت رکھتے تھے۔''

منشی افضال اللہ اور سہراب آزاد وغیرہ کا تعلق قصبے کے رئیس خاندانوں سے تھا۔ ان حضرات سے ان کے بہت قریبی اور دوستانہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر ذوقی کا مطب شیخ پورہ (چھوٹی بازار) کی مسجد کی دوکان میں تھا جہاں اکثر و بیشتر ان حضرات کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ سڑک کی دوسری جانب مقصود خاں کا کھانے کا ہوٹل تھا۔ ان سے بھی ان کے بہتر تعلقات تھے۔ جہاں کبھی کبھی وہ طعام بھی کر لیتے تھے۔ ان کا مکان راقم الحروف کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ اسی سے منسلک قصبے کی علم دوست شخصیت حافظ بدر الدین صاحب کا مکان بھی ہے جہاں وہ اکثر تشریف لاتے تھے۔ مجروح نے ان کی علمیت سے کافی فیض حاصل کیا۔ چونکہ حافظ بدر الدین صاحب سے میرے والدِ محترم کے گہرے مراسم تھے اس لیے یہ ذکر میں اپنے والدِ محترم کی گفتگو کے حوالے سے کر رہا ہوں۔ ان احوال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ جس ادبی ماحول اور فضا میں سانس لے رہے تھے وہ نہایت سازگار تھی۔ اور ایسے میں ان کی فطری صلاحیتوں میں نکھار آنا یقینی تھا۔ اسیریِ زلف گرہ گیری اور معاملۂ عشق و شعر و شاعری سے شغف ہی مدرسے سے اخراج کا آخری سبب بنا۔ جس کا اعتراف انھوں نے خود

مرزا سلیم کو دیے گئے انٹرویو میں کیا ہے۔

''.............اس کے بعد میں نے طب کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ 1936 میں لکھنؤ کے طبّیہ کالج (جھوائی ٹولہ) میں داخلہ لیا۔''

اس طرح لگ بھگ دو سال کا عرصہ انھوں نے لکھنؤ میں گزارا اور طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1938 میں ایک بار پھر ٹانڈہ کا رخ کیا اور یہیں پر اپنا مطب کھول کر علاج و معالجے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے ان کے ٹانڈہ میں دوبارہ قیام کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی انٹرویو میں شاعری کے حوالے سے انھوں نے مبہم انداز میں ٹانڈہ کا ذکر کیا ہے۔

''........صرف یہ کہ کوئی مضمون اچھا سا آجائے۔ جمالیاتی آجائے۔ عشقیہ آجائے۔ اچھا سیاسی بھی۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت میرا رجحان تھا کہ اس وقت جو انگریز کی سیاست تھی، چھلک پڑتی تھی۔ کبھی کبھار۔ غرض یہ کہ ایک ماحول تھا۔ احباب تھے۔ چھوٹی سی جگہ تھی اور اس چھوٹی سی جگہ میں مجھے بہت اچھا مان لیا گیا۔ شاید بڑی جگہ پر میں ہوتا تو رہ جاتا۔

(بحوالہ مجروح سلطانپوری سے تفصیلی گفتگو۔ مرزا سلیم بیگ، ص 264)

مجروح کے تخلص کے سلسلے کی کڑی فگار اور بیکس سے ہی جڑی ہوئی ہے۔ انھوں نے تو اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ چھوٹی سی جگہ (ٹانڈہ) جہاں انھیں سراہا گیا، عزت سے نوازہ گیا، قدر کی گئی اور وہ مجروح سلطانپوری بن گئے۔ یہاں ایک بات اور وضاحت طلب ہے کہ انھوں نے ٹانڈہ کے ادبی ماحول اور اپنی شاعری کے پروان چڑھنے کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن اپنے ہم عصر شعرا و احباب کا نام لینے سے گریز کیا ہے۔ اور اپنے تخلص کے بارے میں نہ جانے کیوں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''تو وہاں سلطانپور میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایک بار ہمارے جی میں آیا کہ ہم بھی مشاعرہ پڑھیں گے۔ تو ہماری غزل بہت چل گئی صاحب۔ اس کے بعد ہم نے دوبارہ غزل کہی، وہ بھی پسند کی گئی۔ تو یوں ہم چل نکلے۔ اب ہوا کہ اسرار تخلص تو نہیں چلے گا۔ یہ بات ہے نومبر 1939 کی۔ اس وقت ہم دو تین غزلوں کے شاعر تھے۔ تو اس مسئلے پر ہمارے دوستوں کا بورڈ بیٹھا کہ بھئی ان کا تخلص ڈھونڈا جائے۔ اچھا اس وقت میرا اُردو ادب کا مطالعہ بالکل نہیں تھا۔ صرف درسی کتابیں ہی پڑھی تھیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میر مہدی مجروح بھی کوئی گزرے ہیں۔ اس بورڈ میں یہاں کراچی کے ایک سوز شاہجہاں پوری بھی تھے۔ اس لیے کہ ان کا سسرال بھی وہیں تھا۔ تو ان سب نے مل کر میرا تخلص مجروح رکھا اور اس کو سب نے او۔کے کیا۔ اس کے بعد میرا تخلص مجروح ہو گیا اور یہ دوستوں نے رکھا، میں نے نہیں رکھا۔ میں تو اسرار تخلص ٹھیک سمجھتا تھا۔''

(بحوالہ مجروح سلطانپوری سے تفصیلی گفتگو مرزا سلیم بیگ، ص 263)

مجروح کی شاعرانہ صلاحیت ومقبولیت اور ٹانڈہ میں قیام کے بارے میں پروفیسر محمود الٰہی رقم طراز ہیں:

''اتفاق کی بات ہے کہ اسی زمانے میں ٹانڈے میں مشاعروں کا زور خاصا بڑھا۔ ان مشاعروں کی جان مجروح سلطانپوری اور ہندی گورکھپوری تھے۔ ٹانڈہ تو ایک طور پر مجروح صاحب کا وطن تھا ہی اور ہندی صاحب کی رفیقۂ حیات یہیں کی تھیں۔ اس لیے ان کا بھی وطن ثانی بن گیا۔''

(بحوالہ 'شعلۂ گل' ہندی گورکھپوری ایک تعارف۔ از پروفیسر محمود الٰہی ص 4)

اس طرح حقائق اور شواہد اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ ان کا تخلص کچھ احباب کی مدد سے سلطانپور میں رکھا گیا۔ کیونکہ نومبر 1939 سے پہلے ہی وہ مجروح سلطانپوری کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اور یہ کہ وہ شاعری کے ابتدائی دور سے ہی یہی تخلص رکھتے تھے جیسا کہ ان کا اور ان کے ہم عصروں کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں 21دسمبر 1938 کو ہوبرٹ ہائی اسکول، ٹانڈہ، فیض آباد (امبیڈکر نگر) میں منعقدہ مشاعرے کی روداد کافی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت مولوی زاور حسین ماہر جونپوری نے فرمائی تھی۔ یہ ایک طرحی مشاعرہ تھا جس کا مصرعۂ طرح تھا۔ ''جاتا ہوں تیری دید کا ارماں لیے ہوئے'' اس مشاعرے کی روداد گلدستۂ مشاعرہ، بزم ادب ہوبرٹ ہائی اسکول ٹانڈہ، یعنی 'عیارِ مشاعرہ' کے نام سے اواخر دسمبر 1938 میں ناصری پریس جونپور سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ یہ 44 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے۔ اس میں صفحہ 4 پر صدر مجلس مشاعرہ کی مختصر ابتدائی تقریر کے بعد صفحہ 5 پر قصبے کے مشہور طبیب حکیم خلیل الرحمٰن ٹانڈوی کی نعتیہ غزل درج ہے۔ صفحہ 6 پر حکیم عبدالجلیل ٹانڈوی، صفحہ 8 پر حکیم اسرار الحسن صاحب مجروح سلطانپوری اور صفحہ 25 پر محمد مدنی بیکس ٹانڈوی وغیرہ کی غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ٹانڈہ کے دیگر شعرا کے ساتھ مہمان شعرا، اسکول کے اساتذہ اور متعلمین کے کلام کے ساتھ مشاعرہ میں شامل سبھی شعرا کے کلام شامل ہیں۔ مجروح کی یہ غزل جوان کے مجموعۂ کلام 'مشعلِ جاں' میں شامل نہیں ہے۔ (اس کا عکس دیا جا رہا ہے۔)

اس گلدستے میں مجروح کا کلام ابتدائی صفحات پر چند ایک نام کے بعد درج کیا گیا ہے جو ان کے ادبی مقام و مرتبے اور حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ سب اتنا کچھ اچانک یا اتفاقی طور پر نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک پہنچنے میں کہنہ مشقی، مشاقی وفنی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجروح کی طالب علمی کا سات سالہ دور ٹانڈہ میں اور دو سال لکھنؤ میں گزرا۔ حکمت کی سند حاصل کرنے کے بعد 1938 میں ٹانڈہ میں مطب کا قیام وعلاج ومعالجے کی خدمات، ان کے ہم عصر شعرا و دوستوں کے احوال اور حلقۂ احباب کی محفلوں کے ذکر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کافی آسان ہو گیا ہے کہ ان کی ذہنی وادبی تربیت اور سرپرستی قصبہ ٹانڈہ میں ہی ہوئی۔

■

Dr.Ameen Ahsan
Mohalla Qazipura
Tanda Ambedkarnagar- 224190 (UP)
Mob.: 9839745971

جموں و کشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ

محمد یاسین گنائی

جموں و کشمیر میں غزل گوئی کے آغاز کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن یہاں کی شاعرات کے حوالے سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہاں کی اولین شاعرات میں لل دید، حبہ خاتون، روپا بھوانی اور ارنی مال کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہاں کی غزل گو شاعرات پر قلم اُٹھانے سے پہلے یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ کس کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ان میں لل دید سنسکرت آمیز کشمیری، حبہ خاتون فارسی آمیز کشمیری، روپا بھوانی اردو آمیز ہندی اور ارنی مال قدیم کشمیری زبان میں لکھتی تھیں۔ پہلی غزل گو شاعرہ کی تلاش کے لیے ہمیں لگ بھگ چھ سو سال کی تاریخ کا جائزہ لینا پڑے گا اور ان چھ سو سال میں ریاست کی آٹھ شاعرات میں سے کسی ایک کو پہلی غزل گو شاعرہ کا تاج پہنانا پڑے گا۔

جموں و کشمیر کی پہلی شاعرہ اور پہلی روحانی بزرگ خاتون لل دید چودھویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھیں۔ ان کا جنم عبدالوہاب شائق نے اپنی منظوم تاریخِ کشمیر میں 1334-35 لکھا ہے۔[1]

انھوں نے سنسکرت آمیز کشمیری زبان میں عارفانہ، صوفیانہ اور قلندرانہ شاعری کی ہے۔ ان کو بجا طور پر ریاست کی پہلی شاعرہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے دور میں دہلی اور دکن میں اردو اور فارسی زبان کے مشترکہ نمونے ریختہ کے نام سے ملتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی متعدد کشمیری شاعرات کے کلام پر لل دید کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں دور دور تک بھی اردو کا کوئی لفظ، مصرعہ یا شعر نہیں ملتا ہے۔

لل دید کی متصوفانہ شاعری کے دو سو سال بعد کشمیر کی سرزمین سے دوسری بڑی شاعرہ حبہ خاتون پیدا ہوئی تھیں۔ حبہ خاتون کی ولادت 1541 میں ضلع پلوامہ کے زعفرانی شہر چندہارہ میں ہوئی تھی۔ حبہ خاتون کو کشمیر کی نور جہاں، کشمیری غزل کی بانی اور بلبل شاعرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کشمیر میں رومانی شاعری کا آغاز انھی کے سر جاتا ہے۔ ان کی آواز میں قدرتی مٹھاس، چاشنی اور غم نظر آتا ہے۔ وہ کشمیر کی ملکہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہزاروں لوگوں کے دل کی دھڑکن بھی تھیں۔ ان کی کشمیری شاعری میں درد و غم، بے چینی و بے قراری، تانیثی شعور، عصری آگہی اُس دور میں ملتا ہے جب نہ غم کا شاعر میر اور عورتوں کی ہمدرد تحریک تانیثیت وجود میں آئی تھی۔ ان کے گیت آج بھی کشمیری عورتیں اہم مواقع پر گاتی رہتی ہیں۔ یہ وہی دور ہے جب اردو زبان میں باضابطہ طور پر شاعری اور نثر خصوصاً مثنویاں لکھی جانے لگی تھیں مگر بدقسمتی سے ان کے کلام میں بھی اردو کے الفاظ نہیں کے برابر ملتے ہیں۔

حبہ خاتون کی ولادت کے ٹھیک اسّی سال بعد روپا بھوانی کا جنم 1621 میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو آمیز ہندی زبان میں شاعری کی ہے اور ان کی شاعری میں اردو، فارسی، سنسکرت اور کشمیری زبان کے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ دور دکن میں اردو شاعری کا دورِ عروج تھا۔ اور اب تک درجنوں اہم مثنویاں منظر عام پر آچکی تھیں۔ کشمیر کے ہونہار شاعر اور نقاد ڈاکٹر نذیر آزاد نے روپا بھوانی کے چند اشعار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہیں۔ حالانکہ یہ بات صحیح ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ اردو کے الفاظ ملتے ہیں۔ اور جو تجربہ امیر خسروؒ نے اردو اور فارسی کے میل جول سے چودھویں صدی میں کیا تھا، وہی تجربہ روپا بھوانی نے ہندی اور اردو کے میل جول سے سترھویں صدی میں کر کے دکھایا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں اردو نما چند اشعار۔

اپنے گھر آیا آپ سائیں
جو کچھ میں تھا سو اب نائیں
وہ بودھ آیا گرو کی بڑھائی
جن گرو نے دیانت کا تو بتائی [2]

مگر ان کی شاعری کو اردو شاعری کہنا اور پھر اردو کی پہلی غزل گو شاعرہ قرار دینا بعید از قیاس ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان دو اشعار میں اپنے، گھر، آیا، آپ، جو، کچھ، میں، تھا، سو، اب، وہ، بڑھائی، جن، کا وغیرہ خالص اردو الفاظ ہیں۔ ان کے کلام کا بغور جائزہ لینے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تجربے کے طور اس نئی زبان کے الفاظ استعمال کرتی تھیں اور ان کے کلام کو خالصتاً اردو کلام کہنا مناسب نہیں لگتا ہے۔ ان کے بعد کشمیر کے ادبی منظر نامے پر 1621 میں ارنی مال نام کی کشمیری شاعرہ آتی ہیں۔ انھوں نے کشمیری شاعری میں نسائی لب و لہجے کو کافی فروغ دیا ہے۔ لیکن ان کے کلام میں اردو الفاظ کا کوئی عمل دخل نہیں ملتا ہے۔ ان کے دستیاب شدہ کلام میں اکا دکا الفاظ ہی مترادفات کے طور پر ملتے ہیں۔ اور روپا بھوانی کے مقابلے میں بہت کم بلکہ نا کے برابر اردو الفاظ و محاورات استعمال کیے ہیں۔ گویا ان چاروں شاعرات میں سے کسی کو بھی اردو غزل گوئی کے حوالے سے اولیت کا تاج پہنانا مشکل ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو کی پہلی غزل گو شاعرہ کی تلاش میں بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمان صاحب نے 1928 میں پیدا ہونے والی شہزادی کلثوم کو ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ قرار دیا ہے۔[3]

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1877 میں شائع ہونے والے نعتیہ مجموعہ 'گلبن نعت' کی شاعرہ زینب بی بی محجوب کو کیوں ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام میں 29 نعتیہ غزلیں ملتی ہیں۔ محجوب کی حیات اور کلام پر مختصراً روشنی ڈالتے ہیں اور کچھ اہم نکتے اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

محجوب کا تعلق اننت ناگ کے بجبہارہ علاقے سے تھا۔ ان کا انتقال سترہ یا بیس سال کی عمر میں 1869 کے آس پاس ہوا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ 1948 کے آس پاس پیدا ہوئی تھیں۔ حالانکہ یہ ایک قیاس آرائی ہے۔ کیونکہ ان کے حالات زندگی کے بارے میں مختلف گوشے آج بھی پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا سلسلہ نسب محجوب کے پردادا سید میر جمال الدین قادری، دادا میر محمد اسمٰعیل قادری اور والد مولوی انور شاہ قادری کے ذریعے سے حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔[4]

پروفیسر عبدالقادر سروری نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان کے والد بجبہاڑاہ (اننت ناگ) میں حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ کی زیارت کے ساتھ وابستہ تھے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں رامپور گئے تھے اور محجوب کچھ دیر پنجاب میں رہی تھیں۔ محجوب نے اپنے مجموعہ کلام میں ایک غزل والیٔ رام پور کی مدح میں لکھی ہے جس میں نواب کلب علی خان کی مدح کے ساتھ، انہوں نے اپنے والد کی شعر گوئی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد بھی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پرہیزگار اور دیندار انسان تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد نواب کلب علی خان کے دربار سے وابستہ تھے اور وہ ان کے والد پر کافی مہربان تھے۔ اپنے والد اور نواب کلب علی خان کی مدح میں لکھی گئی غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہمیشہ عزت دنیا ہو میری والد کو
کہ ہیں وہ فن سخن میں یگانہ واستاد
انہی کی فیض سخن ہی ہوئی ہوں میں ممتاز
انھوں نے شعر و سخن کا مجھی دیا ارشاد
جناب کلب علیخان محیط بخشش وداد
ہو سر پہ اس کی سدا سایہ شہ بغداد
کہ ہیں وہ والی و ممدوح میری والد کے
کی جس کے فیض و کرم نے ہی اک جہان آباد

ان کے کلام میں فارسی اور اردو کے درجنوں مرکبات، مذہبی، سماجی، تاریخی، نسائی، لسانی، عشقیہ، جذباتی، اعتقادی اور نفسیاتی انداز کی ملتے ہیں۔ جن میں ظلماتِ عصیان، فکرِ دین ذکرِ دین، فضلِ ایزدی، ظلِ الطاف نبیؐ، غمِ گردشِ ایام، دولتِ مہرِ محمدؐ، الہامِ حق، عاشقانِ احمدی، آتشِ غم، تڑپِ فرقت، محرمِ اسرار، عارضِ تابان، صورتِ سیماب، غیرتِ عرشِ معلیٰ، چرخِ ستمگر، داغِ لولاک، قلزمِ الطاف، خاطرِ غمگین، شق القمر، افسرِ لولاک، غیرتِ خورشید، مشکِ ناب، ایامِ بہاری، مثالِ زلفِ محبوبان، پردہ پوشِ عاصیان وغیرہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ماہنامہ 'الحیات' اور سالنامہ 'حمد و نعت' کے مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''اس شاعرہ کا تعلق کشمیر سے ہے۔ سید محمد انور شاہ (ساکنہ بجبہاڑہ کشمیر) کی صاحبزادی زینب بی بی محجوب نے 'گلبن نعت' کے نام سے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ محجوب نے یہ مجموعہ صرف پندرہ روز میں مکمل کیا۔ اس سے قبل وہ خواب میں نبی برحقؐ کی زیارت سے مشرف ہو چکی تھی۔ 'گلبن نعت' جس کا مخطوطہ کشمیر کے محکمہ آرکائیوز میں محفوظ ہے' میں قرآنی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال عام ملتا ہے... شاعرہ استغاثہ کے انداز میں اپنی خستہ حالی پر بارگاہِ رسالت پناہ میں فریاد کناں ہے۔''[5]

زینب بی بی محجوب کو جموں و کشمیر کی پہلی اردو غزل گو شاعرہ ثابت کرنے کے لیے کچھ دلائل اور شواہد کی ضرورت پڑے گی۔ اس ضمن میں غزل کے اجزائے ترکیبی، غزل کی اقسام اور غزل کے مضامین کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نعتیہ غزل بھی غزل ہی ہوتی ہے۔ غزل ایک ایسی صنف کا نام ہے جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں اور باقی تمام اشعار کا دوسرا مصرعہ پہلے شعر کا ہم قافیہ ہو۔ غزل میں موضوعات اور اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ یوں جب غزل کی مکمل تعریف ہیئت کے لحاظ سے ہوتی ہے تو ہر وہ کلام جس میں ردیف، قافیہ، بحر کے ساتھ مطلع و مقطع ہو غزل کہلاتی ہے۔ یہی چیزیں غزل کے اجزائے ترکیبی بھی کہلاتے ہیں۔ اور اس تعریف کی رُو سے ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ زینب بی بی محجوب ہی ہیں۔ کیونکہ ان کی تمام نعتیہ غزلوں میں ردیف، قافیہ، بحر، مطلع اور مقطع پایا جاتا ہے اور اقسام غزل کے لحاظ سے مسلسل اور غیر مسلسل، مردف اور غیر مردف غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اس بات کو مزید تقویت دیتے ہوئے اسمٰعیل آزاد کا یہ قول پیش کرتے ہیں:

''نعتیہ غزلیں وہ شعری کاوشات ہیں جس میں مضامین تغزل، ترنم، حسنِ سخن و بیان، تحسین و لطیف تشبیہات و استعارات کے ساتھ نعت کے روپ میں بیان کیے جائیں۔ نعتیہ غزلوں میں سلمیٰ و لیلیٰ، ساقی و میخانہ، صراحی و پیمانہ اور جام و سبو، مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اور جہاں کہیں شراب کی تعریف کی گئی ہے... میخانہ خلد بریں کی شراب ہے۔''[6]

اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب 'گلبن نعت' کی نعتیہ غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو کچھ ایسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ لگ بھگ تمام غزلوں میں مطلع اور مقطع نظر آتا ہے۔ اس مجموعہ کلام کو اردو ادب میں شاعرات کی طرف سے پہلے مطبوعہ نعتیہ مجموعے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس ضمن میں محمد جمیل احمد لکھتے ہیں:

''کسی خاتون کی طرف سے اردو نعت کا غالباً پہلا مجموعہ 'گلبن نعت' ہے جس کی مصنفہ زینت بی بی محجوب ہیں۔ یہ مجموعہ جیسا کہ انہوں نے خود ذکر کیا ہے خواب میں زیارتِ رسولؐ اکرم کے بعد پندرہ دنوں میں مکمل کیا۔ یہ مجموعہ نعت 1302ھ میں شائع ہوا۔ محجوب کا تعلق ایک دیندار گھرانے سے تھا۔ ان کی نعتوں میں تغزل کے رنگ و اسلوب کا پرتو جھلکتا ہے، گلبن نعت میں غزلیں اور کچھ قطعہ ہائے منقبت و تاریخ ہیں۔''[7]

محجوب کی تمام نعتیہ غزلوں میں تلمیحات کی کہکشاں نظر آتی ہے۔ جن میں نکیر منکر، دارالشفا، حوضِ کوثر، تصویرِ یوسف، شبِ معراج، یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، نارِ نمرود، ابراہیم، عصمتِ فاطمہ، حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، حضرت آدم، ملکِ سکندر، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت فاروق اعظم، حضرت سلیمان، روح الامین، حضرت نوح وغیرہ کی تلمیحات کا بیش بہا خزانہ ملتا ہے۔ ان تلمیحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا مذہبی مطالعہ و مشاہدہ کتنا وسیع تھا۔

اس جوان مرگ شاعرہ نے کچھ غزلیں دیگر موضوعات پر بھی لکھی تھیں مگر ان کا نمونہ دستیاب نہیں ہے۔ اس بات کا ذکر انہوں نے خود بھی کیا ہے کہ دیدارِ حضورؐ سے پہلے وہ باقاعدہ طور پر غزلیں لکھتی تھیں مگر والد کے ڈر سے چھپاتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی ڈر کے سبب انہوں نے اپنی دیگر غزلوں کو ضائع کیا ہو۔ محجوب نے اس مجموعہ کلام میں اپنی غزل گوئی، حضورؐ کے دیدار، اپنی بیماری اور اپنے

مجموعہ کلام کے حوالے سے خود ہی اہم معلومات فراہم کی ہے۔انھوں نے 'گلبن نعت' کے آخری صفحات پر اپنی مصروفیات کا ذکر یوں کیا ہے:

''... فن شاعری منصب عالی ہے۔میری طبیعت ناقص اِس منصب سے بباعث رنجوری ومعانی خالی ہے۔یہ عاجزہ تیران (تیرہ) سال کی عمری ایسی مرض مہلک مین مبتلا ہی کہ یہان جسکا ذکر تکالیف وتشریح تعب نامناسب ویجاھی (ہے)۔اگرچہ طبیعت پہلے سے غزلیات واشعار کی سبدع تہی (تھی) لاکن (لیکن) اُنکی تشہیر کرنے (کرنے سے) بباعث امتناع والد ماجد کے مجبور اور روکی رہی۔اسی اثنا میں خواب میں دیکہتی (دیکھتی) ہون کہ حضرت سید الابرار علیہ الصلوٰۃ السلام مع دیگر انبیاء نامدار مثل حضرت ادمؑ وحضرت موسےؑ وعیسیٰؑ شریف فرماہین جناب رسالتماب صلعم نی (نے) ارشاد فرمایا کہ ای مجوب کچہ (کچھ) سُنا۔ایک نعت رورو کر سنائی،حضرت سرور کائنات صلعمؐ نے محظوظ اور مبضط ہوکر مجہی (مجھے) پیار کیا۔دیدار حضرت محمدؐ کے بعد صرف نعت گوئی کی اور صرف پندرہ دن میں یہ گلدستہ مکمل ہوا ہے۔''[8]

ان کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے نعتیہ غزلوں کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات پر بھی غزلیں موزوں کی ہیں اور حضرت محمدؐ کا دیدار کرنے والی خاتون جھوٹ بولنے کی مرتکب نہیں ہوسکتی ہے۔

یوں تو غزل کے موضوعات کی قید نہیں ہوتی ہے اور نعت یعنی حضرت محمدؐ کی تعریف بھی غزل کا ایک موضوع مانا جاتا ہے۔لیکن جب ہم نعتیہ غزلوں کا موضوعاتی مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں بھی موضوعات کی بہتات نظر آتی ہے اور ماہرین یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ نعتیہ غزلوں کے مضامین کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ مجوب کی نعتیہ غزلوں میں سراپائے حضرت محمدؐ،صفات واوصافِ حضورؐ، اہلِ بیت رسولؐ اور صحابہ رسولؐ،ذاتی خیر وبرکت اور اجتماعی خیر برکت کے لیے وسالت،اتحادِ اُمت،حضورؐ کا دیگر پیغمبرانِ اسلام کے ساتھ موازنہ، صنائع لفظی ومعنوی،تلمیحات وغیرہ بے شمار موضوعات ملتے ہیں۔ان کی نعتیہ غزلوں سے مطلع اور مقطع کی برجستگی،خوبصورتی اور آہنگ وآورد ملاحظہ فرمائیں۔

دین ودنیا کا شہنشاہ احمد مختار ہے
ہوں تصدیق نام پراُن کے وہ میرا یار ہے
مدینہ میں مجھ کو بُلا یا محمدؐ
مجھے چاند سا مُنہ دکھا یا محمدؐ
فلک تو جانتا ہوگا کہ یہ مجوب کے سر ہے
حبیب حق محمدؐ مصطفےٰ میرا پیمبر ہے
میرے شعر وسخن کو کر عطا ایسی قبولیت
کہے عالم کہ ہو مجوب برخوردار یا اللہ
سُنے کون مجوب کی التجا کو
تو بن کر میرا مُشکل کشا یا محمدؐ
بجالاشکرانے مجوب حضرت کی تصدیق سے
سراسر رشک سحر سامری گفتار ہے میرا[9]

ان کی نعتیہ غزلوں کا لسانیاتی مطالعہ کرنے کے بعد کچھ ایسی باتیں سامنے آتی ہے کہ وہ دو الفاظ کو جوڑ کر لکھتی ہیں جیسے مجھکو (مجھ کو)،غمخوار (غم خوار)،کرنیسے (کرنے سے) وغیرہ اور وہ 'ھ' کی جگہ 'ہ' اور 'ہ' کی جگہ 'ھ' کا استعمال کرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں املا کی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ہوسکتا ہے پنجاب میں رہنے کے سبب ان کی اردو زبان پر پنجابی کے اثرات پڑے ہوں اور ویسے بھی اس زمانے کی زبان میں ایسا اکثر دیکھا گیا ہے۔ان کی نعتیہ غزلوں میں 'ں' نون غنہ کی جگہ اکثر 'ن' کا استعمال بھی ملتا ہے۔ لسانیات، ساختیات اور پس ساختیات کی رو سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے۔ان کے کلام کو آسانی سے پڑھا جاتا ہے لیکن کچھ الفاظ کی شکلیں بدلی سی نظر آتی ہیں۔

حالانکہ ان کے کلام میں سہل ممتنع کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ان کے چند عام فہم اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مین تمھاری شرابِ اُلفت سے
مست و سرشار ہون خبر لیجیے
وہی اپنا شفیع و رہنما ہے ہر دو عالم میں
کہ جس کا یار بوبکرؓ وعمرؓ عثمانؓ وحیدرؓ ہے
تیرا وصفِ مُقدس ہے الم نشرح لک صدرک
تیری مدح وثنا میں سورہ والنجم وکوثر ہے
اے میرے یوسف زلیخا کی طرح تیرے لیے
میں کھڑی ہوں نقدِ جان لے کر سرِ بازار آ

یوں مجوب کی نعتیہ غزلوں کا فنی وموضوعاتی،لسانی ونسائی مطالعہ کرنے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالنے کے بعد کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان کو ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ نہ مانا جائے اور انتساب ہونے کے باوجود بھی اگر کوئی نہیں مانتا ہے کہ مجوب ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ ہے،تو ایک نئی صورت بھی نکلتی ہے کہ مجوب اور کلثوم کے درمیانی دور میں ریاست کی کچھ پنڈت غزل گو شاعرات کا ذکر ملتا ہے۔

ان میں پہلا نام 1852 میں کشمیری پنڈت بشمبھر ناتھ رینہ کے گھر دہلی میں پیدا ہونے والی ان کی بیٹی پران کشوری کچلو کا آتا ہے۔اگرچہ وہ انیسویں صدی کی شاعرہ تھیں لیکن ان کے کلام میں دکنی اردو کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ان کی غزلوں میں مطلع،مقطع،ردیف،قافیہ،بحر اور موضوع کے لحاظ سے کسی قسم کی کوئی خامی نظر نہیں آتی ہے۔گویا وہ غزل کے عروضی نظام اور غزل کے اجزائے ترکیبی سے بخوبی واقف تھیں۔ انھوں نے مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں۔ملاحظہ فرمائیں ان کی غزل سے چند اشعار

اس جہاں میں کوئی بھی اپنا نہیں غمخوار ہے
جھوٹی مایا موہ میں پھنسنا یونہی بیکار ہے
تن سے من سے جان سے دل سے تمھاری یاد ہے
تو مرا سوامی نرنجن تو ہی نرآکار ہے
غور سے دیکھا جو میں نے ہر جگہ پایا تجھے
پھر نہ کیوں اُمید رکھوں تو ہی تارن ہار ہے
پران ہے چرنوں کی داسی عرض اُس کی ہے یہی
مجھ کو بھگتی اور مکتی دے تو بیڑا پار ہے[10]

ایسی پُر اثر اور پُر کیف،ترنم اور تہذیب میں ڈوبی غزلوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ان کے بعد 1898 میں الہ آباد میں جنمی شری متی سوشیلا تکو،عرف برج کشوری کا نام آتا ہے۔سوشیلا کی زبان صاف،سلیس اور شستہ تھی۔ان کے کلام میں عام فہم الفاظ ملتے ہیں۔اگرچہ وہ ہندی زبان سے بھی واقفیت رکھتی تھیں لیکن ان کے اردو کلام میں بہت کم ہندی الفاظ ملتے ہیں۔ان کے کلام سے چند عام فہم اور سلیس اردو زبان کے اشعار پیش کرتے ہیں۔

یہ فصاحت،یہ بلاغت،یہ سلاست آپ کی
اس پہ سونے پر سہاگا اکبرآبادی زباں
چشم بددور ہیں دور، مطلع مطلع انوار ہے
جوہر پاکیزگی ہے دونوں مصرعوں سے عیاں
آپ کے دم سے شجاعت میں ہے دم باقی ضرور
ہم نہ ہوئیں گو تو مٹ جاتا محبت کا نشاں[11]

یوں پران کشوری اور برج کشوری کو بھی ریاست کی پہلی غزل گو شاعرہ کہا جاسکتا ہے۔اگر نعتیہ غزلوں کی وجہ سے مجوب کو پہلی غزل گو شاعرہ کی دوڑ سے الگ کیا جائے تو پھر بھی کلثوم سے پہلے ان دونوں میں سے ایک کو بلکہ پران کشوری کو جموں وکشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ کا شرف حاصل ہوتا ہے۔پروفیسر شکیل الرحمان نے ریاست کی ان تینوں شاعرات کو چھوڑ کر کس بنیاد پر شہزادی کلثوم کو پہلی غزل گو شاعرہ قرار دیا ہے۔ہوسکتا ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمان صاحب کے دور میں ان تینوں کے بارے میں کوئی مواد اور معلومات دستیاب ہی نہ ہو۔'گلبن نعت' اور

'بہار کشمیر' نامی کتابیں کچھ سال پہلے ہی دستیاب ہوئی ہیں اور ایسا ممکن ہے کہ شکیل صاحب نے اسی وجہ سے ان تینوں کو نظر انداز کر کے شہزادی کلثوم کو پہلی غزل گو شاعرہ قرار دیا ہو۔ اس صورت میں مزید دو تین باتیں ہوسکتی ہیں پہلا محجوب کی نعتیہ غزلوں کو وہ غزلیں نہیں مانتے ہوں گے، دوم کشمیری پنڈتائن کو وہ کشمیری نہیں مانتے ہوں گے اور سوم ان تینوں شاعرات کی ولادت، پرورش اور موت کشمیر کے باہر ہوئی ہے۔ محجوب پنجاب میں، پران کشوری دہلی میں اور برج کشوری الہ آباد میں سکونت پذیر تھیں لیکن ایک بات صاف ہے کہ جس طرح دیگر موضوعات پر لکھی جانے والی غزلیں، غزل ہیں، ٹھیک اسی طرح نعتیہ غزلیں بھی غزل ہیں اور بہترین غزلیں ہیں۔ دوم جو حیثیت جموں وکشمیر میں رہنے والی ہندو اور مسلم شاعرات کو دی جاتی ہیں وہی رتبہ واعزاز اُن کشمیری پنڈتوں اور پنڈتائن کو بھی دیا جانا چاہیے۔ جو کسی وجہ سے مختلف اوقات میں کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

شہزادی کلثوم کی ولادت 1928 میں ہوئی تھی اور محض اکیس سال کی عمر میں 1949 میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ اور پروفیسر شکیل الرحمان کے مطابق کلثوم نے صرف پانچ سال تک شاعری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو 'ایک اشارہ، ایک ادا اور ایک پیکر' کا نام دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام فنی وفکری لوازمات نظر آتے ہیں جن کا ایک کامیاب غزل گو سے توقع کی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں الہام، فلسفہ، آورد اور تصوف کا احساس ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی درد وکرب، موت، تقدیر، قسمت، پریشانی، بے بسی، عشق وعاشقی پر دل کھول کر غزلیں موزوں کی ہیں۔ ان کے یہاں صنائع بدائع کا ایک سمندر رقص کرتا نظر آرہا ہے۔ انھوں نے جس کثرت سے کوہِ طور اور حضرت موسیٰ کی تلمیحات استعمال کی ہیں، ریاست کے کسی بھی غزل گو شاعر کے یہاں ایسا کارنامہ نہیں ملتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں جہاں سیدہ اختر کا کہنا ہے کہ 'ان کے کلام میں حال بہت زیادہ اور کال بہت کم ملتا ہے'۔[12] وہیں پروفیسر سیدہ جعفر کا کہنا ہے کہ 'ان کی شاعری کا زمانہ بہت مختصر ہے اور اس عرصے میں زندگی، شاعری اور موت کی منزلیں طے ہو گئیں'۔[13] محترمہ بلقیس زیدہ نے ان کی غزل گوئی کے حوالے سے لکھا ہے:

''غزل میں اُن کا انداز بڑا نکھرا نکھرا ہے۔ زبان کے معاملے میں وہ بیحد سادگی پسند ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کی غزل اُن کے اپنے مسائل کی ترجمان ہے۔ انھوں نے شعر کہا ہے مگر دل کی زبان سے۔ فکر کی ہے مگر حقیقی بصیرت کی روشنی میں۔'' [14]

کلثوم ایک خوش فکر اور خوش گو شاعرہ تھیں اور انھوں نے تصوف کے مسائل کو بھی اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں فکر وفن کی بلندی، جذبے کی شدت، اظہار کا جوش، افکار واحساسات میں پختگی، تخیل کی بلندی، احساس کی پاکیزگی، شوکتِ الفاظ، الفاظ کی خوبصورت نشست اور سادہ وسہل زبان ملتی ہے۔

انھوں نے جتنا کم کلام یادگار چھوڑا ہے اس سے کہیں زیادہ مشاہیر ادب نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر گلزار احمد وانی کو ان کی شاعری میں سودا، اقبال اور فیض کی سی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ انھوں نے میر، آتش، غالب جیسے بڑے شعرا کے تتبع میں زبردست قسم کے اشعار موزوں کیے ہیں۔ سودا اور آتش کی غزلوں کی زمین میں لکھے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جان دیدی یہ کہہ کے عاشق نے
تو نے دی ہے، تیری امانت ہے
آج کل کچھ ایسا برگشتہ مقدر ہو گیا
لعل چھوتے ہی مری قسمت سے پتھر ہو گیا

ڈاکٹر فرید پربتی کو ان کی غزلوں میں فنی ارتقا، بندش کی چستی، زبان اور محاورے کا برمحل استعمال ملتا ہے۔[15]

ان کی غزلوں سے مختلف موضوعات پر ایک ایک شعر پیش کرتے ہیں۔

جب اہلِ دل کو عشق کا عرفان ہو گیا
حسنِ فریب کار پشیمان ہو گیا
کہہ گیا دو ہچکیوں میں عمر بھر کی داستان
مرنے والے واہ! کیا کہنا تری تقریر کا
کرو تم لاکھ تدبیریں تو کیا ہے
وہی ہوگا جو قسمت کا لکھا ہے
طور سے پوچھ اہلِ طور سے پوچھ
طالبِ دید کی سزا کیا ہے؟

یہ بات سچ ہے کہ شہزادی کلثوم کی غزلوں میں محجوب، پران کشوری اور برج کشوری کے مقابلے میں موضوع کا تنوع، زبان وبیان کی لطافت اور دیگر معاملات میں فوقیت نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں میں متنوع موضوعات ملتے ہیں اور ان کی زبان خالص اردو زبان نظر آتی ہے۔ انھوں نے باقاعدگی سے غزل کے فن کو سمجھا اور غزل کے مختلف ومتنوع موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس بنیاد پر ان کو پہلی باقاعدہ غزل گو شاعرہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ پہلی غزل گو شاعرہ محجوب ہی ہے۔

اس بحث ومباحث کو پیش کرنے کا خاص مقصد یہی ہے کہ جموں وکشمیر میں لل دید کو پہلی شاعرہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور زینب بی بی محجوب کو اردو کی پہلی غزل گو شاعرہ اور نعت گو شاعرہ کا شرف حاصل ہے۔ اور شہزادی کلثوم اردو کی پہلی باقاعدہ غزل گو شاعرہ کہلانے کی حق دار ہیں۔ ان چاروں شاعرات میں تمام کا آبائی وطن کشمیر ہے لیکن چاروں کی ولادت اور پرورش کشمیر سے باہر ہوئی ہے۔ بہر حال یہ بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ زینب بی بی محجوب نے ہی جموں وکشمیر میں اردو غزل کا آغاز اپنی نعتیہ غزلوں سے کیا ہے۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں زینب بی بی محجوب سے پہلے دور کی کسی دوسری شاعرہ کا سراغ مل جائے یا پھر محجوب ہی اس منصب پر فائز رہیں۔

حواشی:

1 لل دید: کشمیر کی مشہور ومعروف شاعرہ، جے لال کول، ترجمہ موتی لال ساقی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1985، ص 16
2 کشمیری پر اُردو کے اثرات، ڈاکٹر نذیر آزاد، 2012، ص 25
3 یادگار کلثوم، ترتیب اکبر جے پوری، ناشر نامعلوم، 1962، ص: 16
4 گلبن نعت، زینب بی بی محجوب، ماس ہند امرتسر اہتمام شیخ نور احمد، 1297ھ، ص: 69
5 کتابی سلسلہ جہان حمد ونعت، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، نعت اکادمی سرینگر، کشمیر، مئی۔جون 2019، ص 242-241)
6 اردو شاعری میں نعت، (جلد دوم)، ابتداء سے محسن تک، ڈاکٹر اسمٰعیل آزاد فتح پوری، مطبع نسیم بک ڈپو لکھنو، 1992، ص 296
7 اردو میں نعت گوئی، ڈاکٹر ریاض مجید، اقبال اکادمی پاکستان، 1990، ص 577
8 گلبن نعت، زینب بی بی محجوب، ماس ہند امرتسر اہتمام شیخ نور احمد، 1297ھ، ص 49
9 ایضاً، ص 4،
10 بہار گلشن کشمیر، جلد سوم، پنڈت برج کرشن کول اور پنڈت جگ موہن ناتھ رینہ، انڈین پریس لمیٹیڈ، الہ آباد، 1932، ص 868
11 کشمیر میں اردو، حصہ سوم، پروفیسر عبدالقادر سروری، کلچرل اکیڈمی، سرینگر، ص: 222
12 یادگار کلثوم، مرتب اکبر جے پوری، 1962، ص 22
13 ایضاً، ص 23
14 ایضاً، ص 8-7
15 سالانہ تحقیقی مجلہ ترسیل، نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی، شمارہ 9، 2010، ص 135

■

Mohd Yaseen Ganie
Pulwama Kashmir
Post Office:Tiken Batpora - 192306
Mob.:7006108572
Email:myganie123@gmail.com

صدی شخصیت

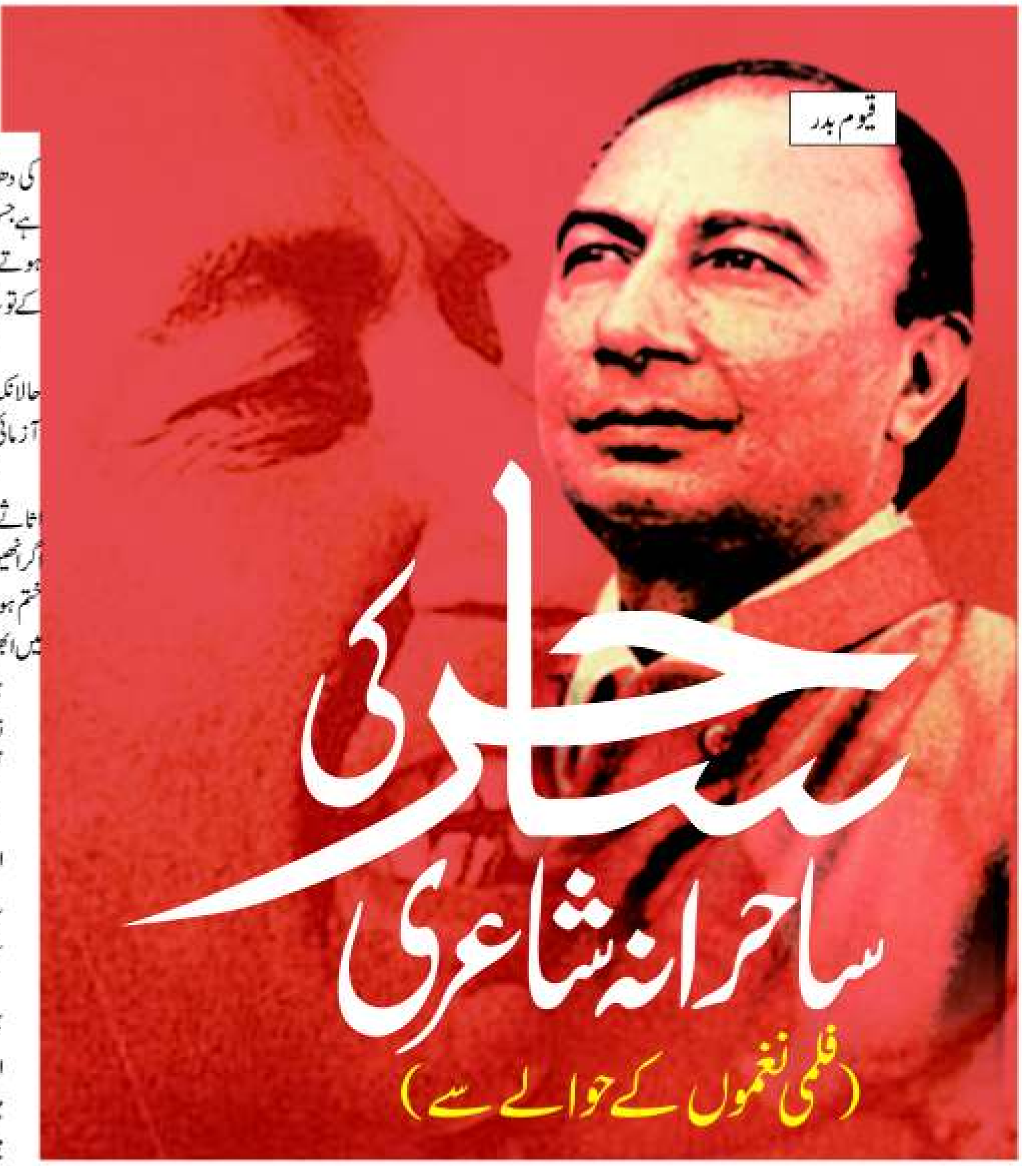

قیوم بدر

ساحر کی ساحرانہ شاعری
(فلمی نغموں کے حوالے سے)

ساحر لدھیانوی کا اصل نام عبدالحی تھا۔ ان کی پیدائش 8 مارچ 1921 لدھیانہ پنجاب کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ہوئی۔

ساحر بچپن سے ہی حساس طبیعت کے مالک تھے جس کے سبب نہ صرف باپ بلکہ زمینداری اور سرمایہ داری سے نفرت ہوگئی سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے پوری طرح بائیں بازو کے حامل ہوگئے علاوہ ازیں پے بہ پے محبت میں ناکامی نے انھیں پوری طرح باغی بنا دیا لہٰذا دونوں کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر شاعری کے حوالے سے منظر عام پر لائے یعنی آپ بیتی کو جگ بیتی کی شکل عطا کی۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کہا ہے کہ ''جب آپ بیتی جگ بیتی بن جائے اور غمِ حیات غمِ کائنات میں تبدیل ہوجائے تو شاعری معتبر ہوجاتی ہے''۔ ......اور یہ معتبریت اردو شاعری میں ساحر لدھیانوی کو حاصل ہے لہٰذا خود کہا ہے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر نے انسانی نفسیات خصوصاً نوجوانوں کی دلی کیفیات اور جذبات کی جتنی سچی عکاسی کی ہے دوسری جگہ کم دیکھنے کو ملتی ہے اس کا ثبوت ساحر کا پہلا شعری مجموعہ 'تلخیاں' کے درجنوں ایڈیشن ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ساحر کی شاعری جذبات کی شاعری ہے۔ ساحر کا شمار بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ ساحر کو اللہ نے خلاقانہ ذہن عطا کیا تھا وہ باغی تھا سماج کے مروجہ نظام کا، دنیا کا، لیکن اس کے سینے میں ایک گداز دل تھا لہٰذا جب حسن و عشق کی باتیں کرتا تو ایسے لطیف احساسات جگا دیتا ہے کہ وہاں پہنچنا دوسرے شعرا کے لیے محال ہے۔ ایک بار ساحر کے ہمعصر سردار جعفری نے طنزاً کہا کہ ''ساحر تم کالج کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے شاعر ہو''

ساحر نے برجستہ جواب دیا......سردار صاحب! کالج اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر زمانے میں رہیں گے اس لیے میری شاعری مر نہیں سکتی۔

اور یہ حقیقت بھی ہے ساحر کی شاعری ادب کے حوالے سے ہو یا فلم کے حوالے سے آج کروڑوں دلوں کی دھڑکن ہے آج کی نسل کا پرنٹ میڈیا سے تعلق کم ہی ہے، جس کے سبب کل کے بڑے نام بھی ذہن سے غائب ہوتے جا رہے ہیں لیکن پرنٹ کے علاوہ الیکٹرونک میڈیا کے توسط سے ساحر لدھیانوی آج بھی زندہ ہے۔

فلم میں لکھنا نہ جانے کیوں لوگ معیوب سمجھتے ہیں حالانکہ اپنے دور کے بیشتر مقبول شعرا نے فلموں میں طبع آزمائی کی۔

فلم کے ہزاروں اشعار ایسے ہیں جو بلا شبہ ادب کے اثاثے ہیں ان میں ساحر کے اشعار کی تعداد خاطر خواہ ہے۔ اگر انھیں یکجا کیا جائے یقیناً فلمی اور ادبی شاعروں کی تخصیص ختم ہوجائے گی اور ایک مثبت اور اعلیٰ شاعری کا تصور ذہن میں ابھرے گا مثال کے لیے یہ چند اشعار حاضر ہیں۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
تعارف روگ بن جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہیں ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتہ یاد آیا

ہم پھول ہیں اوروں کے لیے لائے ہیں خوشبو
اپنے لیے لے دے کے اک داغ ملا ہے
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا

ساحر کے یہ گیت تو مدھر سنگیت اور پرسوز آواز کے ساتھ ہمارے جذبات میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔

بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارہ لے کر دل کا یکتارا

پل دو پل کا ساتھ ہمارا پل دو پل کی یاری
آج رکے تو کل کرنی ہے چلنے کی تیاری

دھن دولت کے پیچھے کیوں ہے یہ دنیا دیوانی
یہاں کی دولت یہیں رہے گی ساتھ نہیں یہ جانی

لیکن حیرت ہے سماج کا باغی تیشہ بردار شاعر جب حسن کی تعریف کرنے پر آتا ہے تو نہ جانے کتنوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

آنکھ ایسی کہ کنول تم سے نشانی مانگے
زلف ایسی کہ گھٹا شرم سے پانی مانگے
شعر کا حسن ہو نغموں کی جوانی تم ہو

یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا
اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا
ویسے تو تمھیں نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا

ہائے وہ ریشمی زلفوں سے برستا پانی
پھول سے گال پہ رکنے کو ترستا پانی

دل میں طوفان اٹھائے ہوئے جذبات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

میں نے خوابوں میں برسوں تراشا جسے
تم وہی سنگ مرمر کی تصویر ہو
تم نہ سمجھو تمہارا مقدر ہوں میں
میں سمجھتا ہوں تم میری تقدیر ہو

دور رہ کر نہ کرو بات قریب آجاؤ
یاد رہ جائے گی یہ برسات قریب آجاؤ
ایک مدت سے تمنا تھی تجھے چھونے کی
آج بس میں نہیں جذبات قریب آجاؤ

انھیں فلمی شاعری کہہ کر مسترد کرنا کوتاہ ذہنی کے مترادف ہے کہ ان میں شاعری کے تمام اوصاف مضمر ہیں۔

ساحر کی غزلوں، نظموں حتیٰ کہ فلمی نغموں میں تغزل کے علاوہ نادر تشبیہات، استعارات، جمالیاتی کیف وسرور روح کو سرشار کردیتی ہے۔ فلم کے حوالے سے یہ اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں جو موسیقی کے حوالے سے آواز میں ڈھل کر کانوں کے توسط سے دل میں اتر جاتے ہیں چنانچہ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ ساحر اپنے کلام کی تہہ داری اور معنویت کے اعتبار سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کے کلام کو کسی خانے میں بانٹ کر ان کی قدر گھٹانا ممکن نہیں یہ نغمے اس کا زندہ ثبوت ہیں۔

ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی
ہوتی ہے دلبروں کی عنایت کبھی کبھی

اپنوں پہ ستم غیروں پہ کرم اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر
رہنے دے ابھی تھوڑا سا بھرم اے جانِ وفا ظلم نہ کر
غیروں کے تھرکتے شانوں پر یہ ہاتھ گوارا کیسے کریں
ہر بات گوارا ہے لیکن یہ بات گوارا کیسے کریں

ندی پہاڑ جنگل چاند ستارے گھٹا بارش یہ سب قدرت کے عطیات ہیں ایک شاعر کا ان سے متاثر ہونا فطری ہے۔ ساحر نے فلم کی سچویشن کے حوالے سے ایک عاشق کی زبانی جو بات کہی ہے ایک حساس انسان کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے کافی ہیں ان اشعار میں شاعری کے تمام اوصاف شامل ہیں جنھیں سن کر فرحت کا احساس ہوتا ہے۔

یہ پربتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں
ایسے میں کیوں نہ چھیڑ دیں دلوں کی داستاں

ان اشعار میں ماحول کی دلکش منظر کشی سانسوں میں حرارت پیدا کردیتی ہے۔

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا
سرمئی اجالا ہے چمپئی اندھیرا ہے
ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے

عام طور سے 'انتظار' سے مراد کرب اور گھٹن سے لیا جاتا ہے۔ کم از کم اردو شاعری میں محبوب کے حوالے سے ذہن میں یہی تصور ابھرتا ہے لیکن ساحر 'انتظار' کو ایک نیا مفہوم عطا کیا ہے۔

ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے
یہ انتظار بھی اک امتحان ہوتا ہے
اسی سے عشق کا شعلہ جوان ہوتا ہے
یہ انتظار سلامت ہو اور تو آئے

یہ اشعار زندگی سے مایوس لوگوں خصوصاً نوجوانوں میں جوش اور نئی امنگ پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا
بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا
بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا

ساحر کے سینے میں ایک حساس دل تھا لیکن پے در پے محبت کے ضمن میں کچھ ایسے حادثات ہوئے کہ انھیں کہنا پڑا کہ

کچھ اتنے دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

تاہم رہ رہ کے یہ احساسات ساحر کے ذہن و دل پر کچوکے لگاتے رہے جس کا اظہار انھوں نے فلم کے توسط سے بہت مؤثر اور شائستگی سے کیا ہے۔

تنہا نہ کٹ سکیں گے جوانی کے راستے
پیش آئے گی کسی کی ضرورت کبھی کبھی

مسلسل اس طرح کے حادثات ایک آدمی کو متنفر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن ساحر نہ ہی ٹوٹ سکا اور نہ ہی گوشہ نشینی اختیار کی اور نہ ہی عورت کو ظالم جابر بے وفا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی بلکہ نہ صرف عورت کی اہمیت کو تسلیم کیا ان کے تئیں احترام نیز عورتوں کی ناقدری اور استحصال پر صدائے احتجاج بھی بلند کیا اور مردوں کو غیرت بھی دلائی۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا

ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں

عورت سنسار کی قسمت ہے پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے

بقول فہمیدہ ریاض ''شاعری کوئی شغل نہیں روح اور قلب کی حقیقت اور گہرے مشاہدے کا نام ہے۔''

ساحر کے یہ اشعار اس کا ثبوت ہیں۔

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
کس لیے جیتے ہیں کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا
کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

ساحر لدھیانوی کی بنیاد اردو شاعری ہی تھی اردو شاعری کے رموز و کنایات سے واقفیت بھی تھی تاہم ہندی شاعری بھی اس کی دسترس سے باہر نہ تھی اردو کے الفاظ کا ادراک تو تھا ہی ہندی کے الفاظ کی پرکھ بھی تھی ادبی خصوصاً فلمی نغموں میں جہاں سیکڑوں خالص اردو اشعار دیے وہیں فلم کے حوالے سے ہندی شاعری کا نمونہ بھی پیش کیا لیکن فلمی گیتوں میں ایسے گیتوں کی تعداد زیادہ ہے جن میں اردو کے ساتھ ہندی کے سبک الفاظ بھی شامل ہیں جس سے نہ صرف گیتوں کے حسن میں اضافہ ہوا ہے بلکہ معنویت بھی دوبالا ہوگئی ہے۔

مذہب کے ٹھیکیداروں کی سوچ کا دائرہ محدود ہوتا ہے جبکہ شاعروں کی فکر میں وسعت ہوتی ہے۔ مذہب خواہ کوئی بھی ہو اس کا مقصد انسانیت کی بقا ہے لیکن ہم اپنے مذہب اپنے دھرم کو برتر ثابت کرنے کی خاطر جنگ و جدل سے بھی گریز نہیں کرتے نیز دلوں میں نفرت کے بیج بونے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ ساحر نے اس حقیقت کو ایک بچے کے حوالے سے یوں واضح کیا ہے۔

مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اسے ہندو یا مسلمان بنایا
نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انساں کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
تو امن اور صلح کا ارمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

ساحر لدھیانوی نے فلم سچویشن کے تقاضے کے مطابق قومی یکجہتی، ملک کی سلامتی، بیٹی کی رخصتی، بچے کی سالگرہ کے علاوہ دوسرے بہت سے موضوعات پر بھی گیت لکھے ہیں حد تو یہ ہے کہ دو ایک فلموں میں مزاحیہ گیت لکھ کر اپنی خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے نیز شاعری کے مروجہ قوانین کی مکمل پاسداری بھی کی ہے۔ پیسے کی خاطر معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا جس کے سبب ساحر کے بیشتر اشعار یقیناً ادب کا اثاثہ ہیں۔ لہٰذا انھیں فلمی شاعری کہنا حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہیں۔

■

Qayyum Badar C/o Dhulhan Gul
P.O.: Jagatdal - 743125
North 24 Parganas (W.B)
Mob.:8100107278

حنیف کیفی

کوثر مظہری

پروفیسر حنیف کیفی (محمد حنیف قریشی) 8 ستمبر 1934 کو اس دنیا میں تشریف لائے اور 27 جنوری 2021 کو صبح ساڑھے دس بجے (ہولی فیملی اسپتال، دہلی) ہم سے رخصت ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

یہ نظامِ الٰہی ہے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے ایک دن ملکِ عدم کی طرف مراجعت بہر حال کرنی ہے۔

میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی پی ایچ ڈی کی غرض سے 1993 میں آیا تھا۔ پروفیسر حنیف کیفی کی صدارت کا وہ آخری سال تھا۔ مشہور ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر بھی اس وقت شعبۂ اردو کو تفویض کردہ خان عبدالغفار خاں چیئر سے وابستہ تھیں۔ بعد میں اسی چیئر سے مشہور ادیب و نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی بھی وابستہ رہے۔ خیر، میرا رجسٹریشن ہوگیا، میں شعبۂ اردو سے ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے باضابطہ وابستہ ہوگیا۔ مجھے یو جی سی سے جونیئر فیلوشپ (JRF) جاری ہوگئی۔ پروفیسر شمیم حنفی میرے مقالے کے نگراں مقرر ہوئے۔

درمیان میں 1996 میں پی ایچ ڈی ادھورا چھوڑ کر میں نے دربھنگہ میں ایک ہائی اسکول (بلور، منی گاچھی) جوائن کرلیا۔ پھر بہ وجوہ 1997 میں واپس دہلی آگیا۔ کیفی صاحب کو دیکھتا کہ وہ شعبۂ اردو کے سارے پروگرام میں نہایت ہی پابندی اور سنجیدگی سے شرکت فرماتے اور اسی طرح پابندی کے ساتھ کلاس لیتے۔ میں نے انھیں اکثر شور شرابے اور فلمی مذاق کی بے تکلف محفلوں سے تقریباً کنارہ کشی کرتے ہوئے ہی دیکھا۔ ممکن ہے کہ کچھ ان کے بے حد بے تکلف دوست ہوں جن سے پُرمذاق و پُرمزاح لمحے بانٹتے ہوں حالاں کہ ان کے شعبے کے کئی معاصر ساتھیوں سے بھی ان کے بارے میں کچھ یہی تاثرات سنے ہیں۔ ان کے بارے میں صغریٰ مہدی صاحبہ لکھتی ہیں:

"کیفی صاحب جب شعبے میں تھے تب بھی بس کلاسیں لینے آتے۔ شعبے کی تقریبوں میں شرکت کرتے، جو کام سپرد ہوتا وہ کرتے مگر زیادہ وقت بیٹھ کر گپیں کرنا انھیں پسند نہیں۔"

(بحوالہ حنیف کیف: ذات اور جہات، 2011، ص 50)

شخصیت اور سیرت کی تفہیم و تعبیر کے لیے اتنی باتیں بھی کافی ہوسکتی ہیں۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ ان کی شخصیت کی ایک جہت یہ بھی رہی ہے کہ وہ کوئی بھی علمی کام وقت نظری اور شد و مد کے ساتھ کرتے تھے، لیکن اگر طبیعت آمادہ نہیں تو پھر مجال ہے کہ کوئی ان سے کچھ لکھوالے۔ لکچرر تو وہ 1972 ہی میں ہوگئے تھے لیکن انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ دوران ملازمت ہی (1980) پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔ پروفیسر نارنگ نے کیفی صاحب کے بارے میں لکھا ہے:

"کیفی صاحب بلا کے کاہل اور ست قلم کار ہیں، تاہم جب لکھنے پر آتے ہیں تو جی لگا کر اور ایسا ٹھوک بجا کر لکھتے ہیں کہ کوئی حرف نہیں رکھ سکتا..." (ایضاً، ص 42)

کیفی صاحب نے گرچہ کم لکھا مگر حقیقت یہی ہے کہ ان کی کتابوں، ان کے مضامین اور ان کے تبصروں میں ایک طرح کی پختگی اور صلابت نظر آتی ہے۔ انھوں نے ایم اے کے لیے اردو میں سانٹ نگاری پر مقالہ تحریر کیا تھا، لیکن اس کا معیار کسی بھی پی ایچ ڈی کے مقالے سے کم نہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی کتاب 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' کے بارے میں یہ بات بڑے ہی وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس موضوع پر برصغیر میں اب تک اس سے بہتر اور معیاری کام منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ آل احمد سرور نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

"حنیف کیفی کا یہ علمی و ادبی کام اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمارے پڑھنے والوں کو نظم معرا اور آزاد نظم کی خصوصیات اور امکانات کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔"

پروفیسر گیان چند جین نے تو یہ تک کہا تھا کہ یہ مقالہ ڈی لٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آل احمد سرور اور گیان چند جین یا گوپی چند نارنگ — یہ سب اردو کی وہ مقتدر شخصیتیں ہیں جن کا ایک ایک لفظ سند کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا، کیفی صاحب کی تحقیقی و تنقیدی نگارشات کے حوالے سے مذکورہ بالا عمائدین نقد و ادب کی جو آرا ہیں ان سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کیفی صاحب ایک عمدہ اور بلند پایہ محقق اور نقاد تھے۔ البتہ ان کی کم آمیزی اور ان کے کم لکھنے کے سبب عام شائقین ادب ان کی نگارشات (نثری و شعری دونوں) تک کما حقہ نہیں پہنچ سکے لیکن اردو ادب کا سنجیدہ طبقہ ان کی تحریروں سے واقف بھی ہے اور ان سے استفادہ بھی کرتا ہے۔ جہاں تک ان کی کتاب 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' کا سوال ہے تو یہ کتاب اپنے موضوع پر حوالے کی واحد اہم اور معیاری کتاب ہے۔ اس کتاب میں تحقیقی اعتبار سے بھی کئی طرح کے رائج تسامحات اور غلط فہمیوں کا ازالہ ملتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں اسٹنزا فارم کی ابتدا نظم طباطبائی کی نظم 'گورِ غریباں' سے ہوئی جو کہ ٹامس گرے کی نظم Elegy Written in a Country Churchyard کا منظوم ترجمہ ہے۔ کیفی صاحب نے اپنی تحقیق میں یہ واضح کیا ہے کہ:

"یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں اسٹنزا فارم 'اب اب' کی ابتدا برج موہن دتاتریہ کیفی کی نظم 'ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جبلی پر' سے ہوئی اور اس سلسلے میں نظم طباطبائی کی اولیت کا خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔"

دتاتریہ کیفی کی نظم 1887 کی ہے جب کہ نظم طباطبائی نے ٹامس گرے کی نظم کا ترجمہ 1897 میں کیا تھا۔ اسی طرح اردو میں سانیٹ کے حوالے سے بھی انھوں نے کئی نوع کے تحقیقی انکشافات کیے ہیں۔ ان کے علمی و تحقیقی شغف اور تنقیدی شعور نے شعر و ادب کی بچی تفہیم و تعبیر کے دروازے کھولے ہیں۔ کیفی صاحب کو انگریزی ادب سے بھی خاصا شغف رہا تھا۔ وہ انگریزی کے استاد رہ چکے تھے۔ یوں بھی ان کی کتاب 'اردو میں سانٹ' یا 'نظم معرا اور آزاد نظم' دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی زبان و ادب سے بخوبی واقف تھے اور ذہنی ہم آہنگی بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے انگریزی میں 9 مضامین لکھے تھے جو ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع ہونے والے Encyclopedia of Indian Literature میں شامل

ہیں۔ اسی طرح ان کی کتابوں میں ان کے مضامین کا مجموعہ 'تنقید و توجیہ' بھی اہم ہے۔ لیکن اس کتاب کے حوالے سے کم گفتگو ہوئی۔ 'نظم معرا اور آزاد نظم' والی کتاب پر بہت کچھ لکھا گیا اور یہ کتاب مختلف دانش گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اس لیے اس کتاب سے اردو کے بیشتر اساتذہ اور طلبہ واقف ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'تنقید و توجیہ' پر تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔

'تنقید و توجیہ' میں کل بیس مضامین ہیں، جن میں ادب، شاعری اور مسائل کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ امیر خسرو کے بارے میں پروفیسر کیفی نے ان کی جامع الکمال اور کثیر الجہات شخصیت پر ان کے ہندوی کلام کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے بارے میں کئی طرح کے اختلاف ہیں۔ پروفیسر کیفی نے بڑی خوبصورتی سے ان اختلافات پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''استناد کے مسئلے اور لسانی اختلافات سے قطع نظر ایک عام قاری اور ادب کے طالب علم کے لیے خسرو کے ہندوی کلام میں خاصی دلچسپی کا سامان موجود ہے... اس میں جو ذہانت و فطانت، طباعی و صناعی اور مشاقی و قادرالکلامی پائی جاتی ہے اس کا اگر بھرپور تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی خسرو کے ہندوی کلام کے استشہاد و استناد کا پہلو نکل آئے۔'' (ص 16)

غالب کی خود تشہیری اور یگانہ: غالب شکن یا معتقد غالب بہت اہم ہیں۔ مرزا غالب کی شخصیت اور شاعری کے جتنے گوشے نکالے گئے شاید اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ ان کی شخصیت ہمیشہ دو متضاد Poles کے درمیان رہی۔ ہر ایک نے غالب کو اپنے اپنے زاویے سے دیکھا۔ یہ بات کہی جاتی ہے کہ مرزا غالب بڑے خوددار اور باضمیر تھے۔ جناب حنیف کیفی نے اس بات کی تردید کی ہے۔ 'غالب نامہ' (شیخ محمد اکرام) کے حوالے سے اپنی بات کی توثیق کرتے ہیں:

''اور جب ہم اس واقعے کو ان کے قصائد کی روشنی میں دیکھتے ہیں جن میں وہ عام مجسٹریٹوں اور معمولی متصدیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور خوش آمد و تملق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔'' (ص 74)

اوپر تو انھوں نے 'غالب نامہ' کا حوالہ دیا ہے لیکن خود بھی لکھا ہے کہ:

''وہ بزعم خود ہمیشہ دوسروں کو غلط، حقیر اور کمتر سمجھتے رہے۔ جگہ جگہ ان کا اپنی نسبی عظمت اور خاندانی شان و شوکت کا اعلان ادبی نقطۂ نظر سے غیر ضروری سا ہے۔'' (ص 75)

یہ درست ہے کہ غالب نے بحث و تمحیص یا خطوط میں جھلاہٹ کے ساتھ بقراطیت اور خودنمائی یا پھر یہ کہ ''ہم چنیں دیگرے نیست'' والی بات کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہ سب بھی انسانی نفسیات سے تعلق رکھنے والے امور ہیں۔ اگر نسبی عظمت کا اظہار غیر ادبی ہے تو اس پر گفتگو بھی اس سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ چوں کہ غالب کو اپنے تئیں عظمت اور علمی تبحر کا بخوبی احساس تھا، اس لیے تعلّی کا اظہار جا بہ جا کبھی اشعار میں کبھی گفتگو میں اور کبھی خطوط میں ہوتا رہا ہے۔ یہ بھی انسانی نفسیات کا تقاضا ہے۔ پروفیسر کیفی نے غالب کے چند فارسی اور اردو اشعار کی بنیاد پر انھیں خود کو مشتہر کرنے والا ثابت کیا ہے جو بحث طلب ہے۔

'میراجی اردو کا پہلا باغی شاعر' یہ ایک اہم اور دلچسپ مضمون ہے۔ پروفیسر کیفی نے میراجی کی جرأت مندی پر توجیہات کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میراجی کی یہ جرأت تو قابل داد ہے ہی کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ان مکروہ باتوں کے بیان کو جائز قرار دیا جو ابھی تک اردو شاعری کے لیے ممنوع تھیں۔ ان کا یہ کمال بھی قابل تعریف ہے کہ انھوں نے ایک کریہہ منظر اور ایک قبیح فعل کو اپنے استعاراتی بیان اور حرکی، بصری اور سمعی پیکروں کے ذریعے شاعری کا درجہ دے دیا۔'' (ص 164)

اس ضمن میں انھوں نے میراجی کی نظمیں لب جوئبارے، اونچا مکان، حرامی، دکھ دل کا دارو بطور مثال پیش کی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی فنی بصیرت کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون بہت ہی اہم اور معلوماتی ہو گیا ہے۔ کیفی صاحب اپنی تنقید کے لیے بجا طور پر توجیہ پیش کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

'مولوی عبدالحق: خطبات کے آئینے میں' میں مصنف نے سلیس زبان میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشکل عبارت آرائی آسان ہے جب کہ آسان اور سہل عبارت لکھنا مشکل ہے۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ادق اور مغلق لفظیات سے اپنی نثر کو بچائے رکھا۔ واضح رہے کہ پروفیسر کیفی نے یہ مضمون بابائے اردو کے خطبات کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ کیفی صاحب نے میر، اقبال، فراق وغیرہ پر بہت ہی معیاری اور مختلف جہتوں کو روشن کرنے والے مضامین لکھے ہیں۔

کیفی صاحب کے تخلیقی وجدان پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ اس لیے آئیے اب ان کی اس ادبی جہت پر روشنی ڈالی جائے۔ وہ کہتے ہیں:

خطر کسی کو ہو کیا خود ضرر رسیدہ ہوں
میں کج کلاہ نہیں ہوں انا گزیدہ ہوں

جسے اپنی ذات کا ادراک ہو اور جسے اپنی قوت فکر پر پوری طرح اعتماد ہو، وہی اس طرح کا شعر کہہ سکتا ہے۔ اس شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ مجھ سے کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ میں انا گزیدہ ہوں اور انا گزیدہ ہمیشہ اپنے لیے ہی ضرر رساں ہوتا ہے۔ پھر لفظ 'خطر' خلا میں تو وجود نہیں رکھتا۔ اس کا رشتہ بھی اس شعر میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی لفظ سے ہوگا۔ دوسرے مصرعے میں 'کج کلاہ' آیا ہے۔ گویا 'کج کلاہ' سے 'خطر' ہو سکتا ہے۔

لیکن میرا اپنا ماننا یہ ہے کہ کج کلاہی میں بھی انا گزیدگی کا عنصر ضرور ہوتا ہے۔ یہ تو سچی بات ہے کہ جو شخص اس دنیا میں اپنی 'انا' کو اپنا رہبر اور مشیر جانتا ہے، وہ ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے کیونکہ ایسا شخص سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جو لوگ مصلحت کوشی اور کاسہ لیسی سے کام لیتے ہیں وہ کامیاب و سرفراز ہوتے ہیں۔ انا پرست زندگی میں ہر موڑ پر گھاٹے کا سودا کرتا ہے۔ حنیف کیفی کی غزلوں

میں ان کے اَنا گزیدہ ہونے کی نشانیاں نظر آ جاتی ہیں۔ ان کا وجود ہمیشہ ہی دنیا اور افرادِ دنیا سے متصادم نظر آتا ہے۔

بڑھتا جاتا ہے تصادم ٹوٹتا جاتا ہوں میں
میرا عالم مختلف، ماحولِ دنیا مختلف
زمانہ مصلحت اندیش اور ہم سادہ دل کیفی
زمانے سے نبھانے کا کہاں سے اب ہنر آئے

اس تصادم میں طوفان بھی اٹھتا ہے کیونکہ فطرتِ انسانی عام فطرت سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ اَنا پرست اور اَنا گزیدہ شخص دنیا یا اہلِ دنیا سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اَنا کی فطرت میں خموشی بھی ہے اور طوفان برپا کرنے کی صلاحیت بھی۔ حنیف کیفی کی غزلوں میں اس نوع کے اشعار مل جاتے ہیں۔

ہنگامہ طلب فطرت کب چین سے بیٹھی ہے
طوفان کچھ اٹھے ہیں کچھ ہم نے اٹھائے ہیں
سچ بول کے جذبات کا رخ موڑ دیا ہے
یہ آئینہ کیسا ہے کہ دل توڑ دیا ہے

اس دنیا میں سچ بولنا ایک طرح سے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرانا ہے۔ لیکن جسے اَنا کا پاس ہوتا ہے وہ کبھی سچ کا دامن نہیں چھوڑتا۔ اس کی زندگی، اس کی شاعری، اس کی سوچ اور اس کے سارے کام اَنا کی زد پر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی دنیا طلبی میں اَنا کا خون بھی ہوتا ہے اور خودداری مجروح بھی ہوتی ہے۔ دنیا کو آئینہ دکھانے والا اَنا پرست کبھی کبھی پس وپیش کی حالت میں ہوتا ہے۔ کیفی صاحب پر بھی کبھی کبھی یہ حالت طاری ہوتی ہے۔ لیکن سچا فنکار اس کشمکش کی حالت کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔ کہتے ہیں۔

ہے دامن گیر دنیا کی طلب بھی
مجھے کیفی اَنا کا پاس بھی ہے
سر جھکانا بھی گوارا نہیں مشکل ہے یہی
سر اٹھائے ہوئے چلنا مری عادت بھی نہیں

میں نے ابھی اوپر ذکر کیا تھا کہ سچ بولنے کا مطلب ہے خود کو موردِ الزام ٹھہرانا اور دنیا سے پتھر کھانا۔ صدائے حق کی گونج کبھی کبھی دب کر رہ جاتی ہے۔ اس پس منظر میں آپ غور کریں کہ حنیف کیفی کس طرح اپنے احساس کو پیش کرتے ہیں۔

حرفِ حق حرفِ غلط کرنے کو آئے پتھر
میں نے سچ بول کے ہر دور میں کھائے پتھر
رخ موڑنے چلا تھا میں سیلابِ وقت کا
میری اَنا کی موج مجھے ہی ڈبو گئی

آج کے تناظر میں دیکھیں تو پتھر کھانے کے لیے 'حرفِ حق' بولنا ضروری نہیں۔ یوں بھی سنگباری جاری ہے اور انسانیت ہے کہ مسلسل کچلتی اور لہولہان ہوتی جا رہی ہے۔ شعورِ انسانی جیسے زنگ آلود یا فالج زدہ ہو گیا ہے لیکن خیر، کیفی صاحب نے ایک عام اصول کے پس منظر میں مذکورہ بالا شعر کہا ہے۔ ان کے نزدیک تو جیسے ان کی اپنی ذات ہی مثلِ دیوار حائل ہے، جو حدِ فاصل بھی ہے۔ ایک ہی غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مٹے جو یہ حدِ فاصل تو آپ تک پہنچیں
ہمارے بیچ میں حائل ہے ذات کی دیوار
اَنا اَنا کے مقابل ہے راہ کیسے کھلے
تعلقات میں حائل ہے بات کی دیوار

بات کی دیوار تو ایسی ہوتی ہے کہ آسانی سے منہدم نہیں ہو سکتی جیسے کہ بات کا زخم بھی آسانی سے مندمل نہیں ہوتا۔ فیض کا شعر یاد آتا ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

یہی وہ 'بات' ہے جو 'دیوار' میں متشکل ہو جاتی ہے۔ پھر تو اپنی ہی دیوار سے اپنی آواز ٹکرا کر واپس آتی ہے، اور کبھی کبھی آدمی متحیر بھی ہو جاتا ہے۔ حنیف کیفی کو یہ آواز اپنی کھوئی ہوئی اور مبہم سی آواز معلوم ہوتی ہے۔

یہ کہیں میری ہی کھوئی ہوئی آواز نہ ہو
ایک مبہم سی جو آتی ہے صدا میری طرف

جب 'اپنی ذات' اور 'وہ بات' دیوار بن جائے تو آدمی بس بھٹکتا پھرتا ہے۔ اپنی تلاش مشکل ہو جاتی ہے۔ انہوں نے پہلے بھی کہا ہے کہ "ہمارے بیچ میں حائل ہے ذات کی دیوار"، اور پھر کچھ ایسی ہی بات کہتے نظر آتے ہیں۔

قدم قدم پہ اَنا سدِّ راہ تھی کیفی
ہم اپنے سامنے دیوار بن کے خود آئے
روک دیتی ہے اَنا کیفی مرے بڑھتے قدم
کوئی کیا میں خود ہی اپنے پاؤں کی زنجیر ہوں
ہوئے اَنا کے دکھاوے سے لوگ سرافراز
اَنا نے سر کو اٹھا کر کیا ہمیں پامال

اس صورتِ حال میں دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ مابعد الطبعیاتی افکار کے حامل شعرا کا، ہو سکتا ہے، دم بحال رہتا ہو لیکن جس شاعر کی فکر ارضی اور اندازِ تخاطب ارضی ہو، اس کے لیے اپنی ذات میں یا اپنی ذات کی دیوار میں محصور ہو جانا ایک کرب آمیز اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ چشم ادراک کی فسوں کاری بھی کبھی کبھی ساتھ نہیں دیتی یا کام نہیں آتی۔ شاعری تو خود ہی فسوں کاری کا عمل ہے۔ کیفی صاحب کی شاعری کسی عصر یا کسی عہد کی تاریخ کو پیش نہیں کرتی۔ ان کے اندر ایک صلاحیت ہے کہ وہ اپنے خارجی اور داخلی احساسات وعوامل کو ہم آمیز کر کے اپنے تخلیقی وجدان کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس پر شعری کائنات اپنی اساس قائم کرتی ہے۔ ان کا لہجہ بھی پُراثر اور غیر معروضی ہوتا ہے۔ "غیر معروضی" پر، ہو سکتا ہے، کچھ لوگ چونک پڑیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ جہاں تحقیق وتنقید میں معروضیت اپنی اہمیت رکھتی ہے اور اس کا مثبت اثر ہوتا ہے، وہیں یہ معروضیت شاعری میں منفی رول ادا کرتی ہے۔ شاعری کا تعلق احساسِ لطیف سے ہوتا ہے اور احساسِ لطیف کو معروضیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ہم شاعری میں معروضیت کی تلاش کر لیتے ہیں تو ایک طرح کی خوشی بھی ملتی ہے۔ معروضیت کا گزر شاعری میں اُسی حد تک ہو سکتا ہے کہ احساسِ لطیف مجروح نہ ہو جیسے حنیف کیفی کے اس شعر میں معروضیت کے ہوتے ہوئے احساسِ لطیف سالم وثابت ہے۔

بھری زمین کھلا آسمان میرا تھا
جواں تھا دل تو یہ سارا جہان میرا تھا

کہتے ہیں کہ محزونیت شعر میں اثر انگیزی پیدا کر دیتی ہے۔ اس محزونیت کے لیے آدمی کو اَنا گزیدہ ہونا اور خود سے متصادم ہوتے رہنا ضروری ہے۔ ملاحظہ کیجیے چند اشعار:

آئی نہ سہارے کو اک آواز شناسا
میں ڈوب گیا اپنی صداؤں کے بھنور میں
تیرگی میرا مقدر وہ گریزاں اس سے
میرا سایہ مری ہستی سے جدا ہو جیسے

یہ اک طرفہ تعلق مستقل وجہِ دل آزاری
میں سب کو یاد رکھتا ہوں، مجھے سب بھول جاتے ہیں

کیفی صاحب نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، سانیٹ اور ہائیکو (بائیں ہاتھ کا کھیل) کہے ہیں اور بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں۔ یعنی ان کی تخلیقیت کا ایک وسیع تناظر ہے۔ بچوں کے لیے کی گئی ان کی شاعری کا مجموعہ 'بچپن زندہ ہے مجھ میں' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ کیفی صاحب کی تمام شعری ونثری نگارشات کا محاکمہ کیا جانا چاہیے تاکہ اردو ادب کے منظرنامے پر ان کی ایک واضح تصویر ابھر سکے۔ ان کی اس رباعی پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ابلیس کا بیکار عمل جائے گا
خود آگ میں اپنی ہی وہ جل جائے گا
کتنی بھی ہو باطل کی تمازت کیفی
حق موم نہیں ہے کہ پگھل جائے گا

■

Prof. Kausar Mazhari
Dept of Urdu, JMI
New Delhi - 110025
Mob.:9818718224
E-mail.: kausmaz@gmail.com

حنیف کیفی کی شاعری میں دردِ انسانیت

اظہر ابرار

حنیف کیفی کی شاعری نے جہاں لوگوں کے دلوں کو منور کیا وہیں ،ان کے کلام نے انکشاف ذات کا بھی عظیم فریضہ انجام دیا۔ آپ کی غزلیں اس بات کی غماز ہیں کہ ان میں ایک شریف انسان کا درد پنہاں ہے اور اس کی زندگی کے ان پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے وہ ہر روز نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔ پھر ان اشعار میں شاعر کی ذات کے حوالے سے مفلسی میں زندگی گزارنے والوں کی کیفیت بھی بیان کی گئی ہے۔ مجموعہ کلام میں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جس میں دنیا کی سفاکی ،لوگوں کا ایک دوسرے سے نظریں چرانا، اپنوں کو تکلیف دینا، خونی رشتوں میں فاصلے پیدا ہوجانا جیسے واقعات کو شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔

حنیف کیفی کی شاعری سچی ہے جو دل سے نکلتی ہے اور دل تک پہنچتی ہے۔ اشعار میں جگہ جگہ دلی جذبات کی کیفیت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ایک ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کو کتنے قریب سے پرکھا ہے۔

'چراغ نیم شب' کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں سے بہت سارے اشعار خود شاعر نے اپنی زندگی کا نچوڑ کی صورت میں پیش کیے ہیں۔ مختلف غزلوں میں درد کی داستان بکھری پڑی ہے جیسے یہ شعر۔

اب آ کر تھوڑی سی چھاؤں مل بھی گئی ہے تو کیا حاصل
برتی آگ میں سارا سفر تو ختم کر آئے

اس شعر میں ایک محنت کش انسان کی زندگی کا نوحہ بیان کیا گیا ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے عمر بھر محنت ومزدوری کرکے زندگی بسر کرتا ہے پھر اسے آخری ایام میں راحت نصیب ہونے کی امید نظر آتی ہے لیکن جب تک اس کی زندگی کے تھوڑے ہی دن رہ جاتے ہیں اور وہ کچھ وقت کے لیے سکون کی سانس لیتا ہے۔

حنیف کیفی نے زندگی کے حالات اور ان رشتوں کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے جب قریبی رشتوں ہی سے دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ بظاہر بڑے ہم خیال نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل ودماغ میں کسی قسم کی سازش چل رہی ہوتی ہے۔

جیسے اس شعر میں۔

ہر ایک شخص مرا ہم خیال لگتا ہے
یہ آدمی تو بڑا باکمال لگتا ہے
شعور وقت نے کیفی بدل دیا ہے مزاج
ہر انقلاب ہمیں حسب حال لگتا ہے

حنیف کیفی نے نہ کسی ادبی گروہ میں شامل ہونا پسند کیا نا کسی تحریک سے وابستگی کا اظہار کیا بلکہ انھوں نے اپنی ایک الگ ہی راہ نکالی اور اپنے تجربوں کو غزل کی زبان سے ادا کیا۔ شاعر نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے جو مصیبت میں رہتے ہیں اور ان پر کیا کچھ گزرتا ہے۔

تلخیاں مرا حاصل خواب میرا سرمایہ
ایک ہاتھ میں پتھر ایک میں ستارے ہیں

ایک جگہ حنیف کیفی لکھتے ہیں'' میں شاعری کو ایک فن شریف سمجھتا ہوں اور اسے کسی بھی طرح کی آلودگی سے ملوث کرنا گناہ تصور کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نہ تو، کبھی کسی مخصوص سماجی، سیاسی یا اسی قسم کے کسی بھی ادبی نظریے یا ازم کا پابند رہا ہوں اور نہ کسی ادبی گروہ بازی اور جکڑ بندی یا فیشن پرستی کا شکار ہوا ہوں۔ نہ کھوکھلی روایت پرستی کا قائل ہوں۔ نہ بے تکی جدت پسندی کا۔ زمانے کا ہم قدم ہونا تقاضائے حیات سمجھتا ہوں۔ لیکن اسی حد تک کہ اپنی چال نہ بگڑنے پائے۔ میرے نزدیک شاعری اپنی تلاش کا نام ہے۔ میرے لیے یہ عرفان ذات کا راستہ بھی ہے اور انکشاف ذات کا وسیلہ بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی ذات میں محصور رہا ہوں اور اپنے داخل میں گم ہوکر خارج کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔''

یقیناً حنیف کیفی کی شاعری انکشاف ذات ہے جس میں قاری شاعر کی زندگی کے الگ الگ عکس دیکھتا ہے اور شاعر نے اپنی شاعری کے ذریعے خود کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔

مجموعہ'چراغ نیم شب' میں ایسے بہت سے اشعار نکل آتے ہیں جو زندگی کے سچے ترجمان ثابت ہوتے ہیں جیسے یہ اشعار۔

سب کے چہرے ایک سے ہیں ایک آئینہ بہت
ساری دنیا دیکھنے کو اپنا ہی چہرا بہت
اب اپنا خون کہاں تک جلاؤ گے کیفی
چلو یہاں سے یہ محسن کشوں کی دنیا ہے
خیرہ ہوئی نگاہ کہ بے نور ہوگئی
وہ سیل روشنی تھا کہ بینائی کھوگئی

خواہشوں کا کوئی حساب نہیں ہوتا ایک پوری ہوتی ہے تو دوسری سر اٹھاتی ہے زندگی کا وقفہ مختصر ہے اور اس کم وقت میں انسان لازوال خواہشوں کے دھاگوں میں الجھا ہوا رہتا ہے اور پھر اس کے سامنے بڑے بڑے سوال پیدا ہوجاتے ہیں۔

آرزوئیں کمال آمادہ زندگانی زوال آمدہ
زندگی نشہ مجال جواب لمحہ لمحہ سوال آمادہ

حنیف کیفی ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے جو دوسروں کے کرب واذیت کو دیکھ کر تڑپ ہو اٹھتے تھے اور ایسے لوگوں کو دیکھ کر بڑے غمگین ہوجاتے تھے۔

کل پھولوں کی سیج سجی تھی آج رچا شعلوں کا ناچ
اک دلہن کی ارتھی دیکھی یاد آئی بارات بہت
پتھر بھی پانی ہوجاتا میں تو پھر بھی انسان ہوں
تھوڑی سی اس عمر میں دل پر جھیلے ہیں صدمات بہت

حنیف کیفی نے اپنے مجموعہ'چراغ نیم شب' میں جگہ جگہ انسانیت کی ایک دردبھری داستان بکھیر دی ہے۔

مجموعہ'سحر سے پہلے' حنیف کیفی نے 2004 میں لکھا جس میں بلراج کومل نے 'حنیف کیفی کی شاعری ایک مطالعہ' مضمون میں ان کے بارے میں لکھا تھا کہ'' حنیف کیفی کی شاعری میں تہذیبی روایتوں کا گہرا شعور ہے۔ وہ سماج کی صالح قدروں کی تعظیم کرتے ہیں۔ قومی یکجہتی، گنگا جمنی ثقافت، محبت، رفاقت، یگانگت کے نغمہ خواں ہیں۔ سماجی مسائل کے بارے میں سوچتے، غربت، افلاس، عصمت فروشی، بیوہ کی صورت حال، فسادات اور سماجی ناانصافیوں جیسے مسائل کے درمیان راہ نجات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اظہار کی سطح پر وہ سانیٹ اور ترائیلے جیسی دیگر زبانوں کی اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے علاوہ کسی انقلابی تجربہ کاری کے گنہگار نہیں

ہیں۔ تجرید، ابہام علامت پسندی، علامت سازی، بے معنویت، وجودیت، مابعدالطبیعات، جدیدیت، مابعداز جدیدیت جیسے دورِ حاضر کے تصورات، نظریے اور رائج الوقت سکے اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود ان کے دائرے کار پر ممکن ہے کہیں کہیں اثر انداز ہوئے ہوں لیکن حق بات یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی ادبی روایت اور دیگر زبانوں کے ادب کے مطالعے سے آزادانہ طور پر اپنی جمالیاتی حسیت ذہنی ردِعمل اور طریق کار کی ترتیب وتہذیب کی ہے اور روایت کے شعور اور مطالعے کے فیض سے اپنے لیے اظہار کی قابل توجہ صورتیں وضع کی ہیں۔ وہ رشتوں اور ترسیل کے بحران کی فضا میں اپنے تمام تر انسانی اور سماجی سروکاروں کے ساتھ سرگرم کار ہیں۔ اس لحاظ سے ہم ان کے اس تخلیقی روپ کو مابعداز جدید رویہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کچھ رات گزر چکی ہے، کچھ باقی ہے، وہ عرض ہنر کے لیے باقی رات کی مہلت کو غنیمت سمجھ کر مصروف تخلیق ہیں۔ وہ سحر ہونے سے پہلے اپنی وہ سب باتیں کہہ ڈالنا چاہتے ہیں جو انھیں عزیز ہیں کیونکہ سحر ہوتے ہی وہ ایک نئے سفر پر نکلنے والے ہیں۔"

کچھ رات جو باقی ہے سفر سے پہلے
گزرے نہ کہیں عرض ہنر سے پہلے
یہ تھوڑی سی مہلت ہے غنیمت کیفی
کہہ ڈالو جو کہنا ہے سحر سے پہلے

انسانی رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایک انسان مختلف رشتوں سے بندھا چلا جاتا ہے اور کبھی کبھی ان رشتوں کی دوریاں بھی بڑھ جاتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس گھر میں اجنبی انسان رہتے ہیں ایسے ہی موقعوں کے لیے حنیف کیفی نے کیا خوب کہا ہے مجموعہ کلام 'سحر سے پہلے' کے یہ اشعار دیکھیے۔

مکاں بھی معتبر ہوتے مکیں بھی معتبر ہوتے
درودیوار والے یہ مکاں اے کاش گھر ہوتے
گھروں کی یہ ہوا بندی بکھر جاتی تو اچھا تھا
کوئی ایسی ہوا چلتی کہ دیواروں میں در ہوتے

انسان کو اپنوں سے جو دکھ ملتا ہے وہ اس کی تاب نہیں لا سکتا اور اس کے دل میں ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا درد کسی اور سے کہہ نہیں سکتا مجموعہ 'سحر سے پہلے' میں ایسے بہت سارے اشعار موجود ہیں جن میں گھر میں نااتفاقی پیدا ہونے والے حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور حنیف کیفی نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں ان معاملات کو پیش کیا ہے جب ایک انسان اپنوں سے ہی رنج اٹھاتا ہے۔

گھر ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہی کیا کم تھا حادثہ
دل ہوگئے مزید جدا کچھ نہ کر سکے
گھر میں ہمارا سایہ بھی سب پر ہوا گراں
گھر ہم نے تھک کے چھوڑ دیا کچھ نہ کر سکے
ایک ہی چھت کے تلے دوریاں اتنی یارب
گھر جسے کہہ سکوں ایسا مرا گھر ہو جائے

انگریزی ادب میں جس طرح سانیٹ لکھے جاتے ہیں حنیف کیفی نے بھی اردو میں اسی طرز پر سانیٹ لکھے ہیں۔

جو مجموعہ 'سحر سے پہلے' میں شامل ہے جن میں سے ایک سانیٹ 'گریز' بھی ہے۔ اس میں انھوں نے بڑے ہی موثر انداز میں ایک ایسے نامراد انسان کی کہانی بیان کی ہے جو اپنی محبوبہ کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔ اس کے سراپا میں ڈوب کر اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے ان رفاقتوں کے دنوں کو جب وہ اپنے محبوب سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ اس حادثہ کو اب ایک عرصہ بیت گیا لیکن آج پھر اچانک اسے اپنے معشوق کی یاد آئی ہے۔ حنیف کیفی نے بڑے ہی موثر انداز میں ایک نامراد عاشق کا سراپا کھینچا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو ماضی کی یادوں سے دور رکھتا ہے اور اپنے محبوب سے پرہیز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیری دنیا تو بہت رنگین ہے لیکن میں اس میں ہرگز لوٹ نہیں سکتا ہوں۔

گریز

دل کے ویرانے میں پھر آج تری یاد آئی
پھر معطر ہے تری زلف کی خوشبو سے دماغ
پھر ہیں مہکے ہوئے تیرے لب ورخسار کے باغ
پھر خیالوں پہ ترے قرب کی حسرت چھائی
آج پھر دشمنِ ایماں ہے تری انگڑائی
گل کھلانے لگے پھر مردہ تمناؤں کے داغ
پھر سے لو دینے لگے گل تھے جو مدت سے چراغ
پھر ترے لمس کی خواہش نے قیامت ڈھائی

آج ہلچل سی مچی ہے مری دنیا میں مگر
ضبط دل سے کوئی طوفاں نہیں ٹکرا سکتا
راکھ میں غم کی دبی ہیں جو تمنا کے شرر
تیری دنیا بڑی رنگین ہے مری جان مگر
لوٹ کر میں تری دنیا میں نہیں آ سکتا

مجموعہ 'سحر سے پہلے' میں اگر رباعیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں حنیف کیفی نے اپنے فکر وفن کے دریا بہا دیے ہیں۔ وقت کیا شے ہے اس کا استعمال کیسے کیا جائے یہ بتایا ہے۔ زندگی کیا شے ہے کیسے جیا جائے اور اتنی کم مدت میں اپنے فن کو اپنی صلاحیت کو اور اپنی ان امیدوں کو پورا کر لیا جائے۔

کچھ رات جو باقی ہے سفر سے پہلے
گزرے نہ کہیں عرض ہنر سے پہلے
یہ تھوڑی سی مہلت ہے غنیمت کیفی
کہہ ڈالو جو کہنا ہے سحر سے پہلے

اس مجموعے میں قطعات بھی موجود ہیں جس میں سے ایک قطعہ میں وہ زندگی میں کوشش کرنے کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہر حال میں مصیبتوں سے لڑنے کے لیے اکساتے ہیں۔

میں زیست کے ہر موڑ پہ گر گر کے اٹھا ہوں
مٹ مٹ کے جو ابھرا ہو وہ نقش کف پا ہوں
مشعل مری پامالی پیہم کو بنالے
بھٹکے ہوئے راہی میں ترا راہ نما ہوں

حنیف کیفی اپنے مضمون 'کار لاحاصل کا دوسرا قدم' میں لکھتے ہیں "میرا یہ دوسرا شعری مجموعہ جو پہلے مجموعے کی اشاعت کے ٹھیک اٹھارہ سال کے سن بلوغ کے بعد میری عمر کی ایک ایسی منزل میں منظر عام پر آرہا ہے جسے چل چلاؤ کا دور کہا جاتا ہے، اسے میرا آخری مجموعہ بھی تصور کرنا چاہیے۔ یہ احساس کہ اب زندگی کے بہت کم دن باقی ہیں استقبال موت کی میری ان نظموں سے بھی ظاہر ہے جنھیں 'سرِ راہ عدم' کے عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے اور غزلوں کے متعدد اشعار سے بھی۔ موت جو برحق ہے اس کا احساس (خوف یا خواہش نہیں) مجھے یوں تو بہت پہلے سے رہا ہے مگر اس میں شدت ادھر آکر آئی ہے۔ میری اکلوتی بیٹی کی موت نے اس احساس کو شدید تر کر دیا ہے۔ بہرحال یہ کبرسنی اور اس پر مستزاد میری کم بختی، زندگی کے بچے کھچے دنوں میں کسی نئے مجموعے کے وجود میں آنے کے امکانات معدوم! کیونکہ دوسروں کی طرح سال بہ سال ایک شعری مجموعہ پیدا کرنے یا کتاب نام کی کوئی چیز تیار کرنے کی نہ مجھ میں قدرت ہے اور نہ یہ میری عادت ہے۔ پہلے شعری مجموعے کے پیش نظر زیر نظر مجموعہ میرے کلام کی باقیات ہے، لیکن یہ باقیات اس اعتبار سے کلیات بھی ہے کہ میں نے جن جن اصناف میں بھلی بری طبع آزمائی کی ہے وہ سب اس میں شامل ہیں۔ تفصیل مشمولات کی فہرست سے واضح ہے۔ غزلیں 'چراغ نیم شب' کے بعد کی ہیں۔ نظموں اور رباعیات وقطعات کا انتخاب، ابتدائی دس برسوں کے کلام کے اخراج کے بعد، دو قطعوں کو چھوڑ کر جو 1960 کی تخلیق ہے، 1961 سے کیا گیا ہے۔ 1966 سے میں نے سانٹ نگاری شروع کی، اس وقت سے ابھی تک کے تمام سانٹ اس مجموعے میں شامل ہیں۔"

■

Dr. Azhar Abrar Ahmad
Assistant Professor & Head,
Department of Urdu,
Seth Kesarimal Porwal College,
Kamptee, Nagpur - 441 002

حنیف کیفی

کوائف و کیفیات

محمد اکرام

حنیف کیفی صاحب کا نام میں نے دہلی آنے سے پہلے بھی سن رکھا تھا، البتہ حنیف کیفی اور حنیف نقوی کے درمیان امتیاز کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ جب 2000 میں صلاح الدین پرویز (مرحوم) کے سہ ماہی استعارہ سے میری وابستگی ہوئی تو وہاں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا۔ دفتر میں آنے والے مشاہیر ادب سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

استعارہ میں ملازمت سے پہلے اردو زبان و ادب سے میری واقفیت ذرا کم تھی۔ دھیرے دھیرے اردو ادب سے میری دلچسپی بڑھتی گئی اور وہاں آنے والے ادیبوں اور شاعروں سے دعا سلام کا سلسلہ جاری رہا۔ گلزار دہلوی (مرحوم)، کفیل آذر (مرحوم)، محمود ہاشمی (مرحوم)، اظہار اثر (مرحوم)، یوگیندر بالی (مرحوم)، نند کشور وکرم (مرحوم)، ریوتی سرن شرما (مرحوم)، ظہیر ناصر [مرحوم] (فلمی میگزین شمع میں جن کا کالم 'مسافر کی ڈائری' بہت مقبول تھا)، عابد سہیل (مرحوم)، حنیف ترین (مرحوم)، فاروق ارگلی، نظام صدیقی، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ابواللیث جاوید، ڈاکٹر جمیل اختر، مشرف عالم ذوقی، ابرار رحمانی، نگار عظیم، شبنم عشائی، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مولا بخش، راشد انور راشد، ڈاکٹر مشتاق صدف، معین شاداب، خالد بن سہیل (مرحوم) خالد عبادی، احمد صغیر، شاہد اختر (کانپور)، معراج رانا، شبیر احمد، ایڈووکیٹ جیلانی، سعید اختر اعظمی، ہادی رہبر، محمد انیس شاہجہاں پوری وغیرہ یہ کچھ نام ایسے تھے جن سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ حقانی القاسمی صاحب جو سہ ماہی 'استعارہ' میں شریک مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے، ان کے ذریعے ہی استعارہ کے دفتر میں مجھے ملازمت ملی تھی۔ حقانی القاسمی صاحب سے میری ذہنی ہم آہنگی اس حد تک تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہم سے اتنے سینئر ہیں۔ حقانی صاحب بہت پہلے سے دہلی میں مقیم تھے، اس لیے ان کی شناسائی بہت سے ادیبوں، شاعروں سے تھی۔ وہ جب کسی ادیب وشاعر سے ملنے جاتے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔

کبھی کبھی جب جامعہ کے شعبۂ اردو میں تشریف لے جاتے تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیتا۔ شعبۂ اردو میں ہی میری باضابطہ ملاقات کوثر مظہری صاحب سے ہوئی جو اس وقت شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان دنوں ان کی رہائش ابوالفضل انکلیو میں تھی۔ کوثر مظہری صاحب کے ذریعے ہی ہم نے پروفیسر حنیف کیفی صاحب کی شخصیت کو جانا اور سمجھا۔ حنیف کیفی صاحب اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں پروفیسر تھے اور کوثر مظہری صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

2003 میں جب استعارہ کا دفتر شفٹ ہوکر ذاکر باغ چلا گیا، تو ایک دن کوثر مظہری صاحب استعارہ کے دفتر آئے اور مجھے اپنے ساتھ حنیف کیفی صاحب کے گھر یہ کہہ کر لے گئے کہ کیفی صاحب کو کمپوزنگ وغیرہ کا کام رہتا ہے، اگر ہوسکے تو ان کا کام کردیا کیجیے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

کیفی صاحب سے میری پہلی ملاقات بہت خوشگوار رہی، مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ شعبۂ اردو جامعہ ملیا اسلامیہ کے سبکدوش صدر سے ملاقات ہورہی ہے۔ گھر میں انھوں نے کافی خاطر تواضع کی۔ کیفی صاحب دیکھنے میں تو بہت نحیف و کمزور نظر آتے تھے لیکن ان کے چہرے پر چمک اور آواز میں بلا کی کشش تھی بلکہ کھنک بھی۔ انداز گفتگو نہایت بلیغ ہوتا تھا، ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ گھر پر نہیں کلاس روم میں بچوں کو درس دے رہے ہوں، کیفی صاحب جیسے خوش اخلاق، منکسر المزاج، پابند اوقات اور اصول پرست شخص کا مجھ پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ کبھی کبھی بلاضرورت ہی میں ان سے ملنے چلا جاتا۔ کیفی صاحب کے عادات و اطوار میں مجھے وقت کی پابندی اور اصول پرستی بہت اچھی لگی۔

کیفی صاحب سے ملنے والوں کا دائرہ محدود تھا۔ کیفی صاحب جس کو چاہتے دل سے اور جس کو ناپسند کرتے، ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کیفی صاحب مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم ان کے گھر کے ہی

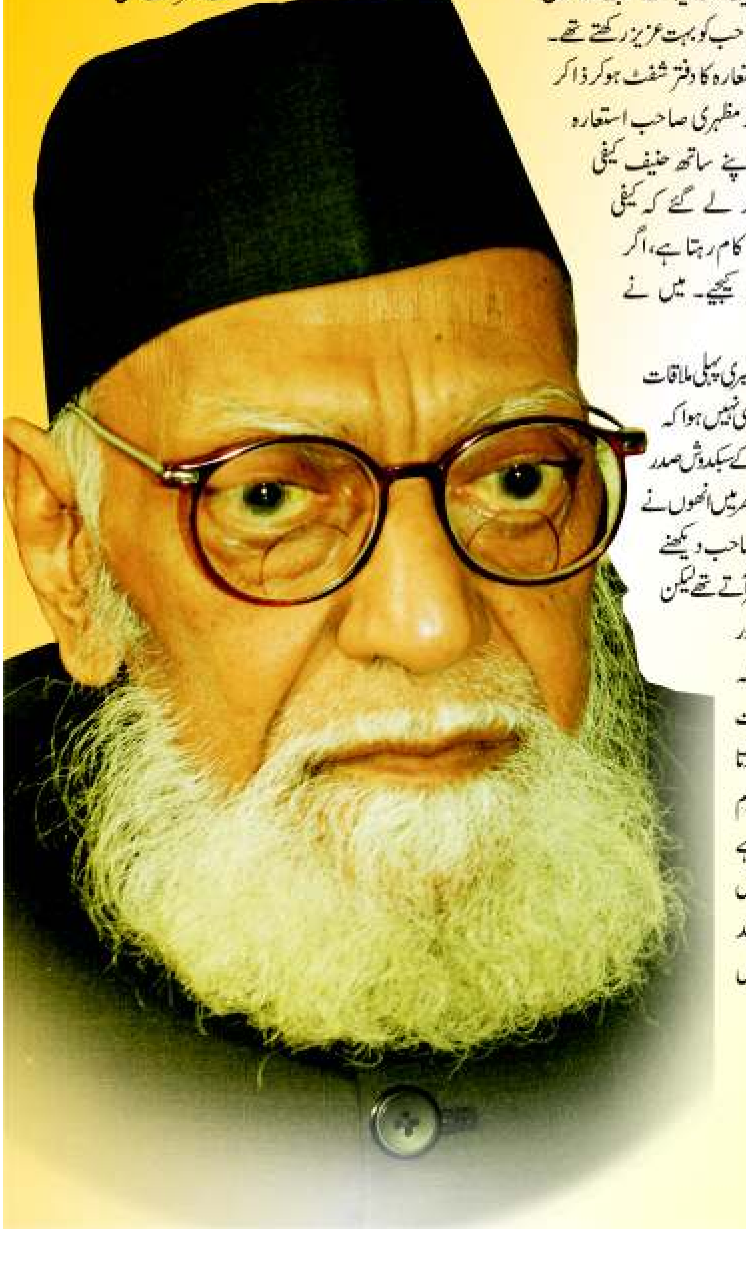

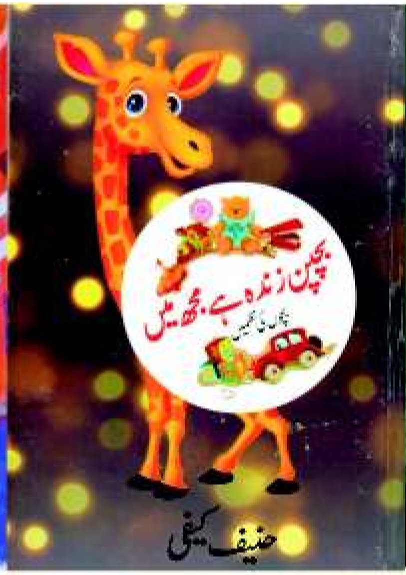

ایک فرد ہیں۔ جب بھی ان کے گھر جانا ہوتا تو سب سے پہلے تمام اہل خانہ کی خیریت پوچھتے، یہاں تک کہ اگر فون پر بھی بات ہوتی تو بھی احوال دریافت کرنا نہ بھولتے۔ کیفی صاحب کے یہاں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں تھا، اپنے گھر پر ہر کسی کو مہمان سمجھتے، اور مہمان نوازی کی جو خوبیاں ہیں انھیں بخوبی نبھاتے۔ خوشی کا کوئی ایسا لمحہ نہ تھا جس میں کیفی صاحب اپنے مخلصین کو یاد نہ کرتے ہوں۔ اگر اجتماعی دعوت کا کوئی موقع ہوا تو مہمانوں سے فرداً فرداً پوچھتے کہ ضیافت میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔

اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا رہتا ہے، کیفی صاحب بھی انہی نیک بندوں میں سے تھے۔ کیفی صاحب اپنی صحت کو لے کر ہمیشہ فکر مند تو رہتے تھے مگر اس حال میں بھی وہ خدا کا شکر بجالانا نہ بھولتے۔ سنہ 2003 میں جب سے میرا کیفی صاحب کے یہاں آنا جانا شروع ہوا، کم ہی ایسا دیکھا کہ وہ اپنی صحت کے تعلق سے مطمئن ہوں، جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ ان کی آنکھوں کا آپریشن بھی ہوا اور پروسٹیٹ (Prostate) کا بھی۔ اس کے باوجود تا حیات قلم، کاغذ اور کتاب سے ان کا رشتہ برقرار رہا۔

کیفی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی تھی، لیکن ایک بیٹا اور ایک بیٹی جسمانی طور پر معذور تھے۔ کیفی صاحب نے اپنی اکلوتی بیٹی غزالہ کے علاج و معالجے میں اپنی بیماری اور عمر رسیدگی کے باوجود کوئی کمی نہ آنے دی اور جب بھی ان کو ڈاکٹروں کی ضرورت محسوس ہوتی ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھرتے تھے، لیکن موت کا ایک دن معین ہے، بالآخر 15 جنوری 2003 کو اپنے والدین کی چہیتی اور بھائیوں کی اکلوتی بہن سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملی۔ کیفی صاحب کا ایک اور بیٹا محمد ارشد علیم بھی ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور تھا، کیفی صاحب اپنے اس معذور بیٹے کو بھی دل و جان سے چاہتے تھے۔ ان کے بیٹے کو اگر تھوڑی سی بھی پریشانی ہوتی تو اپنی پریشانیوں کی فکر نہ کرتے ہوئے حتی الامکان ان کی دیکھ بھال کرتے، مگر تمام تر علاج و معالجے کے باوجود وہ بھی 23 اپریل 2017 کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حنیف کیفی کا پورا نام محمد حنیف قریشی اور تخلص کیفی ہے، والد کا نام حاجی حشمت اللہ اور تاریخ پیدائش (ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے مطابق) 8 ستمبر 1934 ہے۔ کیفی صاحب کی جائے پیدائش بریلی (روہیل کھنڈ، یوپی) ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم میونسپل پرائمری اسکول، بانس منڈی، بریلی سے حاصل کی، جبکہ 1944 میں چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا۔ ثانوی تعلیم آزاد ہائر سیکنڈری اسکول (موجودہ آزاد انٹر کالج)، بریلی سے حاصل کی، حنیف کیفی نے بریلی کے ہائی اسکول سے 1952 میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ 1954 میں انٹرمیجیٹ (سائنس)، 1956 میں بی اے اور 1958 میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی لٹریچر میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کیفی صاحب صوبہ مدھیہ پردیش کے ضلع سرگوجا کے ایک قصبے میں انگریزی زبان کے لکچرر کی حیثیت سے 5 دسمبر 1961 کو مامور ہوئے اور 8 مارچ 1972 کو انھوں نے اس ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ ملازمت کے دوران ہی وکرم یونیورسٹی، اجین، مدھیہ پردیش سے 1968 میں ایم۔ اے (اردو) کی ڈگری فرسٹ ڈویژن، سیکنڈ پوزیشن میں حاصل کی۔ پھر ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے 10 مارچ 1972 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملازمت کے دوران ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نگرانی میں 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)'، کے موضوع پر 1980 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر یکم جنوری 1983 کو ریڈر بن گئے اور 30 جون 1988 کو پروفیسر اور پھر شعبۂ اردو کے صدر کی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے 7 ستمبر کو 1999 جامعہ سے سبکدوش ہوئے۔

حنیف کیفی صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست طویل نہ سہی مگر ان کی جتنی بھی کتابیں ہیں وہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور آئندہ بھی ان کی پذیرائی ہوتی رہے گی کیونکہ ان کی بعض کتابیں حوالہ جاتی حیثیت کی حامل ہیں۔ کیفی صاحب کی مطبوعات کی فہرست حسب ذیل ہے:

(1) اردو شاعری میں سانٹ (تحقیق و تنقید) 1975

(2) اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم [ابتدا سے 1947 تک] (تحقیق و تنقید) 1982

(3) جے شنکر پرساد (سوانح و تنقید: انگریزی سے ترجمہ) 1984

(4) چراغ نیم شب (شاعری) 1986

(5) اردو کی نئی کتاب (گیارہویں جماعت کے لیے)، 1986

(6) اردو کی نئی کتاب (بارہویں جماعت کے لیے) 1988

(7) اردو سانٹ: تعارف و انتخاب (تحقیق و تدوین) 1987

(8) تنقید و توجیہ (مضامین) 1997

(9) انتخاب کلام شمیم کرہانی (ترتیب) 1999

(10) سحر سے پہلے (شاعری)، 2004

(11) بائیں ہاتھ کا کھیل (شاعری) 2011

(12) بچپن زندہ ہے مجھ میں (بچوں کے لیے) 2018

(13) صبح کی دہلیز پر (شاعری) 2021

کیفی صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1951 میں شاعری سے کیا جب وہ نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ کیفی صاحب کی اوّلین تخلیق 'خوش اخلاقی' (نویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے) رسالہ 'بانو' دہلی میں 1952 میں شائع ہوئی۔ ان کی خاص دلچسپی شاعری سے تھی، مگر ان کے استاد عشرت صاحب کی خواہش تھی کہ وہ مضامین بھی لکھیں، چنانچہ انھوں نے کیفی صاحب سے 'خوش اخلاقی' اور 'میرا بہترین مشغلہ' عنوانات کے تحت مضمون لکھنے کو کہا، اس وقت کیفی صاحب نویں کلاس میں تھے۔ بہر حال کیفی صاحب نے استاد کے حکم کی تعمیل کی اور عشرت صاحب نے ان مضامین کو پڑھ کر کیفی صاحب کو داد و تحسین سے نوازا۔ کیفی صاحب کے بقول عشرت صاحب نے ان سے مزید مضامین تحریر کرنے کو کہا:

''عشرت صاحب نے ان مضامین سے متاثر ہو کر میری حوصلہ افزائی کی اور یہاں تک کہا کہ اسی طرح کے کچھ اور مضامین لکھ دو تو میں انہیں شائع کرا دوں۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے اسے میری چالاکی کہیں یا ہوشیاری کہ میں نے اپنا مضمون 'میرا بہترین مشغلہ' 'کتب بینی' کے موضوع پر لکھا اور اس طرح اس میں دو مضامین کو یکجا کر دیا تھا۔ اس میں ایک طرف تو اخلاقی قدروں اور کتب بینی کے فوائد کو پیش نظر رکھا گیا تھا اور دوسری طرف فرصت کے اوقات کو بسر کرنے کا ایک اچھا مشغلہ پیش کیا گیا تھا۔

آج جب میں اپنی ابتدائی تحریروں کو دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت یہ پہچان نہیں تھی کہ ان پر شعری اثر زیادہ ہونے کا سبب طبیعت میں شعری مذاق کے رچے بسے ہونے کی سچائی تھی۔ انٹرمیجیٹ سائنس سے کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میدان میری حساس طبیعت اور شاعرانہ مزاج کے مطابق نہیں ہے۔''

(حنیف کیفی: ذات اور جہات، مرتبین: ڈاکٹر مسعود ہاشمی، اطہر عزیز، 2011، ص 156)

کیفی صاحب کی پہلی کتاب 'اردو شاعری میں سانٹ' ہے جو انھوں نے ایم اے کے مقالے کے طور پر تحریر کیا تھا۔ اس کتاب کو بہت مقبولیت ملی۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک سمجھا کہ یہ کیفی صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ کتاب کی شہرت سے دھیرے دھیرے کیفی صاحب کا رجحان شاعری سے ہٹ کر نثر کی طرف بڑھتا گیا۔ جب کیفی صاحب کی دوسری کتاب 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)' 1982 میں شائع ہوئی تو اس کتاب کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ کیفی صاحب کی اس کتاب کو قومی اردو کونسل نے اپنے سلسلۂ مطبوعات کے تحت شائع کیا اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن 2003 میں پاکستان سے بھی شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ کتاب کیفی صاحب کی پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے جو انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔ یہ ایک حوالہ جاتی کتاب ہے، جو مختلف جامعات کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان جیسے ماہر لسانیات نے ان کی کتاب 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ یہ نہ صرف اس موضوع پر اضافہ کا حکم رکھتی ہے بلکہ عرصہ تک اس موضوع پر علمی کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھے گی۔''

(حنیف کیفی: ذات اور جہات، مرتبین: ڈاکٹر مسعود ہاشمی، اطہر عزیز، 2011، ص 61)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بقول:

''کیفی نے اپنی تمام تر آگہی اور تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو اس میں کھپا دیا ہے، اس موضوع کا جیسا حق کیفی صاحب نے ادا کیا ہے کوئی دوسرا ادا نہ کر سکا۔''

(ایضاً، ص 61)

ڈاکٹر انور سدید نے 'اوراق' کے خاص نمبر میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''مغرب اور مشرق کی تہذیبی آویزش سے اردو شاعری نے جو اثرات قبول کیے ان میں نظم معرا اور نظم آزاد کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے اردو شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ہیئت اور اظہار کے تجربوں پر اہل قلم نے خیال انگیز مضامین لکھے ہیں لیکن ان تجربات کی مربوط تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس کمی کو ڈاکٹر حنیف کیفی نے زیر نظر کتاب 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' میں پورا کرنے کی سعی کی ہے۔'' (ایضاً، ص 62-61)

کیفی صاحب جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تو اس کا پورا حق ادا کر دیتے، کسی کام کو ادھورا چھوڑنا ان کی عادت میں شامل نہیں تھا۔ کیفی صاحب کو جب اپنی تحریر پر مکمل اطمینان ہو جاتا تبھی وہ چھپنے کے لیے بھیجتے تھے، چاہے اس میں کتنی ہی تاخیر ہو جائے۔ جس کا اندازہ ان کی تینوں کتابوں 'اردو سانٹ: تعارف و انتخاب' اور 'اردو شاعری میں سانٹ' اور 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں میں کیفی صاحب کی ریاضت، عرق ریزی اور شب و روز کی محنت و جستجو جھلکتی ہے جس کی تائید پروفیسر توقیر احمد خاں کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

''کیفی اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ کام ہو تو ادھورا نہ ہو اور جہاں تک ممکن ہو سکے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتا ہو۔ چنانچہ ان کی کتابیں 'اردو شاعری میں سانٹ'، 'اردو سانٹ: تعارف و انتخاب' اور 'اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم' وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن پر آج تک کوئی اضافہ نہ ہو سکا اور ہوگا بھی کیسے۔ کوئی کیفی صاحب سے زیادہ محنت کرنے والا ہو اور ان سے زیادہ گہری نظر رکھنے والا ہو تو وہی شخص اضافہ کی ہمت کر سکتا ہے۔''

(ایضاً، ص 67)

حنیف کیفی صاحب کی ایک اور کتاب 'تنقید و توجیہ' مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں بیس مضامین شامل ہیں۔ کتاب میں امیر خسرو، مرزا غالب، میراجی اور مولوی عبدالحق پر لکھے گئے مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں کیفی صاحب نے ان شخصیات کے ہر پہلو پر گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر امیر خسرو کے ہندوی کلام سے مدلل بحث کی ہے اور سلیس اور سہل انداز میں قاری کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مرزا غالب پر لکھے مضمون میں غالب کی شاعری اور شخصیت دونوں پہلوؤں کا بھرپور جائزہ ہے۔ اس مضمون میں غالب کے بارے میں کچھ ایسے نکات پر بھی بحث کی گئی ہے جن پر کسی اور نے قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ یہ کتاب ہر طبقے کے لیے مفید ہے، خاص کر طلبا اور اساتذہ کے لیے، جس کی توثیق کوثر مظہری کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''پروفیسر کیفی سنجیدہ اور پروقار تنقید کا میلان رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تحقیق کے عناصر ملتے ہیں جس کے سبب توجیہ و توثیق کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ طلبائے ادب اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید ہوگا۔ مطالعے سے معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ پروفیسر کیفی کے گہرے اور باوزن افکار کا بھی پتہ چلتا ہے۔''

(بازدید اور تبصرے، کوثر مظہری، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2013، ص 302)

کیفی صاحب کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان کا سب سے پہلا شعری مجموعہ 'چراغ نیم شب' 1984 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں غم و اندوہ اور امید و ناامیدی، اپنوں کی بے وفائی ان سارے موضوعات کے تحت اشعار مل جائیں گے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جنھیں سکھائے ہیں آداب زندگی ہم نے
وہی یہ پوچھ رہے ہیں مزاج کیسا ہے

اپنوں کی نظر ملتی ہے غیروں کی نظر سے
بے گھر ہوں یہ احساس ملا ہے مجھے گھر سے

حنیف کیفی کا دوسرا شعری مجموعہ 'سحر سے پہلے' 2004 میں اور 'بائیں ہاتھ کا کھیل' 2011 میں منظر عام پر آیا۔ کیفی صاحب کا آخری مجموعہ 'صبح کی دہلیز پر' ان کی وفات سے 45-40 دن پہلے ہی پریس سے چھپ کر آیا تھا۔ اس مجموعے میں کیفی صاحب کے بہت سے اشعار مایوسی بھرے انداز کے ملتے ہیں۔ اپنے کمزور جسم، خرابی صحت اور بڑھتی ہوئی عمر کا انھیں بخوبی اندازہ تھا۔ باتوں باتوں میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جانے کب بلاوا آجائے، کہا نہیں جا سکتا، میرے اکثر احباب اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ چاہتا ہوں ادھورے کام جلدی سے پورے ہو جائیں۔ اس مجموعے کے کچھ اشعار سے ان کی مایوسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

جواب دے گئی ہمت میں تھک چکا ہوں بہت
سہارا دے کے اٹھا لو بہت اکیلا ہوں
لرز رہا ہے بدن پاؤں لڑکھڑاتے ہیں
میں گر نہ جاؤں سنبھالو بہت اکیلا ہوں
خطائیں بخشو عزیزو اب آؤ مل بیٹھو
غبار دل سے نکالو بہت اکیلا ہوں

آخری منزل میں ہے عمر گریزاں کا سفر
ایک لامحدود عالم اور قصہ مختصر

کیفی صاحب نے سانٹ، ہائیکو، علم عروض جیسے خشک موضوعات پر جو خامہ فرسائی کی، جن پر کم ہی لوگ لکھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ علم عروض پر لکھنا تو دور کی بات آج پڑھنا بھی کم لوگ پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک مشکل اور

خشک موضوع ہے۔ یوسف ناظم صاحب کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''پروفیسر حنیف کیفی عروض کے ماہرین میں سے ہیں۔ علم عروض ادب کی سب سے خطرناک شاخ ہے۔ کیا حنیف کیفی بتائیں گے کہ اسے سائنس کیوں نہیں قرار دیا جاسکتا؟ جو بھی ہے 'بحرِ رجز' میں 'بحرِ رمل' ڈال کر ہی چلتا ہے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جو شاعر عروض کی غلطی نہیں کرتا اچھا شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔''

(حنیف کیفی: ذات اور جہات، مرتبین: ڈاکٹر مسعود ہاشمی، اطہر عزیز، 2011، ص 47)

کیفی صاحب نے بچوں کے لیے پیاری پیاری، ننھی منی نظمیں بھی لکھی ہیں جو بچوں کے لیے نصیحت آموز بھی ہیں۔ کیفی صاحب کی کچھ نظمیں 'بچوں کی دنیا' اور دوسرے رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوئی ہیں۔ بچوں کی نظموں پر مشتمل کیفی صاحب کا ایک مجموعہ 'بچپن زندہ ہے مجھ میں' 2018 میں شائع ہوا۔ کیفی صاحب جب عمر کے آخری پڑاؤ پر تھے تب یہ مجموعہ منظر عام پر آیا۔ مجموعے کی نظموں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ کیفی صاحب کے اندر وہ ہنستا کھیلتا بچپن پھر سے اجاگر ہوگیا ہے۔ اس مجموعے پر 'بچوں کی دنیا' میں حقانی القاسمی صاحب کا جامع تبصرہ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے تبصرے میں کیفی صاحب کے بچپن کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

''لوگ کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں بچپن کا زمانہ لوٹ آتا ہے۔ بچپن کی یادیں بڑھاپے میں بے چین کرنے لگتی ہیں۔ کاغذ کی کشتی، تتلیاں، جگنو، گڑیا سب ذہن کے پردے پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ جس کا اظہار نوشی گیلانی جیسی شاعرہ نے کچھ یوں کیا ہے:

کچھ نہیں چاہیے تجھ سے اے مری عمرِ رواں
مرا بچپن، مرے جگنو، مری گڑیا لا دے

(بچوں کی دنیا، مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، جلد 8، شمارہ 9، ستمبر 2020، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

اس مجموعے سے نظموں کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

ننھی سی وہ بچی ہے — لامعہ سیدھی بچی ہے
ٹھک ٹھک چلتی ہے — گرتی اور سنبھلتی ہے

(ننھی لامعہ)

پہلا دن اسکول کا تھا — خوش تھے بے حد عبداللہ
پھرتے تھے اتراتے ہوئے — چلتے تھے لہراتے ہوئے
ساتھ گئے ابو جان — لائے تھے خود سب سامان
پنسل باکس، ٹفن، بستہ — لے آئے مہنگا سستا
پانی کی بوتل بھی لی — چلتے چلتے لی چھتری

(عبداللہ اسکول چلے)

بچوں کے لیے نظمیں تو بہت سارے لوگوں نے لکھی ہیں، لیکن کیفی صاحب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے ہائیکو بھی لکھی ہے۔ ہائیکو اصناف شاعری میں ایک جاپانی صنف ہے جو مختصر اور تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثال کے لیے ملاحظہ کیجیے۔

سب کا پیارا کھیل
بچوں نے لائن باندھی
چھک چھک چل دی ریل

ڈھونڈیں ہر ہر چھور
آنکھ مچولی کھیلیں یار
جو پکڑا وہ چور

(کھیل کھلاڑی)

کیفی صاحب اردو زبان وادب کے لیے مکمل طور پر وقف تھے اور ان کا پورا وقت تحریر وتصنیف میں گزرتا تھا۔ اس کے باوجود ان کی کتابوں کی تعداد کم ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ عجلت پسند نہیں تھے۔ بہت غور وفکر کرنے کے بعد کتابیں چھپوایا کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کے حد درجہ احتیاط کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی کاہلی سے تعبیر کیا ہے:

''کیفی صاحب بلا کے کاہل اور سست قلم ہیں، تاہم جب لکھنے پر آتے ہیں تو جی لگا کر اور ایسا ٹھوک بجا کر لکھتے ہیں کہ کوئی حرف نہیں رکھ سکتا۔''

(حنیف کیفی: ذات اور جہات، مرتبین: ڈاکٹر مسعود ہاشمی، اطہر عزیز، 2011، ص 42)

حنیف کیفی صاحب کے کچھ ادھورے کام جو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کرسکے۔ ان میں ایک کتاب 'گفتگو کتابوں کی' ہے۔ اس کتاب کا مسودہ حنیف کیفی صاحب گاہے بہ گاہے 2007 سے اب تک مجھے کمپوز کرنے کے لیے دیتے رہے۔ میں نے کیفی صاحب کی علالت اور نقاہت کو دیکھتے ہوئے نومبر 2020 کے آخری ہفتے میں کہا تھا کہ کیفی صاحب! اب آپ اس کتاب پر چھوٹا سا پیش لفظ لکھ کر ترتیب دے دیجیے، انھوں نے میرے اس مشورے کو تسلیم کرتے ہوئے چھوٹا سا پیش لفظ لکھ کر کتاب مجھے عنایت کردی۔ 13 دسمبر 2020 کو میں نے یہ کتاب مکمل کرکے کیفی صاحب کے حوالے کردی کہ سر آپ نظر ثانی کرلیجیے تاکہ یہ کتاب اشاعت کے مرحلے کو پہنچ سکے۔ افسوس کہ وہ نظر ثانی نہ کرسکے۔

کیفی صاحب کے کچھ اور مضامین ہیں جو انھوں نے 2014 سے 2018 کے درمیان مجھے کمپوز کرنے کے لیے دیے تھے جنھیں وہ کتابی صورت میں شائع کرانا چاہتے تھے۔ ان کا یہ کام بھی ادھورا رہ گیا۔ میں بہت پریشان تھا کہ آخر کیفی صاحب کے ان ادھورے کاموں کو کون پورا کرے گا۔ میرا ارادہ تھا کہ قمر سلیم صاحب جو ممبئی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں اور لکھنا پڑھنا ان کا مشغلہ بھی ہے، جب ان سے میری ملاقات ہوگی تو کیفی صاحب کی اس خواہش کا ذکر ان سے کروں گا۔ اسی درمیان ایک دن کیفی صاحب کے صاحبزادے رضوان صاحب کا فون آیا کہ 'بابو' (کیفی صاحب کے بیٹے کیفی صاحب کو بابو کہتے ہیں) کے کچھ کام شاید آپ کے پاس ادھورے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ بابو کے بچے ہوئے کام کو میں پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں۔ میں نے تفصیل سے کیفی صاحب کے ادھورے کام کے بارے میں رضوان صاحب کو بتایا اور میں نے یہ بھی کہا کہ ان کی طباعت و اشاعت میں میری کسی بھی طرح کی معاونت درکار ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے اس وعدے کے ساتھ فون رکھ دیا کہ کسی دن آپ کو گھر پر بلاؤں گا اور جو چیزیں بابو اپنی حیات میں میرے حوالے کرگئے تھے انھیں آپ سے سمجھ کر طباعت کے مرحلے تک ضرور پہنچاؤں گا۔ باتوں باتوں میں رضوان صاحب نے یہ بھی بتایا کہ بابو کے لکھنے پڑھنے والے سارے کام میں ہی دیکھتا تھا، وہ مجھے ہی ساری چیزیں بتاتے تھے۔ رضوان صاحب کے جواب سے میں بہت مطمئن ہوا اور مجھے بھی خوشی ہوئی کہ کیفی صاحب جو ادھورے کام اپنی حیات میں پورا نہ کرسکے، اب ان کے بچے پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

انتقال سے چند روز قبل جب وہ ہولی فیملی میں زیر علاج تھے، ایک دن میرے پاس فون آیا۔ ان کی آواز میں اتنی کپکپاہٹ تھی کہ میں سمجھ نہ سکا وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ پھر فون کسی وجہ سے ڈس کنیکٹ ہوگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ کیفی صاحب جب صحت یاب ہوکر گھر آئیں گے تو میں ان سے ملاقات کروں گا۔ کیا پتہ تھا کہ کیفی صاحب سے یہ میری آخری بات ہورہی ہے۔ کیفی صاحب نے 27 جنوری 2021 کو صبح ساڑھے دس بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

کیفی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہم اب صرف ان کی تحریروں کو پڑھ سکتے ہیں اور کیفی صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو یاد کرسکتے ہیں خاص کر ان لمحوں کو جب وہ اپنے بچوں کی طرح مجھے بھی نصیحتیں کرتے رہتے تھے۔ کیفی صاحب کے بارے میں اور کیا کہوں؟ بس یہی کہ...

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

■

Mohd Ikram
Mob.:9873818237
Email.: mdikram2011@gmail.com

2020 کا فکشن اور فکشن تنقید

ایک عالمی جائزہ

اسلم جمشید پوری

زمانے کے سمندر میں بارہ مہینوں کا ایک کلینڈر دریا کی شکل میں سما گیا۔ وقت کا سمندر ایسے ہزاروں اور لاکھوں برسوں کے خزانے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور روز افزوں وسیع وبیکراں ہوتا جاتا ہے۔ موضوعات اور وقت کی ستم ظریفیوں کے حساب سے 2020 کانٹے کی طرح دل میں چبھنے والا سال ثابت ہوا ہے۔ 2020 میں کورونا سے متاثر ادب خاصا تخلیق ہوا۔ ادبی رسائل محفلیں اور سمینار آن لائن ہونے لگے۔ ہر سال کی طرح میں نے 2020 میں لکھے گئے فکشن اور فکشن تنقید کا ایک جائزہ لیا ہے جو اردو دنیا کے قارئین کے لیے پیش خدمت ہے۔

2020 کا افسانہ:

2020 میں افسانوں اور افسانچوں کے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے کچھ نے چونکایا بھی، کچھ افسانوی مجموعے بہت مشہور ہوئے اور کچھ نے قاری پر گہرا تاثر قائم کیا۔ اس سال شائع ہونے والے خاص مجموعوں میں تین کہانیاں (خالد جاوید) اوراک (شبیر مصباحی) ذہن زاد (توصیف بریلوی) نئی راہ نئی روشنی (انور آفاقی) دیوار ہجر کے سائے (عشرت معین سیما) بکھرے رنگ (ڈاکٹر عقیلہ) ڈائجسٹ کہانیاں (راشد اشرف) امریکی کہانیاں (یاسر حبیب) میری چاہت کے گلاب (احمد حسنین) نیا حمام (ڈاکٹر ذاکر فیضی) خون کا رنگ (ارشد منیم) گمشدہ دولت (طارق شبنم) وہ دس اور دوسری کہانیاں (ف۔س اعجاز) احتیاط (راجیو پرکاش ساحر) چراغوں کے اندھیرے (محمد عرفان ثمین) پس پردہ (ڈاکٹر عارف انصاری) دخمہ (پروفیسر بیگ احساس) حمید سہروردی اور بچوں کی کہانیاں (ڈاکٹر اسرارالحق سبیلی) اونچی اڑان (ڈاکٹر ایم اے حق) کل اور آج کا غم (ڈاکٹر عظیم راہی) تنکے (ڈاکٹر نذیر مشتاق) وغیرہ ہیں۔

خالد جاوید کا افسانوی مجموعہ 'تین کہانیاں' کے نام سے 2020 میں منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل آپ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'بُرے موسم میں' 2002 دوسرا مجموعہ 'آخری دعوت' 2007 میں تیسرا افسانوی مجموعہ 'تفریح کی ایک دوپہر' 2008 میں شائع ہوا۔ ان تینوں افسانوی مجموعوں نے قارئین کو اتنا متاثر کیا کہ آپ کو ایک معتبر افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ سبھی کہانیوں میں فکری وفنی جنبش نظر آتی ہے۔

خالد جاوید کے تازہ مجموعے میں تین کہانیاں 'تاش کے پتوں کے عجائب گھر'، 'تنقید کے خلاف ایک بیانیہ' اور 'زندوں کے لیے ایک تعزیت نامہ' شامل ہیں۔ یہ تینوں کہانیاں سماج ومعاشرے کے الگ الگ موضوعات پر تحریر کی گئی ہیں۔ کہانیوں کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ آپ کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔

ذاکر فیضی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نیا حمام' 2020 میں منظر عام پر آیا۔ ادبی حلقوں میں اس کی پزیرائی ہو چکی ہے۔ سماجی رشتوں کے تانے بانے بنتا ہوا یہ مجموعہ دیگر فکشن نگاروں کے دل میں بھی جگہ بنا چکا ہے۔ مشہور فکشن نگار پیغام آفاقی کے بقول ''فیضی کے اندر ایک عمدہ افسانہ نگار ہے، جو اپنے انداز میں افسانے لکھ رہا ہے۔'' ڈاکٹر ذاکر فیضی کے اس افسانوی مجموعے میں نیا حمام، ٹوٹے گملے کا پودا، فنکار، ٹی۔او۔ڈی وائرس، اسٹوری میں دم نہیں ہے۔ مردوں کی الف لیلہ، کوڑا گھر، ورثے میں ملی بارود، ہٹ ہے، کلائمکس، اخبار کی اولاد، بدری، لرزتی کھڑکی، دعوت نون وتیغ غور وفکر کی دعوت دینے میں مجموعے میں پانچ افسانچے بھی شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، سماجی اور ثقافتی سروکار امیر غریب کے جذبات واحساسات کی سچی تصاویر دکھائی دیتی ہیں۔

ناصر آزاد کا پہلا افسانوی مجموعہ 'خواب اور حقیقت' 2020 میں منظر عام پر آیا۔

ایک اہم اور منفرد قسم کا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں عورت مرد کی خود پسندی، خواتین پر ظلم وستم، غریبی، مفلسی کی ستم ظریفی، ازدواجی زندگی میں بے چینی، بے قراری وغیرہ کے نقوش آسانی سے مل جاتے ہیں۔ ناصر آزاد کی ایک اہم خوبی جو انہیں مقبول عام بناتی ہے وہ ہے 'باریک بینی سے سوچنا' ہمیشہ اپنے افسانوں کو بار بار پڑھتے ہیں اور بہتر سے بہتر کہانی لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مالیر کوٹلہ

پنجاب کے ممتاز افسانہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی لکھتے ہیں:

''ناصر افسانے کو بہت باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور بہتر تخلیق پر یقین رکھتے ہیں۔ افسانے کا کوئی پہلو کمزور ہو اس کے لیے فکر مند رہتے ہیں''

'وہ دس اور دوسری کہانیاں' ف۔ س۔ اعجاز کا یہ دوسرا اور تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔

اس مجموعے میں ف۔ س۔ اعجاز نے اپنی مشہور کہانی 'وہ دس' کے علاوہ بتیس چھوٹی بڑی کہانیاں شامل کی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کہانی ریزی کے عنوان سے تینتیس ایک صفحے کی کہانیاں بھی شامل اشاعت ہیں۔ انھوں نے ان کہانیوں کو افسانچہ نہیں کہا ہے۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب قاری تلاش کرے گا۔ ف۔س اعجاز کی کہانیاں ہمارے عہد کا سچ تو ہیں ہی مستقبل کا پیش خیمہ بھی ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں وہ دس، کبیرا کھڑا بازار میں، اریکا، گڑیا، من وسلوا، لکڑی کا جزیرہ، بھولا پن، پاسورڈ، گرین سون، چاند اور چھپکلی، اسکرولڈ، آپ کی توجہ ضرور مبذول کرائے گی۔ ان کے کئی افسانچے سوال، سانسک، بے رحم، میٹو، ڈر، بھی آپ کو سوچنے پر مجبور کریں گے۔

'دیوارِ ہجر کے سائے' جرمنی کی مشہور افسانہ نگار عشرت معین سیما کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

آپ کے افسانوں میں یوں تو ہر طرح کے موضوعات شامل ہیں لیکن عورت کی بے بسی، عورت پر ہونے والے ظلم وستم، بے چارگی اور مرد سماج کے ذریعے ڈھائے جانے والے ظلم وستم کا خاصہ واضح نظر آتا ہے۔ وہ اپنے خواتین کردار کو سماج سے لڑنے کا حوصلہ بھی بخشتی ہیں۔ دیوارِ ہجر کے سائے میں عشرت معین سیما کے تقریباً انیس افسانے شامل ہیں، جن میں وہ کون تھی، دھواں، دیوارِ ہجر کے سائے، جنت، چاند، اور چار دیواری، سبز پوش، کفارہ ایسے افسانے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

'بکھرے رنگ' ڈاکٹر عقیلہ کا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ نئی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں سے بہت جلدی شناخت قائم کی ہے۔ بکھرے رنگ مجموعے میں ڈاکٹر عقیلہ کے تقریباً گیارہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں رومان کی لہریں کہیں تیز ہو جاتی ہیں تو کہیں مدھم، لیکن ایک دھیمی دھیمی آنچ کا احساس ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ مجموعے کے افسانے طلاق، آخر میں نے پا لیا تجھے، سرجو، چھوٹی سی محبت، چال، بکھرے رنگ، ایسے افسانے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔

ڈاکٹر ایم۔ اے حق کی کتاب 'اونچی اُڑان' مختصر ترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ افسانچوں کے اس مجموعے میں کل باسٹھ افسانچے شامل ہیں۔ نصیحت، ترکیب، اخلاق، ٹریننگ، پہل، ذہانت، ناکام سازش، واہ !!!، معافی، حاضر دماغ، جوئے کا اڈا، تبدیلی، ضدی شہزادہ، شرمندگی، کھیل کھیل میں، گوگل، ہابیل اور قابیل، مہنگا فلیٹ، وندے ماترم، اسکیم، اوور اسمارٹ، بھول، دوراندیشی، سزا، باخبر، جیت، احتیاط، تدبیر، انوکھا فیصلہ، مذاق، نے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے۔ بچوں کی تربیت اور انھیں اردو ادب سے منسلک کرنے کے لیے ان افسانچوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ افسانچوں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں لانے کا منفرد کارنامہ ڈاکٹر تسلیم عارف نے بخوبی انجام دیا ہے ا فسانچوں میں سماج و معاشرے کے مقامات، تجربات مشاہدات کی تصاویر نظر آتی ہیں۔

2020 کا ناول

گذشتہ سال 2020 میں متعدد ناول شائع ہوئے۔ کئی نے ہمارے ذہنوں کو جھنجوڑ ڈالا جنھیں ہم بہت زمانے تک یاد رکھیں گے۔ کورونا کے اثرات پر بھی کئی ناول سامنے آئے ہیں۔ اس سال لکھے گئے متعدد ناولوں میں مردہ خانے میں عورت (مشرف عالم ذوقی) ہجور آما (شبیر احمد) ایک خنجر پانی میں (خالد جاوید) اللہ میاں کا کارخانہ (محسن خان) میں تمثال ہوں (عارفہ شہزاد) کا بُلبا کیہہ جاناں میں کون (ذکیہ مشہدی) سہیم (نجم الدین احمد) پچھل پیری (نعمان فاروقی) شہر مرگ (طاہرہ) شیلٹر۔ ہوم شیلٹر (افسانہ خاتون) موسیٰ (ڈاکٹر شفق سوپوری) وقت قیام (مشتاق انجم) چلڈرنس فارم (ایم مبین) دھول دیپ (یعقوب یاور) کڑوے کریلے (ثروت خان) سوووزیاں کے درمیان (خالد فتح محمد) کورونا ایٹ واریٹ سکسٹی ڈگری (اختر آزاد، پی ڈی ایف فارم) وغیرہ۔

'ایک خنجر پانی میں' خالد جاوید کا ناولٹ ہے۔ ناول کا موضوع بظاہر پانی کے مسائل ہیں۔ لیکن خالد جاوید نے پانی کو زندگی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور پانی کے لیے جدید فلیٹ نما زندگی میں جو مشکلات اور مصائب بالواسطہ اور بلاواسطہ انسانی زندگی میں در آتے ہیں، ان کو اپنے مخصوص بیانیے اور فلسفیانہ انداز کے ساتھ اس طور پیش کیا ہے کہ ان کے پرانے ناولوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ خود خالد جاوید اپنے ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ یقیناً موت کی تیسری کتاب ہے۔ جو دراصل بہتے ہوئے وقت اور پانی کی کتاب بھی ہے۔

اس ناول کا موضوع یتیم خانے، شیلٹر ہوم اور اس طرح کے ادارے ہیں۔ گذشتہ برسوں بہار میں شیلٹر ہومز کے شرمناک واقعات منظر عام پر آئے تھے۔ جس میں سیاسی، رہنماؤں کی کالی کرتوتوں کو خاص شہرت ملی تھی۔ یہ واقعات عورتوں کے شیلٹر ہومس میں زیادہ ہوئے تھے۔ افسانہ خاتون نے عورتوں کے ساتھ ہونے والے عبرت ناک واقعات کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہوئے پردے کے پیچھے کے سچ کو بے نقاب کیا ہے۔

ناول 'مردہ خانے میں عورت' بھی ان کے سابقہ انداز کا ایک کھلا بیان ہے۔ نئے عہد میں کوئی داستان گو کس طرح کی داستان لکھے گا۔ طلسم ہوشربا، کا ملک کے پس منظر میں از سرِ نو لکھے جانے کا کیا انداز ہوگا یہ مردہ خانے میں عورت کو پڑھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔

'میں تمثال ہوں' عارفہ شہزاد کا ناول ہے جو متعدد عشقیہ قصوں پر مبنی ہے۔ پورے ناول میں سات عشقیہ قصے بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں مختلف نشیب و فراز ہیں کہیں بچپن کے واقعات ہیں تو کہیں جوانی کے قصے مصنفہ کی تعریف کرنی چاہیے کہ اس نے ان قصوں کا بیان حقیقت پسندانہ کیا ہے۔

'ہجور آما' بنگال کے مشہور ومعروف فکشن نگار شبیر احمد کا پہلا ناول ہے جسے بنگال کے پس منظر میں لکھی گئی ایک ایسی عشقیہ داستان ہے جو سیاسی اور سماجی نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی زندگی کی دھوپ چھاؤں کو پیش کرتی ہے۔ ناول میں خواب، خوابوں کی تعبیر فرائڈ کے جنسی نظریات کارل مارکس کا سماجی نظریہ، بنگال کی سیاست کا لال رنگ اور بنیادی سہولیات کے فقدان میں زندگی گزارتے آدی واسی وغیرہ کو اس طور ناول کیا ہے کہ واقعہ در واقعہ ہجور آما کا سحر کاری کو انگیز کرتا رہتا ہے۔ ویب نینا کے برج گھرجی اور باز احمد کی شکل میں کئی عمدہ کردار اور ناول نے ہمیں دیے ہیں۔

'دھول دیپ' یعقوب یاور کا تحریر کردہ دلچسپ ناول ہے۔ یعقوب یاور نے اسے بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ دراصل یہ ناول بھی گجرات کے تاریخی مقامات کا تقریباً سات ہزار سال پرانا قصہ اور معاشرہ ہے۔ ایسے میں مصنف کا تخیل اگر اس کی صحیح رہنمائی کرے تو بعض ایسے کردار اور قصے سامنے آتے ہیں جو زمانے تک ہماری یاد کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ دھول دیپ یعقوب یاور کا ایک شاہکار ناول ثابت ہوگا۔

'اللہ میاں کا کارخانہ' محسن خان کا پہلا ناول ہے۔

ناول کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی سال میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ایم۔آر سی پبلی کیشن اور دوسرا ایڈیشن عرشیہ پبلی کیشن دہلی کے زیر اہتمام بڑے خوبصورت گیٹ اپ میں شائع ہوا ہے۔

'اللہ میاں کا کارخانہ' محسن خان کے تجربات و مشاہدات اور بیانیہ کے سبب ایک منفرد ناول کے طور پر سامنے آیا۔ یہ دراصل عام زندگی کی کہانی ہے جس میں انسانی بستیوں کے ساتھ ساتھ قبرستان بھی ایک کردار کے طور پر موجود ہے۔ ناول کا بیانیہ اس قدر پختہ اور مستحکم ہے کہ واقعات در واقعات ناول قاری کو اپنی گرفت میں لیتا چلا جاتا ہے۔

'چلڈرنس فارم' دراصل ایم مبین کے ذریعے لکھا گیا بچوں کے لیے ایک اہم ناولٹ ہے۔ چلڈرنس فارم میں ثواب و گناہ، کفارہ، بے ضمیری جیسے جذبات سے پر کردار ہیں تو چلڈرن فارم کا یعنی یتیم خانے کا پس منظر ہے۔ یہ یتیم خانہ پارسیوں کا دکھایا گیا ہے لہٰذا ایم مبین نے پارسیوں کی زندگی، ان کی تہذیب اور رہن سہن کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

'کڑوے کریلے' ڈاکٹر ثروت خان کا اس سال شائع ہونے والا نیا ناول ہے۔ دراصل ان کا خواتین کے استحصال پر لکھا گیا ایک عمدہ ناول ہے جس میں انہوں نے آج کی عورت کو جس کی نمائندگی سولی کر رہی ہے۔ آج کی عورت کو ظالم اور ہوس زدہ انسانوں کے بُرے کارناموں کی نذر ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔

'سوودزیاں کے درمیاں' خالد فتح محمد کا ایک اہم ناول ہے۔ 2020 میں شائع ہونے والے اس ناول 'سوودزیاں کے درمیاں' میں نئی تکنیک نئے رنگ اور سماج و معاشرے کی سچی تصاویر نظر آتی ہیں۔ ناول کے کرداروں کے ذریعے خالد فتح محمد نے عوامی زندگی کے نشیب و فراز کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

خالد فتح محمد نے اس ناول کے ذریعے عام انسانوں کے دکھ درد اور غموں کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔

2020 کی فکشن تنقید

2020 میں متعدد تنقیدی کتابیں شائع ہوئیں کچھ کتابیں ترتیب شدہ ہیں۔ کچھ شخصیات پر مبنی ہیں اور کچھ خالصاً تنقید کا حق ادا کرتی ہیں۔ اس سال شائع ہونے والی خاص کتابوں میں راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری (ڈاکٹر پرویز شہریار) اردو فکشن کے پانچ رنگ (پروفیسر اسلم جمشید پوری) شین مظفر پوری (ڈاکٹر ابوبکر رضوی) اسرار گاندھی کے تخلیقی اسرار (پروفیسر اسلم جمشید پوری) گاہے گاہے بازخواں (سلام بن رزاق) اردو فکشن تعبیر و تفہیم (ڈاکٹر کہکشاں عرفان) جوگندر پال: دید و نادید (حمید سہروردی) ذکی انور شخصیت فن اور تنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر اختر آزاد) فکشن تنقید، تکنیک و تفہیم (ڈاکٹر منور حسن کمال) عصمت چغتائی روایت شکنی سے روایت سازی تک (ڈاکٹر فرزانہ کوکب) اردو افسانے میں دلت مسائل (ڈاکٹر نزہت پروین) اظہار الاسلام شخصیت اور فن (ڈاکٹر فاروق اعظم) مرگ انبوہ (مشرف عالم ذوقی) آزادی کے بعد اردو فکشن (ڈاکٹر محمد سلمان بلرامپوری) سیمانچل کے افسانہ نگار (احسان قاسمی) اردو افسانوں میں مسائل نسواں کی عکاسی (ڈاکٹر نورالصباح) اکیسویں صدی کی دہلیز پر اردو کے اہم ناول (رحمٰن عباس) وغیرہ۔

'اردو فکشن تعبیر و تفہیم' ڈاکٹر کہکشاں عرفان کی فکشن تنقید پر پہلی کتاب ہے۔ اردو فکشن تعبیر و تنقید میں ڈاکٹر کہکشاں کے تقریباً 15 مضامین شامل ہیں۔ کتاب کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں پریم چند سے ترقی پسند فکشن نگار، پھر 1970 کے اہم فکشن نگاروں، غضنفر، اسرار گاندھی سے لے کر اکیسویں صدی کے معروف افسانہ نگار فکشن نگار، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری اور جدید تر نسل کے ڈاکٹر محمد مستمر کے فن پر کہکشاں عرفان نے کھل کر بحث کی ہے۔

'جوگندر پال: دید و نادید' حمید سہروردی کے قلم کا کمال ہے۔

کتاب ہذا میں جوگندر پال کی زندگی، ان کا ادبی سفر، افسانہ، افسانچہ، ناول، ناولٹ، ڈرامہ، اور تنقید وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی جوگندر پال کے منتخب افسانے، افسانچے اور ڈرامے بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔

'ذکی انور کی شخصیت و فن' ڈاکٹر اختر آزاد کی تازہ ترین تنقیدی و تحقیقی کاوش ہے جو کتاب ہذا میں اختر آزاد نے اپنے زمانے کے مقبول و معروف فکشن نگار ذکی انور کی 'شخصیت و فن' کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ذکی انور کے تقریباً انیس افسانوں کا تجزیہ کیا ہے ساتھ ہی ذکی انور کے آٹھ اہم افسانوں کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب ذکی انور شناسی میں سنگ میل ثابت ہوگی۔

'شین مظفر پوری' ڈاکٹر ابوبکر رضوی کا تحریر کردہ فردنامہ (Monograph) ہے۔ انھوں نے شین مظفر پوری کے حالات زندگی، افسانہ نگاری، ناول نگاری، ریڈیائی ڈرامے، طنز و مزاح نگاری، یادداشت، صحافت وغیرہ موضوعات کے تحت خاصا مواد فراہم کیا ہے۔ آپ نے شین مظفر پوری کے تین افسانے، ناول کا ایک باب، انشائیہ، خاکہ اور اداریہ کے نمونے بھی شامل کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کتابیات کے تحت شین مظفر پوری کی کتابوں کو شامل کیا ہے۔

'راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری' ڈاکٹر پرویز شہریار کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ یہ کتاب بیدی فہمی میں اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے راجندر سنگھ بیدی کے سوانحی کوائف، بیدی کے افسانوں کے فکری سروکار، بیدی کا افسانوی فن، کردار نگاری، اسلوب اور زبان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی بیدی کے مشہور افسانوں، اپنے دکھ مجھے دے دو، لاجونتی، جوگیا وغیرہ افسانوں کے تجزیے بھی شامل کیے ہیں۔

'گاہے گاہے بازخواں' (اردو کے کلاسیکی افسانے اور ان کے تجزیے) مشہور و معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق کی اہم تنقیدی کتاب ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز نے اسے شائع کیا ہے۔

اس کتاب میں پوس کی رات، ٹھنڈا گوشت، دوفرلانگ لمبی سڑک، لاجونتی، جڑیں نظارہ درمیاں ہے، مورنامہ، گاڑی بھر رسد، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، آگ کے پاس بیٹھی عورت، ہزاروں سال لمبی رات، پیتل کا گھنٹہ جیسے کلاسیکی اور عمدہ افسانوں کے تجزیے ہیں۔ ایک فنکار یا افسانہ نگار جب افسانوں کے تجزیے کرتا ہے تو وہ افسانے کے ہر پہلوؤں کا خیال رکھتا ہے۔ ہر طرح سے افسانہ سمجھنے اور سمجھانے کا کام کرتا ہے۔ افسانے کے جھول کی طرف بھی اشارے کرتا ہے۔ ایسے تبصروں کو ہم تخلیقی تنقید میں شامل کرتے ہیں۔ اس طور دیکھا جائے تو سلام بن رزاق نے ان تجزیوں کے ذریعے عمدہ تخلیقی تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے۔

'فکشن تنقید تکنیک و تفہیم' ڈاکٹر منور حسن کمال کی تازہ ترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر منور حسن کمال نے مشرف عالم ذوقی کے ناولوں اور افسانوں پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا ہے۔ مضامین کی ترتیب و تہذیب کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ دراصل یہ کتاب ذوقی فہمی میں معاون ثابت ہوگی۔

'اردو افسانہ میں دلت مسائل' ڈاکٹر نزہت پروین کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔

انھوں نے اس کتاب میں ابتدا سے لے کر موجودہ افسانوی منظرنامے تک پینتالس دلت افسانوں کا انتخاب شامل کیا ہے۔ ساتھ ہی بہت سے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔ اردو افسانہ میں دلت مسائل ہندوستان میں دلتوں کی سیاسی و سماجی صورت حال جیسے موضوعات پر بھی

نزہت پروین نے خاطر خواہ بحث کی ہے۔اپنے موضوع پر یہ اب تک کی پہلی اور عمدہ کتاب ہے۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کی کتاب 'اظہار الاسلام: شخصیت اور فن' افسانے کی تنقید کے تعلق سے بہت اہم کتاب ہے۔اظہارالاسلام شناسی کے تعلق سے اس کتاب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔مغربی بنگال کے منفرد افسانہ نگار اظہارالاسلام پر مربوط یہ تنقیدی اور تحقیقی کام ڈاکٹر محمد فاروق اعظم کا منفرد کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر محمد فاروق نے ابتدا میں 'اپنی بات' کے علاوہ اظہارالاسلام کا 'سوانحی خاکہ' اور 'اظہارالاسلام میری نظر میں' تحریر کیا ہے۔صاحب کتاب کی تحریر کے علاوہ ممتاز ناقدین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی،مشرف عالم ذوقی، رونق نعیم، ڈاکٹر سید عارفی، ڈاکٹر علی حسین شائق،نصراللہ نصر، ڈاکٹر سید قمر صدیقی وغیرہ نے اظہار الاسلام کی شخصیت،فن اور افسانہ نگاری کے تعلق سے پر مغز مضامین تحریر کیے ہیں جن کو ڈاکٹر محمد فاروق اعظم نے نہایت فنکارانہ انداز سے کتاب میں یکجا کیا ہے۔

'آزادی کے بعد اردو فکشن تنقید' ڈاکٹر محمد سلمان بلرامپوری کی تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے۔محمد سلمان بلرامپوری کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں انہوں نے آزادی کے بعد کے فکشن ناقدین اور ان کے کاموں پر کھل کر بحث کی ہے۔پانچ ابواب میں تقسیم اس کتاب کے پہلے باب میں فکشن تنقید کے بنیادی مسائل پر گفتگو کی ہے۔دوسرے باب میں ترقی پسند تنقید اور اردو فکشن کا مطالعہ،تیسرے باب میں نئی تنقید اور فکشن کا مطالعہ،چوتھے باب میں آزادی کے بعد اردو فکشن کا تجزیاتی مطالعہ اور پانچویں باب میں آزادی کے بعد اردو فکشن کے اہم ناقدین پر گفتگو کی ہے۔محمد سلمان بلرامپوری نے آزادی کے بعد کے اہم ناقدین میں شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، حافظ سہیل، مہدی جعفر، وہاب اشرفی، پروفیسر خورشید احمد،مرزا حامد بیگ،شمیم حنفی،ابوالکلام قاسمی اور معین الدین جینابڑے پر گفتگو کی ہے۔اس فہرست میں چند اور نام شامل ہو سکتے تھے مثلاً پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر انوار احمد، صغیر افراہیم،ارتضیٰ کریم،محمد حمید شاہد،علی احمد فاطمی۔

'سیمانچل کے افسانہ نگار' معروف شاعر اور ناقد محترم احسان قاسمی کی 'سیمانچل ادب گہوارہ' سیریز کی پہلی کتاب ہے جس میں سیمانچل کے متعدد افسانہ نگاروں، رفیع حیدر انجم،عبدالمنان، معین الدین احمد، شمس جمال، مشتاق احمد نوری، احسان قاسمی، جمشید عادل، نیلوفر پروین، پرمود بھارتیہ،کلام حیدری،شبیہہ مشہدی،علی امام وغیرہ تقریباً تئیس افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں سیمانچل میں مستقل سکونت اختیار کرنے والے افسانہ نگار، کچھ دن قیام کرنے والے افسانہ نگار اور ملازمت کرنے والے افسانہ نگار شامل ہیں۔

رسائل کے فکشن نمبر

2020 میں متعدد رسائل کے فکشن نمبر شائع ہو چکے ہیں کچھ ناول نمبر، کچھ افسانہ نمبر اور کچھ شخصیات پر مبنی ہیں۔اس سال شائع ہونے والے خاص فکشن نمبر میں لوح، ادب سلسلہ،شاعر، چہار سو وغیرہ نے قارئین کو کافی متاثر کیا۔کتابی سلسلہ ششماہی 'لوح' اپنی نوعیت کا مختلف ومنفرد رسالہ ہے جس کے مدیر ممتاز احمد شیخ ہیں۔'لوح' نے دنیا بھر کے اردو رسائل میں اپنا الگ مقام بنالیا ہے۔اس کا ہر شمارہ کسی نہ کسی موضوع پر مشتمل خاصا ضخیم ہوتا ہے۔

تازہ شمارہ 'ناول' پر ایک خاص شمارہ ہے جو تقریباً پونے آٹھ سو صفحات پر پھیلا ہے۔'لوح' کے ناول نمبر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ناول کی تاریخ یعنی ابتدا سے لے کر موجودہ عہد یعنی بیسویں صدی کے مشہور ومعروف ناولوں کے منتخب ابواب شامل کیے گئے ہیں۔ساتھ ہی مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر رشید امجد، مشرف عالم ذوقی، محمد حمید شاہد، ڈاکٹر امجد طفیل، ڈاکٹر محمد اشرف کمال کے منفرد مقالات ومضامین اور ناول کی ابتدا، ارتقا، بیسویں صدی کے اہم ناول اور نئے ناول کے سفر کو عمدگی سے سمیٹا ہے۔

لوح کا یہ شمارہ طالب علموں، ریسرچ اسکالر، اساتذہ اور شائقین ناول کے لیے کارآمد اور یادگار شمارہ ہے۔

'ادب سلسلہ' کا ایک خصوصی شمارہ افسانہ نمبر کی شکل میں سامنے آیا ہے۔اس کے مدیر محمد سلیم علیگ اور مہمان مدیر راقم ہے۔ اس شمارے میں اردو افسانہ اور ناول کی صورت حال اور مستقبل کے تعلق سے بارہ مضامین شامل ہیں۔ساتھ ہی سلسلۂ افسانہ کے تعلق سے بارہ افسانوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔آخر میں اردو ناول اور افسانوں کے تعلق سے ایک دلچسپ سوال نامہ مع جوابات شامل ہے۔

شاعر کا اکتوبر 2020 کا شمارہ افسانہ نمبر کی شکل میں سامنے آیا ہے۔اس میں اردو کے عالمی افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔اس افسانہ نمبر میں تقریباً بیس افسانے شامل ہیں۔یہ افسانہ نمبر نئے افسانہ نگاروں کی خصوصاً نمائندگی کرتا ہے۔'شاعر' کا یہ مشن رہا ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے۔شاعر کی یہ خوبی اس کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔

معروف رسالہ 'چہار سو' کے ستمبر۔اکتوبر کے شمارے میں صادقہ نواب سحر پر ایک گوشہ شامل ہے۔رسالے کے مدیر گلزار جاوید ہیں جو گذشتہ تین دہائیوں سے رسالہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہر شمارے میں کسی ادیب یا شاعر پر گوشہ ضرور شائع کرتے ہیں۔ادبی رسائل کی بھیڑ میں چہار سو کا اپنے گوشوں کے حوالے سے ایک منفرد مقام ہے۔تازہ ترین شمارہ ستمبر اکتوبر 2020 میں گوشۂ صادقہ نواب سحر شائع ہوا ہے۔اس گوشے میں تقریباً پندرہ مضامین، ان کے فن اور شخصیت پر شامل ہیں ساتھ ہی ایک ڈرامہ چڑیا کا بچہ گیا کہاں اور ایک افسانہ منت بھی شامل ہے۔ناول ''راجدیو کی امرائی'' کا ایک باب بھی گوشے کی زینت بنا ہوا ہے۔

سوشل میڈیا پر اردو فکشن

جوں جوں کمپیوٹر اور موبائل ہماری زندگی کا لازمی جزو بنتے جا رہے ہیں اور کورونا کی وجہ سے بہت ساری آف لائن سرگرمیاں آن لائن ہونے لگیں تو ادب کی صورت حال بھی تبدیل ہونے لگی ہے۔فکشن کی ہی بات کی جائے تو اب فیس بک پر بہت سے گروپ نہ صرف کہانیوں کا مقابلہ کرا رہے ہیں بلکہ افسانوں کے وائس ایڈیشن voice edition بھی آنے لگے ہیں۔اردو افسانہ، وولر،اردو ادبی فورم، عالمی افسانہ فورم (وحید قمر) اردو افسانہ (صدف اقبال) اشتراک ڈاٹ کام،صدا پارے، لفظ نامہ ڈاٹ کام، اردو فکشن یو ٹیوب چینل، جموں وکشمیر فکشن رائٹرس گلڈ، انہماک انٹرنیشنل فورم (سید تحسین گیلانی) عالمی اردو فکشن (ڈاکٹر ریاض توحیدی) جیسے بہت سے گروپ فیس بک پر افسانوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔اسی طرح افسانچے کے فروغ میں بھی بہت سارے افسانچہ گروپ حصہ لے رہے ہیں۔انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن (نخشب مسعود) عالمی افسانچہ اکیڈمی (ڈاکٹر ایم۔اے حق) دنیائے افسانچہ (پرویز بلگرامی) گلشن افسانچہ (رونق جمال) وغیرہ پر متعدد افسانچے آواز کی صورت میں لوڈ ہو رہے ہیں۔

واٹس اپ پر بھی کئی گروپ افسانے اور افسانچے کے فروغ میں مستقل اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بزم افسانہ (سلام بن رزاق) اور افسانہ وافسانچہ گروپ (محمد علیم اسماعیل) بزم شارر (جاوید نہال حشمی) افسانچے ہی افسانچے وغیرہ کی کاوشوں سے سوشل میڈیا پر افسانے کے ساتھ افسانچوں کی بھی بہار آئی ہوئی ہے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
Dept of Urdu,
Chaudhary Charan Singh University, Ramgarhi
Meerut 250001 (UP)
E-mail aslamjamshedpuri@gmail.com
Mob.8279907070

بچوں میں تحصیل زبان سے متعلق نفسیاتی نظریات

آفاق ندیم خان

تعارف:

بچوں میں زبان کی تحصیل اور نشوونما کیسے ہوتی ہے؟ اس تعلق سے علم نفسیات کے شعبے میں مختلف ماہرین نفسیات نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ نفسیات کے شعبے میں بچوں میں تحصیلِ زبان کے تعلق سے چار نظریات بہت اہمیت کے حامل مانے جاتے ہیں۔ یہ نظریات بالترتیب وقوفی (Cognitivist)، برتاوی (Behaviourist)، تعاملی (Interactionist) اور مقامی (Nativist) نظریات ہیں۔ ان نظریات میں نوم چومسکی کا مقامی نظریہ شعبہ نفسیات میں سب سے زیادہ مقبول اور معروف ہے۔ نوم چومسکی سے پہلے مختلف ماہرین نفسیات جس میں جین پیاجے، وائیگوٹسکی، اسکنر، بینڈورا اور برونر کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے بچوں میں زبان کی تحصیل اور نشوونما کے تعلق سے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اس مضمون میں جین پیاجے، وائیگوٹسکی اور اسکنر کے نظریات کا عمومی جائزہ پیش کرتے ہوئے نوم چومسکی کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون کا مقصد والدین، سرپرست بشمول زبان کے معلم اور بچوں کی تعلیم وتربیت سے منسلک افراد کو تحصیلِ زبان کے مختلف عوامل کا ادراک کرانا ہے جس سے کہ وہ بچوں کی زبان کی تحصیل اور نشوونما میں اپنا کلیدی کردار ادا کرسکیں۔

جین پیاجے کا نظریہ:

جین پیاجے (1896-1980) ایک مشہور ماہر نفسیات تھے جن کا تعلق سوئٹزرلینڈ سے تھا۔ وہ علم الحیوانات میں تربیت یافتہ تھے۔ جب وہ الفرڈ بنے کی تجربہ گاہ میں ذہانتی آزمائش پر کام کر رہے تھے اس وقت ہی انھوں نے بچوں کی وقوفی نشوونما پر بھی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ 1922-23 کا زمانہ تھا۔ انھوں نے 1923 سے 1932 کے درمیان پانچ کتابیں شائع کیں جس میں انھوں نے وقوفی نشوونما کے نظریات کو پیش کیا۔ وقوفی نشوونما سے مراد ایسے عوامل سے ہے جس میں غور وفکر، ادراک اور مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت شامل ہوتی ہے۔ عام زبان میں وقوفی عمل کو ذہنی عمل کہتے ہیں۔ وقوفی نشوونما سے مراد قوت تفہیم، قوت حافظہ، قوت استدلال اور ذہانت وغیرہ کی نشوونما سے ہے۔ وقوف وہ ذہنی شے ہے جس کے ذریعے کسی چیز، امر واقع یا حالات کی تفہیم ہوتی ہے یا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس زمرے میں ادراک، استدلال، تصورات اور قوت فیصلہ جیسے ذہنی عوامل شامل ہوتے ہیں۔ پیاجے کا نظریہ تھا کہ زبان کی نشوونما کا براہ راست تعلق انسان کی وقوفی نشوونما سے ہے۔ پہلے خیالات کی تشکیل ہوتی ہے اس کے بعد زبان کی تحصیل ہوتی ہے۔ یعنی بچے کے آس پاس جو بھی افراد، اشیا یا چیزیں ہوتی ہیں ان کے بارے میں اس کا خیال اس کے ذہن میں تشکیل پا چکا ہوتا ہے، لفظوں کا استعمال کر کے اپنے خیالات کا اظہار بچہ بعد میں سیکھتا ہے۔ جیسے بچہ گلاس کو منھ سے لگاتا ہے، فون کو کان سے لگاتا ہے، ٹوپی کو سر سے لگاتا ہے، جوتے میں پیر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وغیرہ۔ یعنی اس کے عمل سے اس کے خیالات کا ظہور ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کی زبان کی نشوونما ابھی ناپختہ ہے اس لیے وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوتا ہے۔ پیاجے کے مطابق زبان کی نشوونما وقوفی نشوونما سے بالکل منفرد اور آزاد ہے۔ یعنی زبان کی نشوونما کا اثر وقوفی نشوونما پر نہیں ہوتا ہے بلکہ وقوفی نشوونما کا اثر زبان کی نشوونما پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم بچوں کی زبان کی نشوونما کو رفتار فراہم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس کی وقوفی نشوونما کرنی ہوگی۔

وائیگوٹسکی کا نظریہ:

وائیگوٹسکی (1896-1934) کا شمار شعبہ نفسیات میں ایک تشکیلی مفکر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ان کا تعلق روس سے تھا۔ انھوں نے انسانی ثقافت اور حیاتی سماجی نشوونما کا نظریہ پیش کیا۔ وائیگوٹسکی بچوں کی وقوفی نشوونما میں سماج اور اس کے ثقافتی تعلقات کے درمیان تعامل کو بہت اہم مانتے ہیں۔ پیاجے کی طرح وائیگوٹسکی یہ مانتے تھے کہ بچے علم کی تخلیق خود کرتے ہیں لیکن ان کے مطابق وقوفی نشوونما علیحدہ طور پر نہیں ہوسکتی ہے بلکہ یہ زبان کی نشوونما، سماجی نشوونما حتیٰ کہ جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ سماجی- ثقافتی ماحول کے ضمن میں ہوتی ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ عمر کے ابتدائی دو سال میں خیالات اور زبان بالکل علیحدہ ہوتے ہیں، دونوں کا ایک دوسرے سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا ہے۔ یعنی خیالات اور زبان ایک دوسرے سے آزاد ہوتے ہیں۔ دو سال کے بعد دونوں کا ایک دوسرے میں انضمام ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونے پر زبان کی نشوونما کا اثر انسان کی وقوفی نشوونما کو متاثر کرتا ہے۔ وائیگوٹسکی نے خود کلامی کو بہت اہمیت کا حامل بتایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچہ خود کلامی کر کے خود کو ہدایت دیتا ہے۔ وہ خود وہی اپنی سرگرمیوں کی ہدایت کاری کرتا ہے۔ کھیلتے وقت، پڑھتے وقت، کھانا کھاتے وقت خود سے بات کر کے اپنے عمل کو بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وائیگوٹسکی نے پیاجے کی اس بات کی تائید کی کہ وقوفی نشوونما کے لیے زبان کی نشوونما ناگزیر ہے۔ لیکن اس بات سے انکار کیا کہ زبان کی نشوونما وقوفی نشوونما پر منحصر ہوتی ہے۔ وائیگوٹسکی کے مطابق زبان کی نشوونما وقوفی نشوونما پر منحصر نہیں ہوتی ہے بلکہ وقوفی نشوونما زبان کی نشوونما پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے اگر ہم بچوں کی وقوفی نشوونما کو رفتار فراہم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس کی زبان کی نشوونما کرنی ہوگی۔ زبان کی نشوونما کے لیے بچے کو یہ موقع فراہم کرنا چاہیے کہ وہ سماج اور اس کے ثقافتی تعلقات کے درمیان تعامل میں سرگرم ہو کر شریک ہو۔ ایسے بچے جنھیں مثبت سماجی اور ثقافتی مواقع حاصل ہوتے ہیں ان میں زبان کی نشوونما کی رفتار زیادہ ہوتی ہے۔

اسکینر کا نظریہ:

اسکینر (1902-1990) ایک امریکی ماہر نفسیات تھے، انھوں نے اکتساب کا عملی مشروط نظریہ پیش کیا۔اس نظریے کے مطابق جب کسی عمل کے بعد کوئی تقویت فراہم کرنے والا محرک ملتا ہے تو اُس عمل کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ان کے مطابق زبان کی نشوونما میں بھی تقویت کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ جب بچہ زبان کا استعمال کرنا سیکھتا ہے اس وقت اگر اسے تقویت فراہم کی جائے تو زبان سیکھنے کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔اسکینر نے بتایا کہ بچے چیزوں کو اس کے مفہوم کے ساتھ مربوط کرتے ہیں۔انھوں نے زبان کی نشوونما کے تعلق سے اپنی کتاب 'Verbal Behaviour' میں اپنا نظریہ پیش کیا۔اسکینر کے مطابق عمل کرنا مخلوق کی حیاتیاتی جبلت ہے۔ جب اسے کوئی حیاتیاتی یا ماحولیاتی ضرورت، جسے نفسیات کی زبان میں محرکہ یا تحریک کہتے ہیں، محسوس ہوتی ہے تو وہ خود بہ خود سرگرم ہو جاتا ہے۔عمل کے نتیجے کے طور پر حاصل کامیابی سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔تقویت سے سیکھنے کا عمل تیز ہوتا ہے اور سیکھنے والا بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔مختلف تجربات سے حاصل حقائق کی بنیاد پر اسکینر نے تحصیل زبان سے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظریہ زبان سیکھنے کے لیے محرکہ (Stimulus) کی جگہ تحریک (Motivation) کو ضروری مانتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے بچوں کو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے لیے متحرک کرنا چاہیے۔ ان کے سامنے محرکہ کی صورت میں واضح مقصد رکھنا چاہیے۔ جب بچے کو زبان کا استعمال کرنے سے تسلی بخش نتائج حاصل ہوتے ہیں تو وہ اپنے اس عمل کو بار بار دہراتے ں ہے اور بالآخر زبان سیکھ جاتے ہیں۔ اسکینر نے اس نظریے کی بنیاد پر سلسلہ وار تدریس (Programmed Instruction) کو فروغ دیا جو زبان سیکھنے میں بہت معاون ہے۔ اس طرح کی تدریس میں سکھائے جانے والے مواد کو چھوٹے چھوٹے مراحل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔صحیح جواب بچوں کے لیے تقویت کا کام کرتے ہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے مراحل کو یکے بعد دیگرے سیکھتے ہوئے مکمل مواد کو سیکھ جاتے ہیں۔متحرک مشروطیت سے بچوں کے طرز عمل میں مطلوبہ تبدیلی لائی جاسکتی ہے، شرمیلے بچوں کی جھجک کو دور کیا جاسکتا ہے اور کند ذہن بچوں کو پڑھایا اور سکھایا جاسکتا ہے۔

نوم چومسکی کا نظریہ:

ابراہم نوم چومسکی 7 دسمبر 1928 کو امریکہ میں پیدا ہوئے۔مغربی دنیا میں وہ موجودہ زمانے کے ماہر لسانیات، فلسفی، مورخ، سیاسی مصنف کی حیثیت سے کافی مقبول ہیں۔ 92 سالہ نوم چومسکی، میناچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے شعبہ لسانیات کے سبکدوش پروفیسر ہیں۔اس ادارے سے تقریباً 50 سالوں تک وابستہ رہتے ہوئے اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ چومسکی کو لسانیات میں تولیدی قواعد کے اصول Principle of (Generative Grammer) اور بیسوی صدی کی لسانیات (Linguistics) کا بانی کہا جاتا ہے۔ 1967 میں انھوں نے نفسیات کے شہرت یافتہ ماہر نفسیات بی۔ایف اسکینر کی کتاب Verbal Behaviours کی تنقید لکھی جس نے 1950 کی دہائی میں وسیع طور پر قبول کیے جا چکے برتاوی نظریہ کو چیلنج کیا۔اس سے انھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔چومسکی کے نظریے کے بعد نفسیات کے شعبے میں وقوفی نظریے میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔اس سے نہ صرف نفسیات کا مطالعہ اور تحقیق متاثر ہوئی بلکہ لسانیات، عمرانیات اور مطالعہ انسانیات میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

چومسکی نے تحقیق کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ زبان انسان کی خداداد (Innate) صلاحیت ہے۔ان کی مشہور تصنیف زبان اور ذہن (Language & Mind) 1972 میں شائع ہوئی۔اس کتاب کے ذریعے چومسکی نے زبان سیکھنے کے نظریے پر روشنی ڈالی۔انھوں نے اپنی کتاب میں تحریر کیا کہ جب ہم انسانی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو دراصل ہم انسانی جوہر (Human essence) کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ انسانی جوہر دماغ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ہے جنھیں تاحال ہم جان سکے ہیں اور یہ امتیازی خصوصیت انسانوں کو دوسروں سے جدا کرتی ہے۔یعنی انسان اس بے مثل خصوصیت کا تنہا حامل ہے۔ چومسکی کے مطابق تمام چیزوں میں زبان کی امتیازی خصوصیت ہے جو صرف انسانوں تک ہی محدود ہے۔چومسکی کے نظریے کے مطابق تمام زبانوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔ان کے مطابق بچوں کا لفظ یا زبان سیکھنا تقلید اور تحریک پر محیط ضرور ہے لیکن تقلید اور تحریک دونوں ہی بچوں کے ذریعے لفظوں کو سیکھنے کے عمل کو بہتر طریقے سے وضاحت نہیں کرتے ہیں۔ چومسکی اپنے نظریہ کی وضاحت ایک عددی ماڈل کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔

چومسکی کا خیال ہے کہ ہر بچے میں ایک تعمیر شدہ نظام (Built- In System) ہوتا ہے جسے لسانی تحصیلی آلہ (LAD- Language Acquisition Device) کہتے ہیں۔اس کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ بچہ زبان کا ترتیبی عمل کر سکتا ہے، گفتگو کو سمجھ سکتا ہے اور اسے بول بھی سکتا ہے۔چومسکی نے اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے ایک ماڈل پیش کیا۔ماڈل کے مطابق LAD کوئی جسمانی اعضا نہیں ہے بلکہ ایک قیاس (Analogy) ہے۔ بچہ جو کچھ بھی سنتا ہے اسے LAD کے ذریعے سمجھتا ہے، اسے دوبارہ بول سکتا ہے اور نئے الفاظ بھی بول سکتا ہے۔ دراصل LAD ایک مفروضاتی تصور ہے۔ انسان کے دماغ میں کوئی ایسا گوشہ یا آلہ (Device) نہیں ہوتا جس کے استعمال سے زبان سیکھی جا سکے بلکہ یہ ان لاکھوں کروڑوں عملیات کی تشریح وتوضیح میں مددگار ہے جو انسان کے دماغ میں ہوتے ہیں اور جو انسان میں زبان کے سیکھنے اور سمجھنے کی قوت پیدا کرنے میں معاون ہیں۔چومسکی نے اپنا یہ نظریہ 1950 کی دہائی میں پیش کیا۔انھوں نے ایک وسیع نظریہ مرتب کیا جسے آفاقی قواعد (Universal Grammer) کہا جاتا ہے۔یہ نظریہ انسان میں زبان سیکھنے کے عمل کی وضاحت پیش کرتا ہے۔

چومسکی کے مطابق ہر بچے میں لسانی تحصیلی آلہ (LAD) کی خداداد قوت پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے اور اس میں زبان کے بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بچے زبان کے اصول وضوابط کی استعداد کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں انھیں صرف الفاظ کا ذخیرہ حاصل کرنے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔اس نظریے کی وکالت کرتے ہوئے چومسکی نے کچھ ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنی نوع انسان کی زبان بنیادی طور پر ایک جیسی ہے۔ مثلاً ہر زبان میں فاعل، فعل، مفعول (Subject, Verb, Object) ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک زبان میں چیزوں کو منفی یا مثبت میں پیش کرنے کی خوبی ہوتی ہے۔ چومسکی نے یہ بھی دریافت کیا کہ جب بچے بولنا سیکھ رہے ہوتے ہیں تو وہ غلطیاں نہیں کرتے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔انھوں نے مثال کے ذریعے بتایا کہ بچے یہ سمجھ رکھتے ہیں کہ سبھی جملوں کی ایک ساخت ہوتی ہے جس میں فاعل، فعل، اور مفعول ہوتے ہیں اور بچے یہ اس وقت بھی سمجھتے ہیں جب وہ مکمل جملے نہیں بول پاتے ہے۔اپنے تجربات کی بنیاد پر چومسکی نے یہ بتایا کہ روانی کے ساتھ زبان کا استعمال کرنے کی سطح سے پہلے ہی بچے اپنے ماحول کے لوگوں کی زبان میں قواعد سے متعلق غلطیوں کی نشاندہی کر لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ بتایا کہ بچے ان الفاظ میں بھی قواعد کے اصول کو نافذ کرتے ہیں جن کے سلسلے میں قواعد کے

اصول مستثنیٰ (Exception) ہیں۔ مثال کے طور پر ہر بچہ ملک کی جمع ملکوں اور کتاب کی جمع کتابیں بتاتا ہے۔ جب کہ قواعد کے اصول کے تحت یہ غلط ہے (اصولاً ملک کی جمع ممالک اور کتاب کی جمع کتب ہے۔) لیکن بچے کا یہ بتانا آفاقی قواعد کے مطابق ہے۔

چومسکی کے نظریہ کی اہم باتیں:

چومسکی کے تحصیل زبان نظریہ کی ابتدا سنہ 1957 میں شائع ہونے والی ان کی کتاب 'Syntactic Structures' سے ہوئی مانی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے چومسکی نے سابقہ تشکیل شدہ ساختی ماہرین لسانیات کے نظریات کو چیلنج کر کے قابل تغیر قواعد کی بنیاد رکھی۔ اس قواعد نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ لفظوں کے مجموعے کا اپنا قاعدہ ہوتا ہے جسے رسمی قواعد کے طور پر موسوم کیا جا سکتا ہے۔ چومسکی کے نظریات کی مدد سے زبانوں کی تحصیل اور نشوونما کو سمجھنا نہایت آسان ہو گیا ہے۔ ان کے نظریے کی خاص باتیں درج ذیل ہیں:

1- اس نظریے میں تین چیزوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے:

i. لسانی تحصیلی آلہ (LAD-Language Acquisition Device)

ii. عالم گیر قواعد (UG-Universal Grammer) اور

iii. تولیدی قواعد کے اصول (Principle of Generative Grammer)

2 لسانی تحصیلی آلہ انسان کے دماغ میں ایک اعصابی نظام کی صورت میں ہوتا ہے جو زبان کی تحصیل میں معاون ہوتا۔ یہ آلہ مقرون صورت میں نہیں بلکہ مفروضاتی اور مجرد صورت میں ہوتا ہے۔

3 مفروضاتی لسانی تحصیلی آلہ انسان کے دماغ کے بائیں حصے میں منطق، ذخیرہ الفاظ، علامات اور استدلال کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔

4 لسانی تحصیلی آلہ کی بنا پر انسان لاشعوری، خودکار اور فطری طور پر زبان کو سیکھ جاتا ہے۔

5 تمام انسانوں کے اندر ایک عالم گیر قاعدہ ہوتا ہے، سبھی زبانوں میں ایک عالم گیر قواعد موجود ہے اور تمام زبان کی ساخت تقریباً مساوی ہوتی ہے جس میں فعل، فاعل اور مفعول ہوتے ہیں۔

6 سبھی زبانوں میں قواعد موجود ہیں اور یہ قواعد زبان کے عالم گیر قواعد سے باہم مربوط ہیں۔ تمام زبانوں کے بنیادی نحو (Syntax) تقریباً مساوی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان میں اگر انسان کو عبور حاصل ہو جائے تو اس کے لیے دوسری زبان سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

7 زبان کے قواعد کے بنیادی اصول بچے کا دماغ لاشعوری طور پر سیکھ جاتا ہے۔ دقیق اور مشکل جملوں کا استعمال بچے اکثر و بیشتر بغیر کسی لسانی خطا کے کرتے ہیں۔ اگر کوئی جملہ زبان سے غلط نکل جاتا ہے تو فوراً دماغ کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ آئندہ خودکار طور پر بچہ اس غلطی کی اصلاح کر لیتا ہے۔

8 تمام ثقافتوں میں بچوں میں زبان کی نشوونما کا ایک بالترتیب مرحلہ ہوتا ہے اور دنیا کے تمام خطے میں زبان کی نشوونما کا یہ مرحلہ تقریباً یکساں ہوتا ہے۔

9 بچے لاتعداد اطلاعات، اشیا، حقائق اور معطیات سے روبرو ہوتے ہیں انسان کے دماغ میں اعصابی صورت میں موجود لسانی تحصیلی آلہ ان معطیات کو قواعد کے اصولوں کے مطابق ایک لسانی مجموعے کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

10. انسان میں زبان سیکھنے کی پیدائشی خصلت ہوتی ہے۔ انسان کو زبان سکھائی نہیں جاتی ہے بلکہ تحصیل زبان کی پیدائشی خصلت ماحول ملنے پر انھیں خود بہ خود زبان سکھا دیتی ہے۔ یہ پیدائشی خصلت صرف انسانوں میں ہی پائی جاتی ہے۔

11. بچے نئی زبان سیکھتے نہیں ہیں بلکہ اس کی تحصیل خداداد لسانی آلات کے ذریعے فطری طور پر کرتے ہیں۔

12. انسان کی عمر کے ابتدائی پانچ سالوں میں لسانی تحصیلی آلہ بہت زیادہ سرگرم ہوتا ہے اس کے بعد اس کی قوت میں کمی آنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ نئی زبان سیکھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

13. یہ نظریہ اس بات کی مخالفت کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بچہ سادہ سلیٹ کی طرح ہوتا ہے وہ جو کچھ بھی سیکھتا ہے اپنے ماحول کے تعامل سے یا ماحول سے متحرک ہو کر سیکھتا ہے۔

14. انسان پیدائشی طور پر زبان سیکھنے کی استعداد کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان کی تحصیل توارثی طور پر ہوتی ہے بلکہ چومسکی کا نظریہ ہے کہ انسان زبان سیکھنے کی استعداد کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس استعداد کی معاونت سے وہ ماحول میں رہ کر زبان کو سیکھتا ہے۔

15. بچوں میں زبان سیکھنے کی رفتار بہت زیادہ ہوتی ہے بغیر کسی شعوری کوشش کے یہ فطری طور پر زبان سیکھ جاتے ہیں۔ زبان کی قواعد بھی بچے لاشعوری طور پر سیکھ جاتے ہیں۔ فطری تعاملی ماحول میں زبان کا استعمال کرنے سے زبان کی تحصیل ہوتی ہے۔

خلاصہ:

بچوں میں زبان کی تحصیل اور نشوونما سے متعلق نفسیات کے شعبے میں مختلف ماہرین نفسیات نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ تحصیل زبان کے تعلق سے چار نظریات بالترتیب وقوفی برتاوی، تعاملی اور مقامی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ وقوفی نظریے میں جین پیاجے کا نظریہ کافی اہم ہے ان کے مطابق زبان کی نشوونما وقوفی نشوونما پر منحصر ہوتی ہے۔ برتاوی نظریہ میں اسکینر کا نظریہ ہے کہ زبان کی نشوونما میں تقویت کا دخل سب سے زیادہ ہے۔ تعاملی نظریے میں خصوصاً بینڈورا اور برونر کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے مطابق زبان کی نشوونما بچوں کی خداداد استعداد اور ماحول دونوں کے تعامل پر منحصر ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس میں سماجی تناظر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نوم چومسکی کا مقامی نظریہ شعبہ نفسیات کا سب سے جدید، سب سے مقبول اور سب سے زیادہ سائنسی نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

مجملہ طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے مندرجہ بالا نظریات کی روشنی میں تحصیل زبان کو متاثر کرنے والے عوامل، تحصیل زبان کی رفتار میں اضافہ کرنے والی تدابیر اور تحصیل زبان کے لیے موزوں عمر سے متعلق حقائق کو سمجھ کر والدین سرپرست بشمول زبان کے معلم اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے منسلک افراد بچوں کی زبان کی تحصیل اور نشوونما میں اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

حوالے:

1. نجم السحر، صابرہ سعید، تدریس اردو، پریمئر پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، 2006
2. محی الدین قادری زور، تدریس اردو، یونیک بک میڈیا، شرینگر، 2006
3. Piaget, Jean. The Groeth of logical Thinking from Childhood to Adolescence. N.Y.: Basic Books, 1958.,
4. Singh, A.K. (2010). Educational Psychology. Patna: Bharti Bhawan Publishers and Distributors.
5. Kapil, H.K. (1991). Youth! Abnormal Psychology. Agra: Bhargava Publications.
6. Khan, N.A. & Husain S.M.(2019). Aspects of Educational Psychology: Aligarh. Educational Book House

■

Dr. Afaque Nadeem Khan
Assistant Professor
Maulana Azad National Urdu University
College of Teacher Education
Bhopal - 462001 (MP)

چراغِ جاں کی مدھم لو کے شاعر
مختار شمیم

رؤف خیر

مختار شمیم بنیادی طور پر شاعر ہیں اور شاعر ہر صنفِ سخن میں اپنے کارنامے چھوڑتا ہے چنانچہ آپ نے افسانے بھی لکھے جو پیام مشرق اور خاتونِ مشرق جیسے رسالوں میں شمیم سرونجی کے نام سے شائع ہونے لگے۔ ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے جو آل انڈیا ریڈیو بھوپال، اندور وغیرہ کی زینت بنے۔ فن خوش نویسی میں بھی اس قدر دخل رہا کہ نہ صرف اپنے شعری مجموعوں کی کتابت کرڈالی بلکہ بعد میں اپنے استاد ابو محمد سحر محترم کی کتاب کی کتابت بھی کی جس کی اشاعت میں شاگرد و استاد دونوں سرگرداں و سرگراں دکھائی بھی دیے۔

(ملاحظہ ہو'استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے' مرتبہ مختار شمیم، جون 2016)

ابتدائی دور میں 'خاتونِ مشرق' میں افسانوں کی اشاعت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ سیدھے سادے ہلکے پھلکے افسانے لکھا کرتے تھے وہ سرونج، بھوپال اور آس پاس کے علاقوں کے مشاعروں اور ادبی مجلسوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ ابتدا میں پانچ چھے سال تک اپنے عم محترم زبیر احمد راہی قاسمی سے غزلوں پر اصلاح لینے لگے اور یہ بھی اعتراف کیا: ''استاذی مکرم ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب نے میری ابتدائی دو تین غزلوں پر نہ صرف اصلاح فرمائی بلکہ رموزِ سخن سے بھی آشنا کیا۔''

(بحوالہ'مختار شمیم حیات اور ادبی کارنامے' مرتبہ ڈاکٹر محمد ناظم حسین)

مختار شمیم کی ابتدائی تعلیم ان کے مولد سرونج میں ہوئی جب وہ ٹونک کا حصہ تھا۔ ابھی ان کی عمر صرف گیارہ برس ہی کی تھی کہ سر سے والدہ کا سایہ اٹھ گیا۔ پھر ننھیال میں ان کی پرورش ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مختار شمیم بھوپال آگئے پھر حمیدیہ کالج بھوپال سے بی۔اے کیا۔ پہلے جغرافیہ میں ایم اے کیا پھر اردو سے ایم۔اے کیا۔ 1970 میں پبلک سروس کمیشن سے لکچرری پوسٹ کے لیے منتخب ہوئے اور گرلز کالج اجین کے شعبہء اردو میں تقرر عمل میں آیا۔ ملازمت کے ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور پروفیسر ابو محمد سحر کی نگرانی میں دادِ تحقیق دی اور 1987 میں 'ظہیر دہلوی حیات وفن' پر بھوپال یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی۔

راقم الدولہ ظہیر (1835-1911) کی 'داستانِ غدر' پر مختار شمیم نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ظہیر، ذوق دہلوی کے شاگرد تھے اور داستانِ غدر دراصل ظہیر کی خودنوشت سوانح ہے، جس کی اشاعت کی تفصیل شمیم صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ ظہیر دہلوی کے 1911 میں حیدرآباد میں انتقال کرجانے کے بعد 1914 میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ داستانِ غدر دراصل 1857 کے حالات کی عکاس ہے۔ چونکہ ظہیر کی زندگی کا کچھ حصہ قلعہ معلّٰی میں بھی گزرا سو وہاں کی کیفیات اور بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کی بے بسی کی روداد بھی اس میں بیان ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ داغ دہلوی کے خواجہ تاش تھے اور انہی کے ایماء پر حیدرآباد آئے تھے مگر ان کی ایسی پذیرائی یہاں نہ ہو پائی جس کے وہ مستحق تھے۔ 1910 میں وہ حیدرآباد آئے اور 1911 میں انتقال کر گئے اور دکن کی خاک میں آسودہ ہوئے ظہیر دہلوی کے یہ ضرب المثل اشعار ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں
چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

مختار شمیم پر پی ایچ ڈی کرکے سند حاصل کرنے والے محمد

ناظم حسین نے ان کے پانچ افسانوں پر مشتمل مجموعے 'پسِ غبار' میں شامل ہر افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔

1960 ہی کے آس پاس مختار شمیم نے شعر کہنا شروع کر دیا۔ سرونج، بھوپال اندور جیسے شعر و ادب کے علاقوں میں رہ کر ان کا شعر و ادب سے وابستہ ہونا تعجب خیز نہیں۔ انھوں نے شعر محض قافیہ پیمائی کی ضرورت پوری کرنے یا کسی طرحی مشاعرے میں داد بٹورنے کے لیے روایتاً نہیں کہے بلکہ اپنے اشعار میں اپنی زندگی کے حالات، تجربات و مشاہدات کو بیان کر کے اپنا اسلوب قائم کرنے کے جتن کیے ہیں۔ ان کے بعض اشعار حلقہء احباب میں بہت پسند کیے گئے جیسے

شبِ ہجراں چراغِ جاں کی لو مدھم نہیں کرتے
بہت ہم ٹوٹ کر روتے ہیں آنکھیں نم نہیں کرتے
دلِ ویراں میں بھی اک کربلا آباد رکھتے ہیں
بچھڑتی ہیں امیدیں اور ہم ماتم نہیں کرتے
ستارے توڑ لاتے ہیں کبھی جگنو سجاتے ہیں
درازیِ شبِ ہجراں کا سودا کم نہیں کرتے

خلیل الرحمٰن اعظمی کے گزر جانے کے بعد مختار شمیم نے چھے اشعار سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جن میں سے دو تین اشعار یہاں اس تاثر کے نمونے کے طور پر حاضر ہیں۔

وہ نکتہ چیں ہے مگر میرا معترف بھی ہے
تراشتا ہے تو کہتا ہے شاہ کار مجھے
مری اڑان نئے آسمان مانگے ہے
نئی زمینوں پہ اے فکر و فن اتار مجھے
بدن سے جیسے مری روح کھینچے جاتا ہے
شمیم کون چلا کر کے سوگوار مجھے

یوں تو بھوپال میں کئی شاعر پیدا ہوئے ہیں مگر میرے خیال میں محمد علی تاج بھوپالی کی انفرادیت اپنی جگہ مسلمہ

ہے۔ 1960 میں شائع ہونے والا ان کا شعری مجموعہ 'خیمۂ گل' کئی دیوانوں کے دیوانوں پر بھاری ہے میں یہاں تاج بھوپالی کے اشعار کوٹ (Quote) کرنا شروع کر دوں تو شاید اپنے موضوع سے ہٹ جاؤں۔ 'خیمۂ گل' اور 'سورج نما' دو ایسے شعری مجموعے ہیں جو نہ صرف تاج کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں بلکہ بھوپال کی بھی ادبی و شعری صورتِ حال کے تاریخی دستاویزی شاہ کار ہیں۔ مختار شمیم بھی ذہنی طور پر تاج سے اس قدر متاثر لگتے ہیں کہ تاج بھوپالی کے 'خیمۂ گل' کے اتباع میں اپنے مجموعوں کے نام 'نامۂ گل' 1978 اور 'دریچۂ گل' 1984 اختیار کیے۔

بھوپال ایک ایسی مسلم ریاست رہی ہے جس سے علامہ اقبال کو دلی لگاؤ رہا۔ یہاں اقبال کے دوست سر راس مسعود بھوپال کے فرماں روا حمید اللہ خان صاحب کے دستِ راست تھے انھوں نے علامہ اقبال کی بڑی مدد کی۔ ماہانہ پانچ سو روپیہ وظیفہ جاری کروایا۔ اقبال کے گلے کا برقی شعاؤں کے ذریعے بھوپال میں قیام و طعام کی سہولتوں کے ساتھ علاج بھی کروایا۔ اقبال سے بھوپال والوں کو بھی بہت محبت رہی۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے 'اقبال نامے' 2006 میں مرتب کیے تو ڈاکٹر آفاق احمد نے 'اقبال آئینہ خانے میں' 1979 میں ترتیب دیا۔ یہ دونوں کتابیں مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال نے شائع کیں چنانچہ مختار شمیم نے بھی علامہ اقبال سے متعلق کچھ مضامین لکھے جیسے 'اقبال کے فکری زاویے' 'مطالعۂ اقبال کی ایک جہت اور کلامِ اقبال کے چند متعلقات' مختار شمیم کے خیال میں' سائنسی علوم میں خصوصاً علم جغرافیہ سے اقبال کی گہری دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔ انسان، کائنات، کرۂ ارض وغیرہ کا ذکر اقبال کے ہاں مسلسل آتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مختار شمیم نے کلامِ اقبال کے چند متعلقات کے عنوان سے ان نباتات و حیوانات کا تذکرہ کیا جن کی علامتوں سے کام لے کر علامہ نے بڑے اہم نکتے بیان کیے۔ جیسے مکڑا اور مکھی، شاہین، کرگس، کنجشک فرومایہ، شہباز، ممولہ، نرگس، لالہ، جگنو، پرندہ، بلبل، پروانہ، پہاڑ، گلہری اس طرح اقبال کی علامتوں کے حوالے سے مختار شمیم نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مختار شمیم نے سرونج کی ادبی شخصیتوں پر کھل کر لکھنے کے ساتھ ساتھ 'ریاست ٹونک اور اردو شاعری' پر تفصیلی مقالہ 1968 میں لکھا۔ آپ کا قلم علاقائی عصبیت سے ماورا تھا۔ آپ نے جہاں اختر شیرانی، مضطر خیر آبادی، جاں نثار اختر، حکیم سید ظل الرحمٰن، ڈاکٹر ابو محمد سحر، فضل تابش، شاہد میر، ظفر صہبائی، عزیز اندوری، ندا فاضلی، اختر سعید خان، کوثر صدیقی، شعری بھوپالی، مظفر حنفی وغیرہ کے فکر و فن پر

پروفیسر مختار شمیم روزانہ ڈائری لکھنے کے عادی تھے۔ ماہ نامہ 'اردو ہلچل' بھوپال میں 'اوراق پریشان' کے عنوان سے اس کی اقساط شائع ہوتی رہی ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسے کیسے مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ 'اوراق پریشان' کو کتابی صورت میں لائیے۔ اب مدیر اردو ہلچل جناب جاوید یزدانی یا پھر مدیر انتساب ڈاکٹر سیفی سرونجی ہی ان 'اوراق پریشان' کو مرتب کرکے پیش کر سکتے ہیں۔

کھل کر لکھا وہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، حنیف نقوی، ظفر گورکھپوری، ڈاکٹر سیدہ جعفر، دیپک بدکی وغیرہ کی ادبی و تنقیدی کاوشوں کی داد بھی دی۔

مختار شمیم اپنے استاد ڈاکٹر ابو محمد سحر سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ سحر صاحب نہایت شریف النفس واقع ہوئے تھے۔ سحر صاحب کو اپنے مقالے 'مطالعۂ امیر' پر آگرہ یونیورسٹی سے 1964 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے سرفراز فرمایا گیا تھا جو ڈاکٹر مسیح الزماں کی زیرِ نگرانی لکھا گیا تھا اور جو 1965 میں شائع بھی ہوا۔ ابو محمد سحر اردو زبان و ادب کے خاموش خدمت گذار تھے یہ چونکہ اپنی کوئی پی آر شپ نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا۔ رشید حسن خان کے تجویز کردہ املا کے خلاف ابو محمد سحر نے کھل کر لکھا۔ ان کی کتابیں 'اردو املا اور اس کی اصلاح' 1982 'زبان و لغت' 1983 'اردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ' فروری 1999 وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ مختار شمیم نے ان کتابوں پر سیر حاصل مضامین اپنی کتاب 'صاحبِ فکر و نظر ابو محمد سحر' میں شامل کیے۔ اس کتاب کے ایک مضمون سے ایک دل چسپ مگر عبرت خیز ریمارک ملاحظہ فرمائیے:

''اردو کے ہم صوت حروف کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے لکھا ہے کہ یہ مردہ لاش ہیں۔ ڈاکٹر (گیان چند) جین نے یہ اضافہ کیا کہ انھیں سپردِ خاک کر دیا جائے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی ایک تجویز پیش کی ہے کہ ان حروف کو سپردِ خاک کرنے کے بجائے سپردِ خاک کرنے کے منصوبے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔'' (بحوالہ مضمون رشید قریشی ص 81)

مختار شمیم اپنے استاد ابو محمد سحر کے دفاع میں پیش پیش رہتے تھے۔ اردو میں قصیدہ نگاری پر دادِ تحقیق دیتے ہوئے 1956 میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ثابت کیا تھا کہ:

''ایک شاعر عبدالرحمٰن شاطر مدراسی ہیں جنھوں

نے 'اعجازِ عشق' کے عنوان سے 1396 اشعار کا ایک قصیدہ لکھا ہے۔

یہ قصیدہ نہ صرف اپنی غیر معمولی طوالت بلکہ اپنے جدید فلسفیانہ اسلوب کے لحاظ سے بھی خاصا اہم ہے''

مگر علی جواد زیدی سے یہ تحقیق ہضم نہ ہوسکی۔ انھوں نے ابو محمد سحر کی تحقیق کے بالمقابل ایک مرثیے کو قصیدہ بنا کر پیش کیا تھا۔

''اپنی تصنیف 'قصیدہ نگاران اتر پردیش' میں جناب علی جواد زیدی لکھتے ہیں کہ ابو محمد سحر نے طویل ترین قصیدے کی بحث اٹھائی ہے اور طویل ترین قصیدے کی تصنیف کا فخر شاطر کے سپرد کیا لیکن ان کے قصیدے میں بھی کل 1396 شعر ہیں۔ کنور سین مضطر لکھنوی کے قصیدۂ ریاض الشہداء میں 1425 شعر ہیں... تاہم خود جناب علی جواد زیدی کو اعتراف ہے کہ یہ قصیدہ راثیہ مضمون کے اعتبار سے مرثیہ ہے۔'' (ص 241)

اس طرح مختار شمیم نے خود علی جواد زیدی کی کتاب کے حوالے سے مرثیے کو قصیدہ بنا کر پیش کرنے کے رویے کا مدلل رد کیا۔

پروفیسر مختار شمیم روزانہ ڈائری لکھنے کے عادی تھے۔ ماہ نامہ 'اردو ہلچل' بھوپال میں 'اوراق پریشان' کے عنوان سے اس کی اقساط شائع ہوتی رہی ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسے کیسے مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ 'اوراق پریشان' کو کتابی صورت میں لایئے۔ اب مدیر اردو ہلچل جناب جاوید یزدانی یا پھر مدیر انتساب ڈاکٹر سیفی سرونجی ہی ان 'اوراق پریشان' کو مرتب کر کے پیش کر سکتے ہیں۔

مختار شمیم کی تخلیقی صلاحیتوں کے ثبوت میں ان کے افسانوں کے مجموعے 'پس غبار' کو پیش کیا جاسکتا ہے تو شعری کاوشوں کی دستاویز کے طور پر 'نامہ گل'، 'حرف حرف آئینہ'، 'ہجر کی صبح و ہجر کی شام' دیکھا جا سکتا ہے۔ تنقیدی بصارتوں کے لیے 'تناظر و تشخص'، 'سوادِ حرف' سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

مختار شمیم کی تخلیقی صلاحیتوں کے ثبوت میں ان کے افسانوں کے مجموعے 'پس غبار' کو پیش کیا جا سکتا ہے تو شعری کاوشوں کی دستاویز کے طور پر 'نامہ ، گل'، 'حرف حرف آئینہ'، 'ہجر کی صبح و ہجر کی شام' دیکھا جا سکتا ہے۔ تنقیدی بصارتوں کے لیے 'تناظر و تشخص'، 'سواد حرف' سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

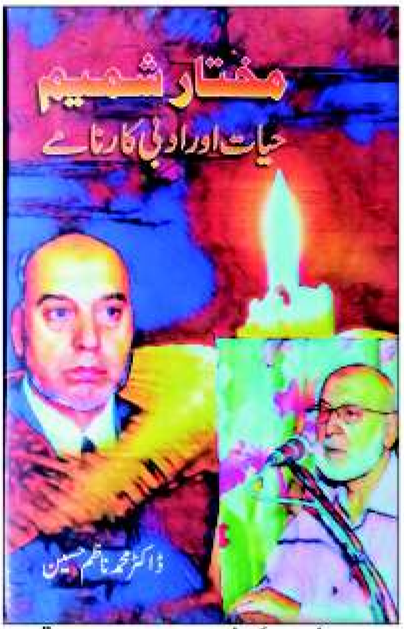

مختار شمیم کے فکر و فن کو ان کے جیتے جی خراج تحسین پیش کیا گیا۔ محمد ناظم حسین نے 'مختار شمیم حیات اور ادبی کارنامے' کے عنوان سے ان کے فکر و فن پر دادِ تحقیق دی اور اس مقالے پر انھیں وکرم یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جو ستمبر 2017 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ 'شاعر' بمبئی اور 'انتساب' سرونج نے گوشۂ مختار شمیم نکالا۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے ایک کتاب 'مختار شمیم ایک مہربان دوست' کے ذریعے اعتراف خدمات کیا''۔ مختار شمیم حیات اور ادبی کارنامے'' سے پتہ چلتا ہے کہ جناب محمد رفیق خاں نے 'مختار شمیم ایک تاثر' کتاب لکھ کر اپنے شاگرد کا حق ادا کیا اور ان کی شخصیت و فن کا جائزہ لے کر ادبی دنیا کو روشناس کرایا'' (ص 7)۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی اور محمود ملک نے 'مختار شمیم: آئینہ در آئینہ' 2019 میں مرتب کی جس میں بے شمار ادیبوں، شاعروں کے تاثرات جمع کیے جو پروفیسر مختار شمیم کے بارے میں خلوصِ دل سے لکھے گئے ہیں۔ ان مشاہیر قلم کاروں میں افتخار امام، عارف عزیز، سہیل نسیم، پروفیسر محمد نعمان خان، رضوان الدین فاروقی، ضیا فاروقی، محمد ایوب واقف، ڈاکٹر آصف سعید، ڈاکٹر عمیر منظر، اظہر خضر، اسلم چشتی، رؤف جاوید، عزیز اندوری، ظفر صہبائی، سلیم انصاری، شارق عدیل، مخمور سعیدی، شاہد میر، عشرت ناہید، کمال احمد صدیقی، اقبال مجید، ڈاکٹر رضیہ حامد، پروفیسر فیروز احمد، دیپک بدکی، محمود ملک، ابراہیم یوسف، رشید انجم، رام پرکاش راہی، علی عباس امید اور اختر سعید خان جیسے صاحب نظر قلم کار ہیں۔

ادبی اعتبار سے تو مختار شمیم نے کافی اچھی زندگی گزاری کہ ان کے فکر و فن کو سراہنے والوں کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی۔ 12 جون 1975 کو مختار شمیم کی شادی ڈاکٹر کشور سلطان جیسی چاہنے والی خاتون سے ہوئی جن سے ایک بیٹا تبریز اور ایک بیٹی صبا سے گھر کی زینت بڑھی مگر یہ خوش حال زندگی دیرپا ثابت نہ ہوئی 1950 میں پیدا ہونے والی ڈاکٹر کشور سلطان کینسر کا شکار ہو کر 4 جولائی 1997 کو دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

مختار شمیم سے ملتے ہوئے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندر سے کس قدر ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے شعر و ادب میں پناہ لی۔ ان کے ریسرچ سکالر کے مطابق ستمبر 1998 میں اندور میں قیام کے دوران ان کے دل پر حملہ ہوا۔ 2006 میں ذیابیطس (شوگر) کا مرض انھیں لاحق ہوا جو زندگی بھر ساتھ رہا۔ 2009 میں پتے میں پتھری کی وجہ سے آپریشن کیا گیا۔ 2016 میں چہرے پر معمولی سا فالج کا حملہ ہوا مگر الحمد اللہ بروقت علاج سے مکمل صحت یابی نصیب ہوئی۔ ملنے والوں کو احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیسے کیسے حالات و مصائب سے گزر رہے ہیں۔ نمازِ فجر کے بعد چہل قدمی کیا کرتے تھے اور شعر و ادب کی محفلوں میں سنجیدگی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے محرومیوں کے شکار رہے مگر غلط راستوں پر ان کے قدم کبھی نہیں پڑے۔ وہ بڑے حوصلے کے آدمی تھے۔ افسوس ایسے حوصلہ مند قلم کار نے آخر کار تین دسمبر 2020 کو بھوپال میں آخری سانس لی اور ان کی تدفین ان کے اپنے وطن سرونج میں اسی دن عمل میں آئی۔ بیٹا، بیٹی، بہو، پوتا پوتی اور نواسیوں کے سر پر سے گویا ایک سائبان ہٹ گیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بقول مختار شمیم۔

ہم ایک شب کے مسافر ہیں لوٹ جائیں گے
ہمیشہ کون کرائے کے گھر میں رہتا ہے

ماخذ

1 سوادِ حرف: تنقیدی مضامین از مختار شمیم، 2011 سہ ماہی انتساب سرونج
2 مختار شمیم: آئینہ در آئینہ 2011 مرتبہ ڈاکٹر سیفی سرونجی و محمود ملک، سرونج، انتساب سرونج 2019
3 مختار شمیم حیات اور ادبی کارنامے: ڈاکٹر محمد ناظم حسین، اندرا نگر، مندسور، MP ستمبر 2017
4 صاحب فکر و نظر ڈاکٹر ابو محمد سحر: مرتبین کوثر صدیقی و مختار شمیم، مکتبہ ادب 39، مالویہ نگر بھوپال 2006
5 استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے از مختار شمیم انتساب سرونج 2016
6 جاں نثار اختر حیات و فن: ڈاکٹر کشور سلطان کو ئینس ہوم، کوہ فضا۔ بھوپال مئی 2008

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda Hyderabad 500008.
Cell: 9440945645
email : raoofkhair@gmail.com

عبدالغنی

طنز و مزاح کا معتبر حوالہ

زبیر الحسن غافل

26 جنوری دو ہزار اکیس کی شام ہے کہر آلود آسمان میں سورج پہلے سے غروب ہے۔ شام کے ڈھلنے اور رات کی ابتدا کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ سرد لہر کے سبب شہر بھی جامد اور ساکت ہے۔ اسی درمیان یہ اندوہناک اور دلدوز خبر موصول ہوئی کہ طنز و مزاح کے معتبر حوالہ مشہور و معروف شاعر زبیر الحسن غافل کا پٹنہ میں انتقال پر ملال ہوگیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون اور اسی کے ساتھ ظریفانہ شاعری کے ایک باب کا خاتمہ ہوگیا۔ اچانک ان کی موت کی اطلاع سے اردو دنیا اور بالخصوص علاقہ سیمانچل سوگوار ہوگیا۔ دراصل زبیر الحسن غافل کی موت واقعی غیر متوقع ہوئی ہے کئی ماہ سے وہ علیل ضرور تھے مگر معالجین کی نگہداشت میں رو بہ صحت ہو رہے تھے مگر قاضی اجل کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ طویل علالت اور اس کے بعد ملنے والی صحت کا زمانہ ان کی سانسوں کی طرح سمٹ کر رہ گیا تھا وہ صحت یاب ہوئے، پھر اپنے آبائی گھر آئے اور پھر رب حقیقی سے جا ملے۔

زبیر الحسن غافل ظریفانہ شاعری کے ایک اہم معتبر شاعر تھے جو طنز و مزاح کے پردے میں سماجی کرب کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ان کی شاعری سیاست سے لے کر معاشرت تک محیط تھی۔

زبیر الحسن غافل پیدائشی شاعر تھے۔ بچپن سے ہی ان کو شعر و شاعری کا ذوق و شوق تھا۔ شعر و شاعری ان کو وراثت میں ملی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے ددیہال اور ننیہال میں شعر و شاعری کا ماحول تھا۔ ان کے نانا فرزند علی شیدا اردو اور فارسی میں ظریفانہ شاعری کرتے تھے۔ زبیر الحسن کی پیدائش 27 جنوری 1944 کو کملد اہا اررریہ کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ 1966 میں بی۔ ایس۔ سی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد والد کے حکم سے قانون میں داخلہ لے لیا۔ 1968 میں بی۔ ایل کرنے کے بعد 1969 میں سول کورٹ ارریہ میں وکالت شروع کی۔ 1975 میں منصف کے مقابلہ جاتی امتحان میں شریک ہوئے اور ان کو کامیابی نصیب ہوئی۔ جس کے بعد وہ بہار کے مختلف اضلاع میں منصف کے عہدے پر فائز رہے۔ جنوری 2004 میں بہار کے مظفر پور سے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ان کے والد جناب ظہور الحسن صاحب کہنہ مشق شاعر تھے اور حسن تخلص رکھتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'صحرا میں سمندر' بھی ادبی حلقوں میں مقبول ہوا۔ انسانی کمالات اور خوبیوں سے متصف عدل و انصاف کے پیکر زبیر الحسن غافل کی زندگی کا ہر پہلو روشن ہے۔ جس میں ہر ایک کو اپنے لیے کچھ نہ کچھ نظر آتا تھا۔ اس میں اہل علم، شعرا و ادبا، علما، اہل مدارس، گاؤں کے ہم سایہ، شہر کے ضرورت مند، قانونی حاجت مند غرض وہ مرجع خلائق تھے۔ ان کے پاس ہر آنے والا شخص مطمئن ہو کر رخصت ہوتا تھا۔ شریف النفسی، خوش اخلاقی اور صلہ رحمی کے نیک جذبے سے سرشار زبیر الحسن غافل بہتوں کی آس تھے۔ زبیر الحسن غافل اپنی شاعری کے حوالے سے بھی اردو دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں ان کی شاعری پڑھنے کے بعد وقتی طور پہ قارئین زیر لب مسکراتے ہیں مگر جلد ہی دردمندی کے احساس سے مغلوب ہو جاتے ہیں دراصل ان کی شاعری میں زندگی کے آلام و مصائب کا ذکر شامل ہے ان کی نظم 'مسجد اقصی کی پکار' اور 'ایک گھر اللہ کا' اسی کرب و اذیت کا اظہار ہے مسجد اقصی کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

میں مسجد اقصی میرے چاہنے والو
غیروں کے تسلط سے مجھے آ کے چھڑا لو
یہ وقت عمل کا ہے مقدر پہ نہ ٹالو
اے چاہنے والو میرے چاہنے والو

غافل کی شاعری طنز و مزاح اور سوز و گداز سے پر ہے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کا فن بھی کائناتی ہے یہی وجہ ہے وہ حالات کے ستم ظریفی سے رنجیدہ ضرور ہیں مگر حالات کی تبدیلی اور صبح انقلاب کی آمد کے لیے پر امید ہیں مسجد اقصی کی پکار کے مذکورہ بالا اشعار میں جہاں وہ دعوت عزیمت دے رہے ہیں وہیں ملت اسلامیہ کے جیالوں کو وارث ہونے کا عار بھی دلا رہے ہیں اسی طرح سماج کے لیے ناسور بن چکے رشوت ستانی اور استحصالی نظام کے خلاف بھی وہ سراپا احتجاج نظر آ رہے ہیں۔ رشوت کے چلن عام ہو جانے پر سماج کے کمزور طبقات پر جو جبر ہوا ہے وہ ہر حساس دل کو جھنجھوڑتا ہے۔ 'رشوت' کے عنوان سے ان کی نظم میں کتنا گہرا طنز ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مردہ رگوں میں پھر سے نئی جان ڈال دے
بوڑھے کلرک کو بھی جوانی کی چال دے
تحت الثری میں چھپی فائل نکال دے
رشوت میں وہ کمال کہ دفتر کھنگال دے

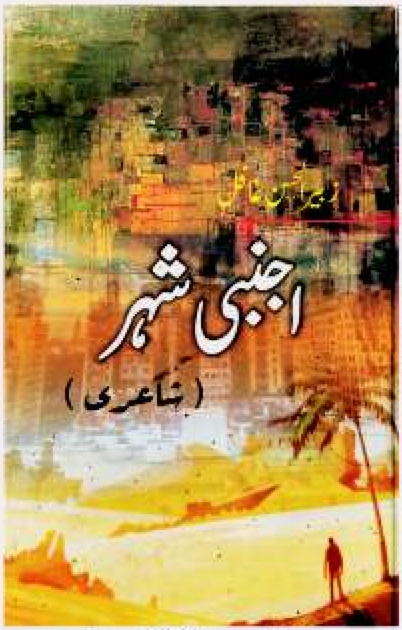

اس سے نظر چرالے کوئی کیا مجال ہے
سب کے گھروں میں اس کے سبب روٹی دال ہے
ہربار نیا ایک کرشمہ یہ دکھائے
معصوم کو پھانسے کہیں مجرم کو بچائے

ان کی دیگر نظموں میں 'روزگار'،اجنبی شہر،ایک پہیلی،'اینٹی شوہر کانفرنس اور نسخہ لیڈری جس کا ہر ایک شعر گہرائی و گیرائی لیے ہوئے ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کا عنوان شاعر،لیڈر،پروفیسر،کلرک،بیوپاری،افسر،عوام اور چور کو بنایا ہے اور اس پر طنزومزاح کے نشتر چھوڑے ہیں جو قاری کو پڑھنے کے بعد ہنسنے اور پھر سوچنے پہ مجبور کردیتا ہے لیڈر کے عنوان سے رقم ان کی نظم کے چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

لیڈر کو اگر آپ کہیں ڈھونڈھنا چاہیں
وہ رات کو دعوت کہیں کھانے میں ملیگا
اور صبح کو صندوق نما توندکو بھر کر
بیٹھا ہوا وہ چمچوں کے نرغے میں ملے گا
اور دن کو وہ لکھوا کے کوئی موقع کا بھاشن
رٹتا ہوا تنہا کسی کمرے میں ملے گا

اسی طرح خود اپنے بارے میں ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں کہ۔

غافل کو اگر آپ کہیں ڈھونڈھنا چاہیں
وہ رات کو بیوی سے جھگڑنے میں ملے گا
اور صبح کو ہاتھوں میں لیے کیس کی فائل
اک کوہ گراں کو رائی کرنے میں ملے گا
کرسی عدالت پہ بڑے صبر سے دن میں
بکواس وکیلوں کی وہ سننے میں ملے گا

نظم نسخۂ لیڈری کے اشعار ملاحظہ فرمائیں کہ
ایک قرص بے حیائی صبح اٹھ کر لیجیے
چار چمچے آب خودغرضی ملا کر پیجیے

ناشتے میں ایک چمچہ جھوٹے وعدوں کا لبوب
ساتھ اس کے دے مزاعرق ریاکاری بھی خوب
تخم کینہ پاؤ ماشہ لیجیے پھر تول کر
خوب اس کو بھونئے حرص وہوس کی آگ پر

طویل نظم کا آخری شعر دیکھیں۔

چند ہفتوں تک اگر اس پر عمل کر لیجیے
نیتا بننے کی ضمانت ہم سے آکر لیجیے

طنزیہ شاعری کے علاوہ وہ غزل کے بھی حساس شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعے کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام کثیر تعداد میں ہے جس میں تغزل ہے۔ ان کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیں کہ۔

شرم آنکھوں سے رخ سے حیا لے گئی
جانے تہذیب نو اور کیا لے گئی
اب بچا ہی ہے کیا آشیاں میں مرے
چند تنکے تھے وہ بھی ہوا لے گئی

ان اشعار کو دیکھیں کہ عشق حقیقی میں شرابور کیفیت کا برملا اظہار اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا ہے۔

کبھی جو گزرا تیری گلی سے چراغ یادوں کے جل گئے ہیں
نظر جو آئی تمہاری چوکھٹ جبیں پہ سجدے مچل گئے ہیں

زبیر الحسن غافل نے نعتیہ عشقیہ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس میں عشق محمدی کی جھلک ہے۔

شعروادب کے علاوہ وہ علاقے کے ایک شجر سایہ دار سرپرست تھے مربی تھے۔

بڑی تعداد میں ان کے قریب ترین وہ لوگ تھے جو کملدابا اور قرب وجوار کے تھے اور سبھی کو بس یہی لگتا تھا کہ جج صاحب کے ہم خاص ہیں۔

اپنی پہلی ملاقات ان سے کب کی ہے، یاد نہیں۔ البتہ ملاقاتوں کے سلسلے، ملاقاتوں پر اصرار اور گاہے گاہے ان کا میرے احوال دریافت کرنا یاد ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ مستقل ادبی اور سماجی خدمت میں مصروف ہوگئے تھے علاقے کے شعرا وادبا پر مشتمل انجمن سوشیو لٹریری سوسائٹی کی تمام نشستوں میں شریک رہتے تھے۔ نشست اور بیٹھک میں لوگوں سے ملاقات کا جو سلیقہ ان میں تھا شاید ہی اب ایسے لوگ ملیں۔ رواداری اور تواضع کی اعلی مثال تھے۔ ایک موقع پر گھر کے لوگوں کے بیچ تھے انہیں معلوم ہوا کہ میں الیاس احمد باوفا مرحوم کا نواسہ ہوں اس پر وہ بے انتہا خوش ہوئے اور حاضرین کو بہت شوق سے بتانے لگے کہ غنی الیاس بھائی کا نواسہ ہے معلوم ہے تم لوگوں کو۔ ان کی یادیں، باتیں، ان کا زیرلب مسکرانا، ملاقاتیوں سے حسب حال گفتگو کرنا۔ عموماً ان کا رویہ سب کے ساتھ مشفقانہ ہوتا تھا۔ مگر ہر اس شخص کی ضرور پذیرائی کرتے یا حوصلہ بڑھاتے تھے جن کو ضروری سمجھتے تھے اس میں قرابت یا کوئی اور وجہ نہیں ڈھونڈھتے تھے بس اچھے کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ آہ کیا ترتیب اور تنظیم کی تھی زندگی کی ان کی۔ زندگی بھر عجز وانکساری کے پیکر بنے رہے۔

تعلیمی پسماندگی پر اکثر کرب کا اظہار کرتے اور تعلیمی انقلاب کے لیے عملی اقدامات پر زور دیتے تھے۔ ایک موقع سے ان کا کہنا تھا کہ "تعلیمی میدان میں اپنا علاقہ پسماندہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زمیندار اور اس کے مزارع کا علاقہ ہے ان کے ذہن میں تھا کہ پڑھائی کرنے سے کیا ہوگا۔ زمیندار طبقہ تعلیمی طور پر پسماندہ رہا ہے۔ پہلے کے مقابلے اب تعلیمی بیداری آئی ہے۔ مسلم بچے پڑھائی سے جی چراتے ہیں۔ انٹر کے بعد ڈراپ آؤٹ ہوجاتے ہیں۔ ہم تعمیری کام کے بجائے مسجد قبرستان خانقاہ اور وقف زمین پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ صورت حال کو بدلنے کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت ہے۔"

عوام الناس کی خدمت کے علاوہ اردو شعروادب کو بھی انھوں نے مالامال کیا ہے طنزومزاح اور ظریفانہ شاعری کے حوالے سے وہ ایک معتبر نام ہیں۔ بہار میں ظرافت کو جن شعرا نے معیار اور وقار بخشا ہے ان میں رضا نقوی واہی کے بعد زبیر الحسن غافل کا نام سرفہرست ہے۔ ان کا شعری مجموعہ اجنبی شہر سال 2006 میں شائع ہوا ہے جو ادبی حلقے میں خوب پسند کیا گیا اور مجموعے کا دوسرا ایڈیشن 2015 میں بھی شائع ہوا۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں بہار اردو اکادمی نیز دیگر اداروں نے اعزازات سے نوازا ہے۔

عوام الناس کی خدمت کے علاوہ اردو شعروادب کو بھی انھوں نے مالامال کیا ہے طنزومزاح اور ظریفانہ شاعری کے حوالے سے وہ ایک معتبر نام ہیں۔ بہار میں ظرافت کو جن شعرانے معیار اور وقار بخشا ہے ان میں رضا نقوی واہی کے بعد زبیرالحسن غافل کا نام سرفہرست ہے۔ان کا شعری مجموعہ اجنبی شہر سال 2006 میں شائع ہوا ہے جو ادبی حلقے میں خوب پسند کیا گیا اور مجموعے کا دوسرا ایڈیشن 2015 میں بھی شائع ہوا۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں بہاراردو اکادمی نیز دیگر اداروں نے اعزازات سے نوازا ہے۔

■

Mr. Abdul Ghani
Ward No:26
Islam Nagar Near Zahiriya Masjid,
Araria-854311 (Bihar)
Mob.: 9931222982
Email.abdulghani630@gmail.com

کوثر چاندپوری کی افسانہ نگاری

شاداب تبسم

حکیم سید علی کوثر کو ادبی دنیا میں کوثر چاند پوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کی چاشنی نے دیگر افراد کی طرح اطبا کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ اگر سترہویں صدی سے طبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اکثر پیشے سے طبیب افراد ادب کے مریض بھی ہوئے ہیں اور انھوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں کچھ نہ کچھ تعاون ضرور پیش کیا ہے۔ کوثر چاند پوری کا تعلق بھی طبابت سے تھا۔

مستند حکیم اور فکشن نگار کوثر چاند پوری کی پیدائش 18/اگست 1900 کو چاند پور میں ہوئی۔ ان کے والد سید علی مظفر نامور طبیب تھے۔ کوثر چاند پوری حصول تعلیم کے لیے 14 سال کی عمر میں بھوپال چلے گئے تھے۔ وہاں آصفیہ طبیہ کالج میں طب کی تعلیم پائی اور محکمۂ طبابت میں ملازم ہوگئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہیں پریکٹس شروع کی۔ سبکدوشی کے وقت انچارج افسر الاطبا تھے۔ 1964 میں دہلی منتقل ہوگئے۔ 13/جون 1990 کو انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

کوثر چاند پوری میں زمانۂ طالب علمی ہی سے مضمون نویسی اور شعر گوئی کا ذوق پروان چڑھنے لگا تھا۔ معیاری رسائل اور نثری کتابوں کے مطالعے نے انھیں مضمون نگاری کی طرف راغب کیا۔ وہ شاعر، ادیب، مورخ، خاکہ نگار، صحافی، افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کوثر چاند پوری کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جس میں معروف افسانہ نگاروں کے تابندہ اسما کی ایسی کہکشاں ملتی ہے جس نے افسانہ نگاری کا ایک معیار قائم کیا ہے اور جو پریم چند کے بعد فوراً منظر عام پر آئی۔ مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، احمد علی، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری، دیوندر ستیارتھی، سہیل عظیم آبادی، شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس اور عزیز احمد وغیرہ کے علاوہ دیگر اسما کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ بقول فکر تونسوی:

''کوثر کا نام آتے ہی پریم چند کا تصور آتا ہے۔ جس مدرسۂ فکر کے حدیٰ خواں پریم چند تھے۔ کوثر بھی اسی تہذیب و تعمیر کے نقیب ہیں۔''

(بحوالہ وقار علم و حکمت، کوثر چاند پوری، ڈاکٹر نازنین خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2015)

کوثر چاند پوری کے متعدد تنقیدی و تاثراتی مضامین کے علاوہ طب، ادب اطفال، انشائیہ، طنز و مزاح، رپورتاژ، سوانح اور فکشن کے تعلق سے مطبوعہ کتابوں کی تعداد 181 ہے۔ بقول ڈاکٹر نازنین خان:

''کوثر صاحب نے نثر کے میدان میں ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ افسانے لکھے، انشائیوں کو گدگدایا، طنز کے تیر چلائے، طنز و مزاح سے چھیڑ چھاڑ کی، ناولوں کی دنیا آباد کی، رپورتاژ لکھے، تاریخ کے صفحات الٹے، تحقیق کی تہوں میں جھانکا، تنقید کے کوچے میں قدم رکھا اور سوانح کو موضوع بنایا۔'' (ایضاً، ص 204)

لیکن کوثر چاند پوری کا اصل میدان فکشن ہے جس کا ثبوت ان کے 14 افسانوی مجموعے اور 17 ناول ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'دلگداز افسانے' کے عنوان سے 1929 میں منظر عام پر آیا۔ جسے انڈین پریس لکھنؤ نے شائع کیا، بقول رشید انجم:

''یہ پہلا افسانوی مجموعہ تھا جو بھوپال کی ادبی سرزمین سے کتابی شکل میں شائع ہو کر ملک کے طول و عرض کے اردو داں باذوق شائقین تک پہنچا تھا۔ اس سے قبل بھوپال سے کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے کوثر صاحب ہی بھوپال کے پہلے افسانہ نگار تسلیم کیے گئے۔''

(کوثر چاند پوری (مونوگراف)، رشید انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2013، ص 35)

کوثر چاند پوری کے اولین مطبوعہ افسانے کے بارے میں نعیم کوثر کا خیال ہے:

''ان کا پہلا افسانہ 'گدازِ محبت' ماہنامہ 'پیام ہستی' امرتسر میں شائع ہوا۔''

(وقار علم و حکمت، کوثر چاند پوری، مضمون: ایک بے نیاز مفکر، محقق،

ناقد، افسانہ نگار اور حاذق طبیب از قلم نعیم کوثر، ص 22)

ظفر احمد نظامی 'گداز محبت' ہی کو پہلا مطبوعہ افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کا پہلا افسانہ 'گداز محبت' کے عنوان سے 1926 میں امرتسر کے پیام ہستی نامی ادبی جریدے میں شائع ہوا۔''

(کوثر چاند پوری (مونوگراف) ظفر احمد نظامی، ساہتیہ اکادمی، 2003، ص 43)

پروفیسر نعمان خان کو لکھے ایک خط میں کوثر چاند پوری نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز 1922 لکھا ہے۔ جس کا ذکر نعمان خان نے اپنے تحقیقی مقالے 'بھوپال میں اردو انضمام کے بعد' میں کیا ہے۔

راقمہ کی نظر سے کوثر چاند پوری کی ایک تحریر گزری جس سے ان کے پہلے مطبوعہ افسانے کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں اب تک گداز محبت کو اپنا پہلا افسانہ سمجھتا رہا جو امرتسر کے کسی رسالے میں نامکمل شائع ہوا تھا۔ لیکن پرانی کتابوں میں مجھے رسالہ 'الکمال' لاہور دسمبر 1924 کا فائل ملا ہے۔ اس کے ماہ دسمبر 1924 میں میرا پہلا افسانہ 'فضائے برشگال کا ایک تیر' شائع ہوا ہے۔ اسی کو میں اپنا پہلا افسانہ سمجھتا ہوں۔ جو آج سے 54 سال قبل شائع ہوا تھا۔ رسالہ 'الکمال' ریاض شیرانی کی ادارت میں لاہور سے چھپتا تھا۔ میرا پہلا افسانہ کافی ترمیم واصلاح کے بعد میرے پہلے افسانوں کے مجموعے 'دلگداز افسانے' میں شامل ہوا۔ لیکن 'الکمال' میں اصل صورت میں شامل ہوا تھا۔ میں وہی نقل کرا کر بھیج رہا ہوں تا کہ میری افسانہ نگاری کے اصل نقوش واضح ہوں اور پتہ چلے کہ 54 سال کے طویل عرصہ میں میرے فن میں کتنی ترقی ہوئی ہے اور شعور میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں۔''

(تعمیر ہریانہ، اکتوبر نومبر 1978، ص 12)

کوثر چاند پوری کا قول ہمارے سامنے موجود ہے تو اسی کو مصدقہ مانتے ہوئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کا اولین مطبوعہ افسانہ 'فضائے برشگال کا ایک تیر' ہے جو 1924 میں 'الکمال' میں شائع ہوا۔

200 صفحات پر مشتمل مجموعے 'دلگداز افسانے' میں کل 16 افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں دیہاتی معاشرت اور سماج سے منتخب موضوعات اور مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مجموعے کو مصنف نے مولوی عبدالصمد صاحب بلگرامی، تحصیلدار و مجسٹریٹ بھوپال کی نذر کیا ہے اور مقدمہ بھی خود مصنف نے ہی لکھا ہے۔ اس مجموعے کے مقدمے میں افسانہ نگاری کے سلسلے میں اپنا مقصد واضح کیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی افسانہ نگاری کا ابتدائی دور تھا۔ لیکن اس مقدمے کی روشنی میں ان کی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے آخر تک کے فنی ارتقا کی پیائش کی جاسکتی ہے۔ مقدمے میں لکھتے ہیں:

''ہماری منشا افسانہ نگاری سے صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک بہترین اخلاقی روح کو 'حسن وعشق' کے ساتھ ملا کر ایسے اعتدال تک پہنچادیں کہ ہمارے حواس میں ایسی ضیا اور تنویر پیدا کردے کہ ہم دنیا کے ہر اندھیرے کو اس کی امداد سے طے کرجائیں۔ یہ مقصد اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ہم ان سب اجزا کے اوزان اور تناسب کا لحاظ رکھیں۔ اگر اس تناسب پر نظر نہیں رکھی جائے گی تو یقیناً ہماری سب غرض فوت ہوجائے گی اور ہم اپنے مقصد اصلی سے دور جاپڑیں گے۔''

(کوثر چاند پوری ظفر احمد نظامی، ساہتیہ اکادمی، 2008، ص 44)

دوسرا افسانوی مجموعہ 'دنیا کی حور' کے عنوان سے 1930 میں منظر عام پر آیا۔

دوسرے افسانوی مجموعے 'دنیا کی حور (1930)' میں شامل افسانے ہندوستانی معاشرت اور ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانوں کے مطالعے سے مصنف کی فن افسانہ نگاری پر مضبوط پکڑ کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ افسانہ نگاری میں کامیابی کے مراحل طے کرتے نظر آتے ہیں۔

تیسرا مجموعہ 'ماہ و انجم' عالمگیر بک ڈپو، لاہور سے 1937 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اکیس افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں سے فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت اور فکر وشعور میں پختگی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ یہاں پر معاشرے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور فرد کو معاشرے کا حصہ سمجھ کر اس کی انفرادیت کو اہمیت نہیں دیتے۔

چوتھا افسانوی مجموعہ 'دلچسپ افسانے' 1938 میں جامعہ پریس دہلی سے شائع ہوا۔ ان افسانوں میں زندگی کے مسائل اور حقائق کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے۔

پانچواں افسانوی مجموعہ 'دنیا کی حور اور دیگر افسانے' مکتبہ جدید لاہور سے 1938 میں شائع ہوا۔ اس میں 1930 میں شائع ہونے والے مجموعے کے افسانوں کے علاوہ چند دوسرے افسانے دیباچہ کے ساتھ شامل کردیے گئے ہیں۔

'گل و لالہ' افسانوی مجموعہ 1938 ہی میں انوار احمدی پریس، الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس میں کل 13 افسانے شامل ہیں۔

1941 میں مجموعہ 'شب ناچے' کے عنوان سے انوار احمدی پریس، الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس میں افسانوں کی تعداد 22 ہے۔ جنسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں میں رنگینی ضرور ہے مگر فحاشیت بالکل نہیں۔ تمام افسانے جنسی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کے انحطاط سے انحراف کرتے ہیں۔

مجموعہ 'عورتوں کے افسانے' 1941 میں مکتبہ جدید، لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں پندرہ افسانے شامل ہیں، جن میں خواتین کے وقار اور ان کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ عورتوں کی شناخت کے مختلف پہلوؤں کو قلم بند کر کے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مجموعہ 'رنگین سپنے' نفیس بک ڈپو، حیدر آباد سے 1941 میں شائع ہوا۔ اس میں آٹھ افسانے شامل ہیں۔

1944 میں مجموعہ 'لیل و نہار' (فسانہ عجائب جدید افسانوی لباس میں) انوار احمدی پریس، الہ آباد سے شائع ہوا۔ مصنف نے 'فسانہ عجائب' کو جدید افسانوی قالب عطا کیا ہے۔ 'فسانہ عجائب' کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں لیکن کوثر چاند پوری نے اس شاندار داستان کو یادگار بنادیا ہے۔

1944 میں مجموعہ 'اشک و شرر' کے عنوان سے دارالبلاغ، لاہور سے شائع ہوا۔ ان افسانوں کا انداز تحریر شگفتہ، اسلوب دلکش ہے اور پریم چند کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مجموعہ 'شعلۂ سنگ' ہمدرد اکیڈمی، کراچی سے 1963 میں شائع ہوا۔ اس میں 18 افسانے شامل ہیں۔

1963 میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہونے والے مجموعے 'رات کا سورج' میں 29 افسانے شامل ہیں۔

'آوازوں کی صلیب' کو حلقہ فکر و شعور دہلی نے 1973 میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کی کل تعداد اٹھائیس ہے۔ 'آوازوں کی صلیب' پر اپنی رائے

کا اظہار کرتے ہوئے پاکستانی ادیب انور سدید لکھتے ہیں:

''آوازوں کی صلیب' ان کے اٹھائیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں وہ قاشیں جمع کی ہیں جن پر دوسرے افسانہ نگاروں کی نظر نہیں پہنچ سکی۔ 'میرا پیشہ'، 'قلزم خون'، 'قلم الٰہی'، 'دودھ کی شیشی'، 'لذت سنگ' وغیرہ چند ایسے افسانے ہیں جنھیں بہت عرصے پہلے میں نے مختلف رسائل میں پڑھا تھا اور کوثر چاند پوری کا نام آتے ہی لوح دماغ پر اتر آئے ہیں۔''

(اوراق، لاہور، اپریل 1975، ص 35)

اس طرح 1929 سے 1973 تک ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد چودہ (14) ہو جاتی ہے۔ ان کے ریڈیائی افسانوں کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ ان کے فرزند نعیم کوثر صاحب کا (کوثر چاند پوری کی ڈائری کے حوالے سے) کہنا ہے کہ انھوں نے تقریباً تیس سال تک آل انڈیا ریڈیو سے اپنی کہانیاں سنائیں جو 75 کے قریب ہیں۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد خارجہ سروس میں کئی افسانے براڈ کاسٹ ہوئے۔ جن کی پسندیدگی پر بے شمار خطوط ریڈیو اسٹیشن کو موصول ہوئے تھے۔ بقول ڈاکٹر نازنین خان:

''ہمدرد صحت دلی میں 1926 سے پچاس سال آگے تک کوثر چاند پوری کے 435 افسانے شائع ہوئے۔''

(وقار علم و حکمت، کوثر چاند پوری، ص 71)

کوثر چاند پوری نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کے تئیں ان کا رویہ ترقی پسندانہ رہا۔ ترقی پسند فکر کی قربت اور اثر کی صورت جو کوثر چاند پوری کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے، وہ پریم چند کے اثر سے ہندوستانی گاؤں اور دیہاتی زندگی سے حاصل کردہ افسانوی مواد ہے جس کو وہ بڑی ہنر مندی سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ کبھی کسی مخصوص ادبی نظریے کے قائل نہیں رہے۔ نہ کسی ادبی گروہ میں شامل ہوئے۔

کوثر چاند پوری کے افسانوں میں پلاٹ عموماً بہت مختصر ہوتا ہے۔ کردار انتہائی شریف اور نیک یا انتہائی بدباطن۔ مثلاً افسانہ 'بھٹکا ہوا خط' کا کردار عبداللہ خاں اور افسانہ 'چھوٹی آنکھیں' کا کردار شیخ منیر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ کمال بیگ افسانہ 'چھوٹی آنکھیں'، منگلا افسانہ 'نچلی منزل'، حمیدن بوا افسانہ 'حیوان کی پگڈنڈی'، کریم افسانہ 'بابا کریم' کے ایسے کردار ہیں جن میں کوئی برائی کوئی عیب نہیں۔ واقعات اچانک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ افسانوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ضروری باتوں کو سمیٹ کر کتے ہیں اور غیر ضروری مقامات پر تفصیل سے چلے جاتے ہیں۔ جس سے افسانوں کی تاثیر دھندلا سی جاتی ہے۔

کامیاب افسانے کی ایک خوبی اختصار بھی ہے۔ بنیادی کردار یا تاثر ابھارنے کے لیے جتنا کچھ کہنا ضروری ہو اس کے علاوہ کوئی بھی غیر ضروری جملہ افسانے کی خامی میں گنا جاتا ہے۔ کوثر چاند پوری کے افسانے پڑھتے وقت بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ قلم پر ان کا قابو نہیں رہ جاتا اور افسانہ طوالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اکثر افسانوں میں اتنے مسائل زیر بحث آئے ہیں کہ افسانے کا مرکزی خیال مجروح ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں 'چہرہ'، 'بھٹکا ہوا خط'، 'ٹھیلے والے'، 'دھندلا پرچم'، 'کیلے کا چھلکا' اور 'نچلی منزل' وغیرہ افسانوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اسی قسم کی کوشش افسانہ 'دنیا کی حور' میں بھی نظر آتی ہے۔ 101 صفحات پر مشتمل افسانے میں کئی مسائل، واقعات اور بہت سے کرداروں کو متعارف کرانا اور بہت کچھ کہنے کی کوشش مختصر افسانہ نہیں بن سکتی بلکہ میری نظر میں اس کو Novellete (ناولٹ یا ناولچہ) کہا جا سکتا ہے۔

کوثر چاند پوری نے اپنے قلم پر کسی قسم کا لیبل نہیں لگایا۔ انھوں نے جاگیر دار، جمع دار، مستری، غنڈے، تانگے والے، مکان مالک، باورچی، موٹر ڈرائیور، وزیر، ملازمت پیشہ، ڈاکٹر، بے کار نوجوان، ٹھیلے والے مہاجر اور اسی قسم کے نہ جانے کتنے کردار ڈھالے ہیں۔ موضوعات کی بھی ان کے پاس کمی نہیں ہے۔ اپنی بات بے باکی سے وضاحت کے ساتھ کہنے پر قادر ہیں۔ زبان و بیان کی غلطیاں نہیں بے عیب اور شگفتہ نثر کا نمونہ سامنے آتا ہے۔ حکمت کے پیشے سے ان کی وابستگی کے طفیل کچھ ایسے تجربات میں قاری کی شرکت ہو جاتی ہے جو اپنے اندر لطف و لذت کی کیفیت کے ساتھ درد و کسک بھی رکھتے ہیں۔ 'ید بیضا'، 'ریزے ہی ریزے'، 'مسٹر'، 'مہکتا نوٹ'، 'بھٹکا ہوا خط'، 'گنڈا سنگھ' اور 'خون کی قیمت' جیسے افسانوں

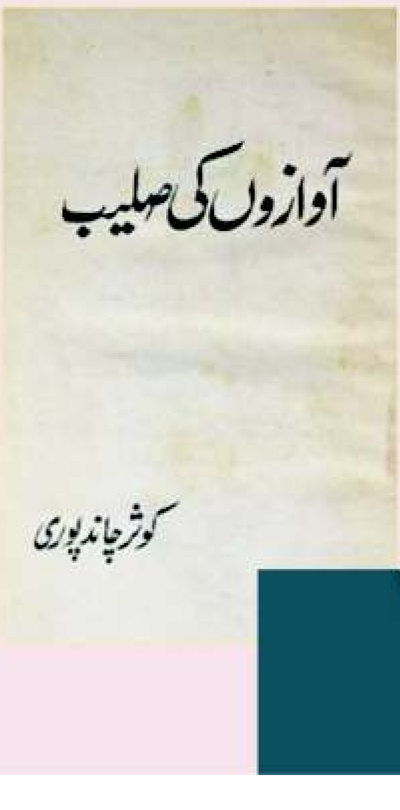

کوثر چاند پوری نے اپنے قلم پر کسی قسم کا لیبل نہیں لگایا۔ انہوں نے جاگیر دار، جمع دار، مستری، غنڈے، تانگے والے، مکان مالک، باورچی، موٹر ڈرائیور، وزیر، ملازمت پیشہ، ڈاکٹر، بے کار نوجوان، ٹھیلے والے مہاجر اور اسی قسم کے نہ جانے کتنے کردار ڈھالے ہیں۔ موضوعات کی بھی ان کے پاس کمی نہیں ہے۔ اپنی بات بے باکی سے وضاحت کے ساتھ کہنے پر قادر ہیں۔

میں طبی نکات دلچسپ انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ تشبیہات کی اختراع اور منظر کشی پر بھی ان کو عبور حاصل ہے۔ جن کی مثالیں افسانے 'چھوٹی آنکھ'، 'بھٹکا ہوا خط'، 'ہوں ہوں ہنگا'، 'کیلے کا چھلکا'، 'اندھیرے میں روشنی'، 'حصار' اور 'جنتم' میں ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کی انھیں خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''زبان و بیان پر ان کی استادانہ گرفت، پھر نادر تشبیہات گھڑنے کی قدرت، منظر کشی کا یہ سلیقہ، جزئیات نگاری کا یہ کمال، سماج کے ہر اونچ نیچ کو دیکھتے رہنے والی نگاہ اور مدتوں کے فنی ریاض کی عطا کردہ یہ چابک دستی کوثر چاند پوری کو ہمارے عہد کا اہم افسانہ نگار بنانے کے لیے کافی ہے۔'' (پروفیسر مظفر حنفی، طب یونانی اور اردو زبان و ادب، ص 104)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کوثر چاند پوری کی افسانہ نگاری کی عمر نصف صدی سے زائد ہے۔ ان کی کہانیوں میں افسانویت بھی ہے اور عصریت بھی۔ افسانوں کے کردار جس نوع کے ماحول میں پلتے بڑھتے اور سانس لیتے نظر آتے ہیں اور اپنے عہد کے مزاج اور طبعی میلان کی جس طرح نمائندگی کرتے ہیں ان کی مدد سے اس عہد کی ذہنی و جذباتی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

پروفیسر نعمان خاں کوثر چاند پوری کے ناولوں اور افسانوں کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''کوثر صاحب قصہ گوئی کے فن پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں بلکہ ان کے ناولوں اور افسانوں میں حقیقی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے ایک ماہر نباض کی طرح سماجی مسائل کو موضوع بنا کر بطور علاج ان کا حل پیش کرنے کی سعی کی ہے۔''

(بھوپال میں اردو انضمام کے بعد، ص 143)

■

Dr. Shadab Tabassum
23/14, Zakir Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 9999149012
Email.: shadabtabassum46@gmail.com

ہرچرن چاولہ بحیثیت افسانہ نگار

تسنیم فاطمہ

ہرچرن داس چاؤلہ ناروے میں اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا اصل نام ہرچرن داس ہے۔ 3 نومبر 1925 کو داود خیل ضلع میانوالی (مغربی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ کے آر ایس ہائی اسکول پھیرہ سے 1943 میں میٹرک اور منروا کالج راولپنڈی سے 1945 میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔ پنجابی یونیورسٹی (چنڈی گڑھ) سے بی اے اور بی ٹی کالج دہلی میں 1956 میں داخلہ لیا، وہیں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد تقریباً بیس سال تک پوسٹ آفس (دہلی) فلمی دنیا (مدھوکر فلمز، بمبئی) اور ریلوے (ناردرن ریلوے، بیکانیر) میں ملازمتیں کرنے کے بعد اوسلو (ناروے) کی لائبریری میں اردو، ہندی اور پنجاب زبانوں کے صلاح کار مقرر ہوئے۔ تا زندگی ناروے میں ہی مقیم رہے، گرچہ سیاحت کا شوق ہمیشہ رہا اور اس حوالے سے کئی بار ہندوستان اور ایک بار بہار بھی آئے۔ دسمبر 2001 میں ناروے میں ہی ان کا انتقال ہوگا۔

ہرچرن چاولہ کی ادبی زندگی کا آغاز 1948 میں ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ رسالہ 'ریاست' (دہلی) میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون تھے۔ اس کے بعد ہندو پاک نیز یورپ کے تمام اردو رسائل و جرائد میں جن کی فہرست سازی مشکل ہے، افسانے شائع ہوتے رہے۔ اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی، انگریزی، روسی اور نارویجین زبانوں میں بھی ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، خاکے، یادداشتیں اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی تصنیفات کی مکمل فہرست تیار کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کی درج ذیل تصنیفات اہم کہی جاسکتی ہیں۔

1 عکس اور آئینے (افسانوی مجموعہ)، مطبوعہ 1975
2 ریت، سمندر اور جھاگ (افسانوی مجموعہ) مطبوعہ 1980
3 آتے جاتے موسموں کا سچ (افسانوی مجموعہ) مطبوعہ 1989
4 البم (افسانے زندگی کے) مطبوعہ 1990 (اوراق لاہور میں 1977 تا 1987 شائع شدہ)
5 دل، داغ اور دنیا (افسانوی مجموعہ) تاریخ اشاعت درج نہیں
6 ہرچرن چاولہ کے منتخب افسانے 1992

ان کتابوں کے علاوہ درج ذیل تصنیفات بھی اہم قرار دی جاسکتی ہیں:

1 The Broken Horzon: (چاولہ کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ)، مطبوعہ 1974
2 آخری قدم سے پہلے (چاولہ کے افسانوں کا ہندی میں ترجمہ) مطبوعہ 1983
3 پانڈی دی عورت (پنجابی اور گورمکھی میں ترجمہ شدہ چاولہ کے افسانے) مطبوعہ 1985
4 ناروے کے بہترین افسانے، مطبوعہ 1989 (سترہ نارویجین کہانیوں کا اردو ترجمہ)
5 Anguish of Horse & Stories مطبوعہ 1990 (چاولہ کی کہانیوں کا انگریزی ترجمہ)
6 چاولہ کی ادارت میں منتخبہ ہندوستانی افسانے نارویجین زبان میں

ہرچرن چاولہ نے ضلع میانوالی (پنجاب) سے لے کر ناروے تک مختلف معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی حالات کا سامنا کیا ہے۔ پھر سیاحت کا شوق انھیں ملکوں ملکوں کے سفر اور وہاں کے طرز زندگی سے واقفیت پر مائل کرتا رہا ہے۔ دوسری طرف اپنے وطن کی محبت بھی دل میں جاگزیں رہی ہے۔ سفر نے دنیا داری بھی سکھائی ہے اور دوست داری بھی۔ انسانی رشتوں کا احترام بھی اور موقع بہ موقع کبھی نرم گفتاری اور کبھی گرگفتاری بھی۔ وہ طرح طرح کے لوگوں سے ملتے رہے ہیں جس کے سبب ان کے افسانوں میں نت نئے موضوعات و کردار بھی ملتے ہیں۔ عصری حسیت کے ساتھ ساتھ روایت کا حسن بھی موجود ہے۔ فضیل جعفری نے ایک خاصا تفصیلی اور تجزیاتی مضمون برسوں قبل لکھا تھا جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

(الف) ''ان کا تھیسس یہ ہے کہ کسی غیر ملک کو اپنا لینے کے بعد وہاں کے طور طریقوں، رسم و رواج اور لوگوں کو بھی پوری طرح اپنا لینا چاہیے...... لیکن اس کام چلاو سمجھوتے Working Compromise کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک فرد اور ایک فنکار کی حیثیت سے چاولہ اپنی ثقافتی شناخت کھو بیٹھے ہیں یا اپنی جڑوں سے ان کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔''

(ب) ''وہ افسانے میں ہیئتی و لسانی تجربات اور باریکیوں پر پلاٹ، موضوع اور کردار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی کہانیوں میں موڈ اور ماحول کو بھی اہمیت دی ہے۔ عام انسانوں کے مسائل، انسانی دکھ درد، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھنے اور بانٹنے کی خواہش، قومی اور بین الاقوامی مسائل کے تعلق سے افسانوی ردعمل، افراد کی نفسیاتی الجھنیں، جنسی ہوس پرستی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے لگاو اور ان کی بے حرمتی پر اظہار افسوس، سچائی اور جھوٹ کی آپسی کشمکش، معاشرتی ٹکراو ہوس اور معصومیت کے تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل وغیرہ وہ عناصر ہیں جنھوں نے چاولہ کے افسانوی کینوس کو کافی کشادہ بنا دیا ہے۔''

(ج) ''چاولہ کے افسانے پلاٹ، موضوع اور کردار کے افسانے ہیں۔ ان تینوں بنیادی افسانوی عناصر میں بھی انھوں نے کردار نگاری کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہ پلاٹ کی ساخت و بافت اور واقعات کی پیش کش کے مقابلے میں اپنے کرداروں کے ذریعے انسانی شخصیت کے مختلف ظاہری اور باطنی پہلووں کی نشاندہی اور ان کے تجربے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایسے کردار ضرور ملتے ہیں جنھیں معاشی مجبوریوں کے سبب یا پھر کسی اور وجہ سے ترک وطن کرنا پڑا، یہ کردار مشرق و مغرب سے وابستہ سب نہیں تو کم از کم کچھ روایات و اقدار کے تعلق سے کبھی نرم اور سرسری تو کبھی گہرے اور شدید ردعمل

کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن میری رائے میں ان کرداروں کا بنیادی مسئلہ محض بے زمینی یا جلاوطنی نہیں ہے۔ دراصل ان کے یہ کردار عمومی طور پر زندہ رہنے اور اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ کردار خواہ ایماندار ہوں یا دھوکے باز، مخلص ہوں یا منافق۔ جزوی طور پر مکمل ہوں یا نامکمل، بہرحال نہ صرف ایسے عام آدمی رہتے ہیں جن سے آئے دن ہمارا سابقہ پڑتا ہے، بلکہ جن میں ہم میں سے بہت سے لوگ خود اپنی جھلک بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

درج بالا نکات میں سے دو ہرچرن چاولہ کے افسانوں کا موضوعاتی تنوع واضح کرتے ہیں جب کہ پہلا نکتہ مغربی تہذیب سے متعلق ان کے نقطۂ نظر پر روشنی ڈالتا ہے جو ظاہر ہے براہ راست مشاہدہ اور تقابلی نتیجہ ہے۔ جس کام چلاؤ مفاہمت کا فضیل جعفری نے تذکرہ کیا ہے، وہ مغرب کے بعض اور افسانہ نگاروں کے یہاں بھی موجود ہے۔ دراصل یہ چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے سے متعلق رویہ ہے جو حقیقت پسندی نہ سہی مگر اس سے قریب تر ہے۔ یہاں صرف دو افسانوں کے حوالے سے ہرچرن چاولہ کے طرزِ فکر کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں۔

پہلا افسانہ 'زمین' ہے جس میں مغرب میں آباد افسانہ نگاروں کے عام نظریہ کے مقابلے میں ایک الگ نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ ہرچرن چاولہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ 'زمین' میں ان کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں خواہ کسی ضرورت کے تحت، وہاں کے رسم ورواج کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنالینا چاہیے چونکہ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس کہانی میں پریم اور اس کی بیوی سنیتا کا بنیادی کردار ہے جو ظاہر ہے مشرق کے کسی ملک سے ہجرت کرکے ناروے میں آباد ہوئے ہیں۔ جب ان کی بیٹی ریتا ایک ناروے کے لڑکے سے شادی کرلیتی ہے تو ماں کو سخت اعتراض ہوتا ہے اور وہ طے کرتی ہے کہ اپنے بیٹے آکاش کی شادی وہ کسی ہندوستانی لڑکی کے ساتھ مشرقی رسم ورواج سے کرے گی مگر کچھ ہی دنوں بعد اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی ناروے کی ہی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور تب وہ مان لیتی ہے کہ ناروے کے سیب بھی اتنے ہی میٹھے ہوتے ہیں جتنے ہندوستانی سیب۔ پھر وہ اپنے بیٹے کی شادی نارویجین لڑکی سے کردیتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نے اپنی انفرادی پہچان ترک کردی ہے۔ دراصل یہ فیصلہ وقت اور حالات کا تقاضا ہے جسے پورا کرنا ہی دانش مندی ہے۔

دوسرا افسانہ 'گنگا کی واپسی' ہے اس میں ایک بوڑھا باپ جو اپنے بیٹے کے یورپ چلے جانے کے باوجود حالات سے سمجھوتہ کرکے اپنے گاؤں میں ہی خوش تھا محض بیٹے اور بہو کی دلجوئی کی خاطر نہ صرف پردیس جانا گوارا کرلیتا ہے بلکہ اپنے منصب سے گر کر زندگی سے سمجھوتہ کرتا ہے اور بیٹا صفائی کا جو کام کررہا ہے اس میں اس کی مدد کرتا ہے، گرچہ وہ پھر بھی وہاں کے ماحول میں Adjust نہیں کرپاتا۔ غور کیجیے تو ''ریت، سمندر اور جھاگ'' میں یہ مسئلہ ایک نئے انداز سے پیش ہوا ہے۔

جہاں تک مغربی اقدار کی آئینہ داری کا سوال ہے، ہرچرن چاولہ اپنے ہم عصروں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ ایک طرف تو ان حالات کا بیان ہے جن سے ہجرت کرکے مغرب میں آباد ہونے والے ہندوستانی دوچار ہیں۔ روحانی تکلیف یا تہذیبی کشمکش کو الگ رکھیے تو صرف یہ حقیقت بھی کم دل شکن نہیں ہے کہ مغربی ممالک میں جاکر آباد ہوجانے والے ایشیائی کس طرح کی ابتر اور بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یعنی مادی آسائش جس کی تلاش میں وہ مغرب کی طرف گئے تھے وہ بھی پوری طرح ان کی دسترس میں نہیں ہے۔ مغرب کی آئینہ داری کی دوسری سطح خود وہاں کے تہذیبی زوال کا منظر نامہ ہے۔ یہاں صرف مغربی معاشرے کے اس پہلو کو دیکھیے جس کا تعلق جنسی بے راہ روی سے ہے، تو چاولہ کے کتنے ہی افسانے اس کی آئینہ داری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ 'پانی کی عورت' جیسی مغربی ماحول کی پروردہ عورت تو خیر دوسری ہی شے ہے، عورتوں اور مردوں کے آزادانہ جنسی تعلقات کی طرف یا جنسی فرسٹریشن اور ہوس ناکی کی طرف 'پوری بات ادھوری کہانی'، 'سچ کی بات' یا 'بے باک بات' میں بھی اشارہ ملتا ہے مگر 'ٹھرکی' اس موضوع پر لکھا گیا ایسا افسانہ ہے جس کی مثال ملنی محال ہے۔ ایک کردار جو ابتدا سے ہی Sexual Perversion کا شکار ہے، آخرکار اس نقطۂ عروج تک پہنچ جاتا ہے کہ ایک لڑکی سے شادی کرکے اسے محض نمائش کے طور پر اپنی بیوی قرار دیتا ہے مگر اسے دوسرے مرد کے ساتھ جنسی رابطہ کرنے کا خود ہی موقع دے کر محض لذت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہ عجیب وغریب صورتحال ہے جس کا بیان کہانی میں کچھ اس طرح ہوتا ہے:

''اب رانی اور راج کمار دونوں روپا کے گھر میں اور اس کے اپنے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت یکجا رہنے لگے تھے۔ دن بھر اور رات کے پچھلے پہر تک رانی روپا کی بیوی رہتی، پھر جب روپا بظاہر سو جاتا تو وہ راج کمار کی بیوی بن جاتی۔ سونے کی اداکاری کرنے والا روپا، خاموشی سے اور ایک چور دروازے سے ملحقہ کمرے میں ہونے والا سارا ڈرامہ دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا۔''

معاملہ یہاں تک تو سخت عبرت خیز اور نفرت انگیز ہے، مگر روپا کی بے غیرتی تو واقعی قابل ملامت ہے۔ اس کا ڈھیٹ انداز ملاحظہ ہو:

''یہ ساری کہانی سن کر راوی کے اندر موجود ایک غیرت مند مرد روپا سے پوچھتا ہے:

اپنی بیوی کو دوسرے کے پاس جاتے دیکھ کر تمھیں برا نہیں لگتا۔'' نہیں کسی دوسرے کی بیوی کے پاس جانے کا جو مزہ ہے وہ میں اسے بھی دیتا ہوں اور خود بھی حاصل کرتا ہوں۔''

کہہ سکتے ہیں کہ یہ ساری کہانی شروع تو ہندوستانی پس منظر میں ہوئی تھی۔ یعنی روپا ابتدا سے ہی جنسی بھوک میں مبتلا تھا۔ بات درست ہے مگر جنس کے حوالے سے جو بے راہ روی کے مناظر چاولہ نے بیان کیے ہیں وہ مغربی معاشرے کے مشاہدے پر ہی مبنی ہیں۔ ہندوستان میں آباد کوئی افسانہ نگار نہ تو اس طرح کی افسانہ نگاری کے بارے میں سوچ سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے۔

یہاں چاولہ کی بعض اور کہانیوں کے Dimensions کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں۔ مثال کے طور پر ان کی کہانی 'تمنا کے سُر' کو دیکھا جاسکتا ہے، جس میں ایک طرح سے ان مرحلوں یا محرکات کی تصویر کشی ملتی ہے جو چند برسوں کے لیے مشرق سے مغرب آنے اور پھر یہاں مستقل طور پر آباد ہوجانے والے جوڑوں کی کہانی سے عبارت ہیں۔

''ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی'' دونوں نوعمر ہیں اور جب راوی سے ان کی ملاقات ہوتی ہے تو بس چند برس یہاں رہنے کے بعد لوٹ جانے کے موڈ میں ہیں یعنی ع

یہ دنیا یہ محفل مرے کام کی نہیں۔ کم وبیش دس سال کے بعد ان سے راوی کی دوبارہ ملاقات ہوتی ہے تو کہتے ہیں:

''ادھر بچوں نے تعلیم ختم کی ادھر ہم نے بستر باندھا۔ یہاں پیسے کے سوا ہے ہی کیا۔ بس چند لاکھ بن گئے تو ہم واپس وطن کوچ کرجائیں گے اور وہاں کوئی اپنا کام دھندا شروع کردیں گے، تقریباً دس برسوں کے بعد اس جوڑے سے تیسری ملاقات ہوئی تو وہ صاحب کہنے لگے: بس ایک سال اور نکل جائیں پنشن ملے تو وطن کو سدھاریں۔ ریٹائرڈ لائف وطن میں گزارنے کا ارادہ ہے۔ بڈھوں کی کیا حالت ہے یہاں کوئی رہنے کا ڈھنگ ہے بھلا۔''

اور زندگی کے آخری دس سال گزرتے ہوئے جب راوی سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان کا بیان تھا:

''کہاں جائیں، بچے سیٹل ہوگئے ہیں۔ ہم اس بڑھاپے میں ان کو چھوڑ کر اور کہاں جاسکتے ہیں اب ہمارا وہاں ہے ہی کون۔''

اور پھر افسانہ نگار کا وہ آخری نوٹ:

''ارے یہ تو اپنا ہی گھر تھا اور اپنا ہی شیشہ اور شیشے نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا تھا، وہ چاروں روپ میرے

اپنے ہی تھے۔''

گویا یہ گھر گھر کی کہانی تھی جو ہرچرن چاولہ کی زبانی بیان ہوئی۔

یہیں پر چند باتیں میں ہرچرن چاولہ کے افسانوں کی تکنیک سے متعلق بھی عرض کرنا چاہتی ہوں۔ فضیل جعفری نے ان کے افسانے 'گھوڑے کا کرب' کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ انھوں نے گھوڑے کو انسانی استعارے کے طور پر برتا ہے۔ فرخندہ لودھی نے جو خود بھی ایک افسانہ نگار ہیں اسے علامتی کہانی قرار دیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ علامت اور استعارے میں بہرحال یہ فرق تو ضرور موجود ہے کہ استعارہ میں معنی ایک حد تک Fix ہو جاتے ہیں جب کہ علامتوں میں معنی Fix نہیں ہوتے۔ اب اس افسانے کے حوالے سے دیکھیے تو فضیل جعفری نے اپنے طور پر ایک معنی متعین کرکے اسے استعاراتی افسانوں کے زمرے میں رکھ دیا ہے اور یہ طے شدہ معنی بلاشبہ سب سے بہتر بھی ہے۔ مگر غور کیجیے تو افسانے کے اور بھی مفاہیم متعین کیے جاسکتے ہیں اور ایسے میں علامت سے اس کی قربت واضح ہو جاتی ہے۔ ان مباحث سے قطع نظر اگر یہ غور کیا جائے کہ آخر اس افسانے کی تکنیک ہے کیا، تو اندازہ ہوتا ہے کہ چاولہ نے اس افسانے میں گھوڑے کو ان تمام محنت کشوں یا مزدوروں کی مثال بنا کر پیش کیا ہے جن سے ان کے مالک نہ صرف یہ کہ زیادہ کام لے کر بہت واجبی اجرت دیتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ عام ہمدردی کا سلوک بھی اختیار نہیں کرتے۔ مگر یہ صرف ایک مفہوم ہے۔ افسانے میں مفاہیم کی اور سطحیں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ''گھوڑا'' کسی فرد کا نہیں پوری قوم یا کسی پورے علاقے کا استعارہ ہے۔ یہ وہ قوم، علاقہ یا طبقہ ہے جو مسلسل استحصال کا شکار ہے اور کوئی دوسرا ملک یا علاقہ اس کو نہ صرف ذلیل کرتا ہے بلکہ اس کا حق بھی نہیں دیتا۔ اب یہ دیکھیے کہ جب یہ مہاجر گھوڑا ایک دوڑ جیت جاتا ہے تب بھی اس کی محنت کا پھل اسے نہیں ملتا، جب اس کے سیاہ فام ہونے کا احساس ہوتا ہے تو اسے دوڑنے والوں کی صف میں آخری نمبر پر رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ گھوڑا جو دوڑ جیت چکا ہے مگر اپنے انعام یا بہ الفاظ دیگر اپنی محنت کی اجرت سے محروم ہے، اپنا قصہ خود ہی سنا رہا ہے:

''جج لوگ فیصلہ سنا رہے ہیں، جو سکینڈ آیا ہے اسے فرسٹ کر دیا جائے جو تھرڈ آیا ہے اسے سکینڈ اور اسی طرح آگے...... میں سب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں۔''

واقعہ یہ ہے کہ ''گھوڑے کا کرب'' ایک نئی تکنیک میں لکھی گئی کہانی ہے جس کو استعاراتی تو خیر ماننا ہی پڑتا ہے مگر علامتی بھی قرار دیا جاسکتا ہے، چونکہ استعارہ بہت واضح نہیں ہوتا۔

یہاں اسی طرح کی ایک اور کہانی ''بلاعنوان'' کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔ بجو ایک بندر ہے جس کی اصلیت بھی افسانے میں فوری طور پر واضح نہیں ہوتی۔ بہرحال کچھ آگے چل کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بندر ہے جسے اس کے بزرگوں نے تین سمتوں کی سیر کی اجازت دے رکھی ہے مگر چوتھی طرف جانے سے منع کیا ہے۔ اب یہ تجسس کا تقاضا ہے یا اتفاق کہ بجو ایک دن چوتھی کھونٹ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ادھر رہنے والے ایک انسان کے حسن اخلاق کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ آدمی اسے پہلے تو اپنا دوست بناتا ہے، پھر خود مداری بن کر اسے ناچنے اور پیسہ کمانے کے دھندے میں لگا دیتا ہے۔ یہاں تک تو خیر غنیمت ہے مگر ایک دن وہ غیر ملک میں رہنے والے کسی شخص کے ہاتھوں بجو کو بیچ دیتا ہے جو یورپ جاکر بھی اس کے ذریعے کمائی کرنے لگتا ہے مگر یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلتا۔ ایک دن پولیس والے اسے پکڑ لیتے ہیں اور بجو کو واپس وطن بھیجنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہاں جو گفتگو ہوتی ہے وہ قابل لحاظ ہے:

''مجبوراً اسے شو بند کرنا پڑا، دوسرے دن پھر اس نے مجمع لگایا تو اسے دھر لیا گیا اور تھانے لے جاکر اس شرط پر چھوڑا گیا کہ وہ ہفتے کے اندر اندر بجو کو اپنے وطن واپس بھیج دے گا۔ وہ رویا پیٹا تو بہت، اپنی غریبی، روزگار اور مجبوریوں کا واسطہ دیا۔ کہا کہ حضور یہی تماشے دیکھنے ہزاروں کی رقمیں خرچ کرکے آپ کے شہری ہمارے ملکوں کو جاتے ہیں۔ میں تو خدمتِ خلق کے جذبے سے آپ کے من بھاتے تماشے کو آپ کے دروازے پر لے آیا ہوں۔ مجھے تو حضور سرکار دربار سے انعامات سے نوازا جانا چاہیے اور آپ الٹا...... کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا مگر ادھر سے ایک ہی رٹ لگی رہی کہ یہاں دوسرے ملک کے جانور رکھنے کی اجازت نہیں۔'' (افسانہ بلاعنوان، ہرچرن چاولہ)

اس اقتباس کا آخری جملہ مغرب میں نسلی تفریق کی اس صورتحال کو اجاگر کرتا ہے، جس کا ''گھوڑے کا کرب'' کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں ان امور کی تکرار ضروری نہیں۔ بس یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ یہ افسانہ بھی اپنے اسلوب بیان کے سبب نیم علامتی یقیناً کہا جاسکتا ہے۔ وہ بھی ایسی صورت میں جب بجو (اسے آپ فرد سمجھیں یا پوری جماعت) واپس اپنے علاقے کو لوٹا دیا جاتا ہے اور جب وہ دوبارہ اپنے جھنڈ کے ساتھ قلانچیں بھرتا ہے تو مادی آسودگی بھلے ہی نصیب نہ ہو مگر آزادی کا ایک عجیب و غریب احساس اسے خوشی سے لبریز کر دیتا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بجو کو مختلف معنی عطا کیے جاسکتے ہیں، جس میں کم از کم ایک مفہوم یعنی مشرق کا آدمی تو بالکل نمایاں ہے۔

یہاں بس ایک افسانے کا اور تذکرہ کرنا چاہتی ہوں۔ 'اتصالی نقطے کا موڑ' نامی افسانے میں نہ صرف کردار بلکہ اس کے پس منظر کو بھی ہم ماضی کا استعارہ سمجھ سکتے ہیں مگر جس طرح واپسی پر در و دیوار اس کا استقبال کرتے ہیں اس کے پس منظر میں راوی خود ہی ایک استعارے کی شکل میں ابھرتا ہے۔

بہرحال ان امور کا خلاصہ یہ ہے کہ ہرچرن چاولہ نے Multi Dimensional افسانے لکھے ہیں۔ یہ صورت موضوع اور طرز بیان دونوں سطح پر دیکھی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا ہے، انھوں نے کئی طرح کے موضوعات اپنے افسانوں میں برتے ہیں۔ یہ موضوعات مقامی مسائل سے بھی متعلق ہیں اور بین الاقوامی یا ملکی صورت حال سے بھی۔ دراصل ہرچرن چاولہ نے جس طرح ملکوں کی سیر کی ہے اس کے سبب مغرب کے بھی مختلف ممالک ان کی نگاہوں میں اپنے تمام تر انفرادی پہلوؤں کے ساتھ ابھرے ہیں۔ ایک ملک کی طرز معاشرت یا تہذیبی روایت دوسرے سے خاصی الگ رہی ہے حالانکہ سبھوں کا تعلق یورپ سے ہی ہے۔ مشرق سے جو فرق ہے وہ تو ظاہر ہے۔ ایسے میں وہ صرف تارکین وطن کے سماجی اور جذباتی مسائل کی آئینہ داری تک محدود نہیں رہے ہیں بلکہ انھوں نے مختلف علاقوں کی ظاہری منظرکشی بھی کی ہے اور داخلی مشاہدہ کی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ جہاں تک اسلوب بیان کا سوال ہے، بعض کہانیاں تو انھوں نے خالص بیانیہ انداز میں لکھی ہیں اور کچھ استعاراتی یا نیم علامتی انداز میں مگر کچھ ایسی بھی کہانیاں ہیں جو خود کلامی کی یا خطوط کی تکنیک میں تحریر کی گئی ہیں۔ اپنی تخلیقی قوت، مشاہدے اور نقطۂ نظر کے سبب ہرچرن چاولہ کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں کیا جاسکتا ہے۔

مظہر امام نے درست لکھا ہے:

''ایسے کئی لکھنے والے تھے اور ہیں جن کی پہچان کسی تحریک یا رجحان کے حوالے سے نہیں، ہرچرن چاولہ بھی ان میں سے ایک ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ جو کچھ بھی وہ ہیں اپنی تحریروں کے بل بوتے پر ہیں، کسی خارجی سہارے کی بنا پر نہیں۔''

حوالے

1 بیسوی صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں: سید عاشور کاظمی
2 مقالہ ہرچرن چاولہ کی افسانہ نگاری، مطبوعہ رسالہ شاعر ممبئی، شمارہ: 12-11، 1989
3 عالمی اردو ادب از نند کشور وکرم، 2003

■

Dr. Tasneem Fatima
48/A, First Floor, Street No 22
Zakir Nagar, Okhla
New Delhi-25

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت

زاہد احسن

خواجہ حسن ثانی نظامی کی پیدائش 15/مئی 1931 کو دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے متصل ان کے پشتینی مکان میں ہوئی۔ تعلیم

ان کو وراثت میں ملی تھی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے دادا حافظ عاشق علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ درگاہ عالیہ کے مہتمم اور صاحب سجادہ اور مسجد کے امام بھی تھے۔ زندگی کے آخری مرحلے میں اپنے بیٹے خواجہ حسن نظامی سے فرمایا کہ درگاہ میں جو نذرانہ آتا ہے وہ پہلے وقتوں میں اس لیے نذرانہ تھا کہ لوگ اپنی عقیدت سے نذر کیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ رسم ہے کہ صندوق وغیرہ رکھ کر ایک طرح سے نذرانہ طلب کیا جاتا ہے، یہ نذرانہ نہیں ہے۔ میں نے تمام عمر قرآن کریم کی خدمت اور محنت سے روزی حاصل کی ہے۔ تم بھی محنت کرو اور حلال روزی کماؤ۔ حسن نظامی کم سن تھے، بات سمجھ میں نہیں آئی، کیا محنت کریں، سوچا درگاہ میں آنے والوں کی جوتیوں کی حفاظت کر کے جو معاوضہ ملے گا وہ حلال روزی ہوگی۔ یہ کام تین دن تک کیا کہ دیبہ کے ایک پنڈت جی درگاہ سے عقیدت رکھتے تھے ان کا صرافے اور کتابوں کا کاروبار تھا۔ انھوں نے صاحب زادے کو یہ کام کرتے دیکھا تو آب دیدہ ہوگئے کہ یہ کام اب میں نہیں کرنے دوں گا۔ اپنے ساتھ لے گئے اور کتابوں کے کام پر لگا دیا۔ ان دنوں خواجہ صاحب مدرسہ حسین بخش میں پڑھتے تھے۔ روز جامع مسجد سے بستی حضرت نظام الدین پیدل آتے تھے۔ ایک دن ببر کا تکیہ (بعد میں ہارڈنگ برج) کتابوں کا بنڈل کندھے پر لاد کر جا رہے تھے، ادھر سے شیخ پورہ برنادہ کے رئیس نواب بدھن خاں صاحب اپنے ہاتھی پر گزر رہے تھے انھوں نے اس خوبصورت بچے کو روک کر نام و پتہ پوچھا، جب معلوم ہوا کہ یہ صاحب زادے ہیں تو ہاتھی پر سوار کرلیا، داڑھی سے پیر صاف کیا اور اپنے محل سرا (محلّہ چتلی قبر دہلی) لے گئے، ہاتھی درگاہ کی نذر کردیا۔ نواب بدھن صاحب جب زندہ رہے، خواجہ سے پدرانہ محبت کا رشتہ رکھا، نواب صاحب کے انتقال کے بعد خواجہ صاحب نے انھیں اس خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کیا جو غالب اکیڈمی کے سامنے چبوترے پر واقع ہے۔

یہ واقعہ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی نے فاروق ارگلی سے بیان کیا کہ بعد میں جب پتا چلا کہ خواجہ کی نواسی مل والے سراج الدین صاحب کی بیٹی میری اہلیہ ہیں، تو خواجہ صاحب نے مجھ سے بے حد محبت کا اظہار کیا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے والد کی روحانی اور علمی شخصیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ دریبے والے پنڈت جی کے مشورے پر خواجہ صاحب نے ویدانت کی تعلیم بھی حاصل کی، برسوں تک رشی کیس اور ہمالیہ کے جنگلوں میں سادھو سنتوں سے ویدانت کا فلسفہ سیکھا، ہندی اور سنسکرت زبانوں کی آگہی حاصل کی اور یہ پنڈت جی بعد میں اسلام قبول کیے، اور انتقال کے بعد درگاہ شریف کے جوار میں دفن ہوئے۔ طویل بن باس کے بعد خواجہ صاحب نے قرآن کریم کا ہندی ترجمہ کیا۔ کرشن جی اور گرونانک اور رام جی پر کتابیں تصنیف کیں۔

ایسے باپ کے زیر سایہ خواجہ حسن ثانی نظامی کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ یہ بات فطری ہے کہ مذہبی رواداری اور احترام آدمیت کا اثر ان کی شخصیت پر پڑا اور انسانی قدروں کا جذبہ اور خلق اللہ کی محبت ہی تصوف کی روح ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی تعلیم کچھ اس طرح سے ہوئی۔ حرف شناسی سے پہلے قرآن مجید کی چند صورتیں مع ترجمہ حفظ کرائی گئیں، عربی فارسی کی تعلیم والدین سے سیکھی۔ انگریزی ادب کے لیے ایک یورپین گورنس مقرر تھیں، خواجہ صاحب کو اسی لیے انگریزی ادب پر بھی عبور حاصل تھا، کیونکہ انھوں نے خورد سالی ہی میں انگریزی کی بنیادی تعلیم حاصل کی تھی، اور ماڈرن عربک کا درس تو انھوں نے ایک عربی زبان کے ماہر انڈین فارن سروس کے ایک افسر سے لیا تھا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی نے اسلامیات میں گریجویشن کی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ سے حاصل کی اور ہمیشہ امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوتے رہے، اور خواجہ صاحب کو اس بات پر فخر حاصل تھا کہ ان کی تعلیم و تربیت قابل قدر اساتذہ سے ہوئی۔ چند اساتذہ کے نام پروفیسر مجیب، مولانا اسلم جیراج پوری، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر اے جے کیلاٹ، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر عاقل وغیرہ۔ خواجہ صاحب ہمیشہ اپنے اساتذہ کا بڑی عقیدت و محبت اور احترام سے نام لیتے۔ یہ ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت اس بات سے عیاں ہے کہ وہ عمدہ مترجم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کے تراجم و طبع زاد تحریروں میں روانی اور شگفتگی ہوتی تھی اور خواجہ صاحب بڑے فخر سے کہتے بھی تھے کہ

خواجہ حسن ثانی نظامی نے حکیم عبد الحمید دہلوی کا قلمی خاکہ لکھ کر اپنا نام روشن کیا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کی ادبی وفنی خصوصیات ان کے خطیبانہ مقالات اور موضوعاتی مضامین سے زیادہ ان کے تحریر کردہ قلمی چہروں سے نمایاں ہیں۔ خواجہ صاحب نے اپنے ہم عصروں کے بھی قلمی چہرے لکھے ہیں۔

ہمیں یہ ترجمے کا فن ڈاکٹر سید عابد حسین سے ملا، انھیں کی وجہ سے ہمیں غالب اور شیکسپیئر کو سمجھنے کا موقع ملا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کے سب سے اہم علمی کارناموں میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا متبرک مجموعہ ملفوظات فوائد الفواد کا تحقیق شدہ اردو ترجمہ ہے، خاص بات اس ترجمے کی یہ ہے کہ ساتھ ساتھ فارسی کا متن بھی درج کیا ہے اور علمی وادبی حلقوں میں یہ کاوش لاثانی قرار دی گئی ہے، اسی طرح دوسرا اہم کارنامہ علمی میدان کا حضرت مولانا فخر الدین کی حیات وکارنامے پر تحقیقی کتاب تصنیف کی ہے، یہ کتاب قابل قدر سمجھی گئی ہے، دلّی درسگاہ کا نام مدرسہ غازی الدین حیدر اسی لیے پڑا کہ نواب غازی الدین حیدر، مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔

الزام کی وجہ سے جب فخر الدین نظامی پر گرفتاری کا حکم جاری ہوا تو آپ مدرسے میں روپوش رہے جب الزام سے بری ہوئے تو غازی الدین حیدر نے شکرانہ کے طور پر مدرسے کی عالی شان تعمیر کروائی جو انھیں کے نام سے منسوب ہوگئی۔ یہ عمارت اجمیری دروازے کے قریب دہلی کالج کے نام سے مشہور ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی اہم کتابوں میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے حالات اور سیرت پر 'تذکرہ نظامی' اور امیر خسرو کی سوانح اور علمی شعری کارناموں پر 'تذکرہ خسروی' مقبول ترین تحقیقی کاوشیں ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کی تصوف پر مبنی کتاب غیر معمولی تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب نے اپنے مضامین کے ذریعے تاریخ، تصوف، سماجی بصیرت، تعلیم وتربیت کی اہمیت اور صوفی سلسلے، تصوف اور اخلاق، اجمیر کا عرس، ہندوستانی رسم ورواج اور بھگتی کے اثرات، موڈرن، صوفی حکیم ہمدرد یعنی ہر گوشے پر روشنی ڈالی ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی نے حکیم عبد الحمید دہلوی کا قلمی خاکہ لکھ کر اپنا نام روشن کیا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کی ادبی وفنی خصوصیات ان کے خطیبانہ مقالات اور موضوعاتی مضامین سے زیادہ ان کے تحریر کردہ قلمی چہروں سے نمایاں ہیں۔ خواجہ صاحب نے اپنے ہم عصروں کے بھی قلمی چہرے لکھے ہیں۔

خواجہ حسن ثانی نظامی شکار کے بے حد شوقین تھے اس لیے ان کی تحریریں بھی شکاریات کے موضوع پر دلچسپ انداز میں ہیں، خواجہ لکھتے ہیں کہ ہمیں یہ شوق اپنے ساتھیوں سے ملا اور قریبی ساتھیوں میں پروفیسر محمد علی خسرو، پروفیسر نثار احمد فاروقی، جس کا ذکر خواجہ صاحب دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے، مقالات کو مرتب کیا جو کہ ''خواجہ حسن نظامی پر' اردو اکیڈمی نے کرایا یہ سمنار خواجہ حسن نظامی حیات وخدمات پر مبنی تھا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ دہلی کی تاریخ وتہذیب پر گہری تھی۔ کیوں کہ ان کو دہلی کے بارے میں واقفیت بھی زیادہ تھی، اس بات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مزار ذوق کی واگزاری کا مقدمہ شروع ہوا تو خواجہ صاحب نے وہاں مزار کی موجودگی ثابت کی تھی، خواجہ صاحب دہلوی کی حیثیت ہندوستانی تہذیب وتمدن کے آئینے میں اور صوفی اسکالر کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح کی تھی، کیوں کہ ان کے لیکچر، کشمیر یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ذاکر حسین کالج، لیڈی سری رام کالج، کروڑی مل کالج، گرو تیغ بہادر یونیورسٹی وغیرہ میں تصوف اور دوسرے علمی موضوعات پر ہوتے رہتے تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت اس وجہ سے بھی تھی کہ اکثر اداروں کی طرف سے ہوٹل مینجمنٹ کے طلبا کی تربیت کے لیے دہلوی دسترخوان، کھان پکوان، یا نشست وبرخاست کے موضوع پر ان سے لیکچر دلوائے جاتے تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی بین الاقوامی سطح کی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کر چکے تھے۔ انقلاب اسلامی کے بعد ایران حکومت نے آپ کو تین دفعہ مدعو کیا اور وہاں پر اسلامی تاریخ تمدن کے موضوع پر ان کے خطبات مقبول ہوئے تھے اسی طرح سے آپ دوسرے ممالک کی مقبول یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم وتربیت وتصوف کے موضوع پر لیکچر دے چکے تھے، وہ یونیورسٹیز یہ ہیں (لندن یونیورسٹی، اسکول آف اورینٹل اور افریکن اسٹڈیز، امریکہ میں نیوجرسی کے امریکن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ماریشس کے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، جنوبی افریقہ کے کیپ ٹاون، ڈربن، اور جوہانسبرگ کے علمی وتہذیبی اداروں میں لیکچر دے چکے تھے، آپ کے خطبات مادری اور اردو کی طرح انگریزی زبان میں بھی رواں دواں تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت ایک محب وطن کی حیثیت سے بھی نمایاں تھی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کو سماجی اور تہذیبی اور قومی درد، اور لوگوں کی خدمات کی وجہ سے دہلی حکومت نے دہلی گرو، (فخر دہلی) کے اعزاز سے نوازا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو خادم کہتے تھے، گرچہ آپ آستانہ محبوب الٰہی کے مہتمم اعلیٰ تھے اور صاحب سجادہ نشین بھی۔ خواجہ صاحب محنت کرنے اور روزی کمانے کا درس اپنے والدین سے سیکھا تھا اور یہ چیز گویا ان کو وراثت میں ملی تھی کیونکہ انھوں نے اپنے والد خواجہ حسن نظامی (مصور فطرت) کو ہمیشہ دن رات پڑھتے لکھتے دیکھا۔ نظام المشائخ اور منادی کے بنڈل خود ڈھوتے دیکھا تھا اسی وجہ سے خواجہ حسن ثانی نظامی میں یہ صفت مزاج کا حصہ بنی رہی اور خوب محنت ولگن سے ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کی انفرادیت اس بات سے واضح ہوتی ہے بقول شمس الرحمٰن فاروقی۔

''آپ کی مسکراہٹ منہ پر کھلتی رہتی تھی کبھی آپ کھل کر نہیں ہنستے تھے۔ آپ کے دانت بہت ہموار اور صاف تھے، اس باب میں ان کے بھتیجے، سید محمد نظامی سلمہ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ ایک صاحب نے ان سے کہا کہ باوجود اس کے کہ آپ ذیابیطس کے مریض ہیں آپ کے دانت اس قدر روشن اور مضبوط ہیں تو آپ ان کے لیے کوئی دعا پڑھتے ہوں گے، خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم نے فرمایا کہ مجھے دوسروں کے لیے دعا کرنے سے فرصت نہیں ملتی، کہ اپنے لیے کچھ دعا کروں۔''

خواجہ صاحب کی انفرادیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب وہ اسپتال میں جاتے عیادت کے لیے تو ضرور کوئی نہ کوئی ایک حدیث سناتے، بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''میں خود اسپتال میں تھا اور آپ میری عیادت کے لیے آئے اور ایک حدیث سنائی اور کہا کہ رسول کا ارشاد ہے کہ کسی کی عیادت کے لیے جاؤ تو اسے میری کوئی حدیث سناؤ۔''

خواجہ حسن ثانی نظامی کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ وہ محبت واخلاق والے انسان تھے دوسروں کی عزت کرنا اور چھوٹوں کو عزت دینا ان کی پہچان تھی ان کی یہ سادگی، عاجزی چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی حد درجہ عزت کرنا یہ وہ باتیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ان کو رسولؐ کی سیرت سے کس قدر محبت تھی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کی ایک خوبی یہ بھی تھی وہ ایک سخی اور رحم دل انسان تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے رہے، اور اپنے اسلاف کی سنتوں کو زندہ کرتے ہوئے خانقاہ کی عظمت کو قائم رکھا۔

ایسے ملا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسے رہا کرو کہ زمانہ مثال دے

■

Dr. Zahid Ahsan
46/A, Thokar No6, Gali No 5
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

شہر آگرہ کا ادبی تعارف

محمودہ قریشی

آگرہ ملک ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کا ایک شہر ہے۔اس کا قدیم نام اکبرآباد ہے۔مغلیہ سلطنت میں آگرہ شہر بالخصوص بادشاہ اکبر کے زمانے میں دارالسلطنت رہا ہے۔جس کو سکندر لودی نے بسایا تھا۔سکندر لودی نے دہلی سے صفدر خاں کو آگرے کا حاکم بنا کر بھیجا۔

لیکن سیف الدولہ محمود پسر ابراہیم غزنوی کے آگرہ قلعہ فتح پر 'مسعود سعد سلیمان' نے دو قصیدے فارسی میں سیف الدولہ اور قلعہ کی شان میں لکھ کر بھیجے تھے جس میں آگرہ اور آگرہ قلعے کا ذکر ملتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

حصار آگرہ شد از میانہ گرد
بسان کدہ برد بادہ ھائی چون کھسار
امیر آگرہ جیسپال از گنبد
فرد دوید بہ پست آمد از سر بلند حصار

''اس گرد غبار کے درمیان آگرہ۔کا قلعہ دکھائی پڑا،قلعہ کیا تھا ایک پہاڑ تھا۔اس پیڑ جو بارے تھے وہ اپنی اپنی چھوٹے پہاڑ تھے۔''

ماہ نو روز دگر بارہ بما روی نمود
قلعہ آگرہ در آورد ملک زادہ بجنگ

تاریخ کے واقعات سے نہیں بلکہ شاعر کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ۔آگرہ اور آگرہ کا قلعہ سکندر لودی سے پہلے موجود تھا۔چونکہ سکندر لودی کا عہد سیف الدولہ کے عہد سے چار سو سال سے زیادہ قبل کا ہے۔

شہر آگرہ تہذیب و تاریخ کا مرکز شروع سے ہی رہا ہے۔آگرہ شہر اپنی خصوصیات کی بنا پر پوری دنیا میں قبولیت کی سند رکھتا ہے۔

یوں تو آگرہ شہر پوری دنیا میں اپنی عمارتوں کے سبب مشہور ہے۔

اس کے بعد مغلوں کا دور آتا ہے۔مغل دور میں تقریباً سب ہی بادشاہوں نے آگرہ شہر میں عمارتیں تعمیر کرائی ہیں۔

بابر نے آگرہ میں' آرام باغ' جو آج 'رام باغ' کے نام سے جانا جاتا ہے جہاں آج گھنی آبادی ہے۔بابر کے بعد شیر شاہ سوری اور اس کے بیٹے نے آگرہ فتح کیا۔ لیکن آگرہ کو عروج اکبر کے زمانے میں ہوا جس میں بادشاہ اکبر نے آگرہ کا لال قلعہ، فتح پور سیکری اور سکندرہ ہمایوں کا مقبرہ۔موتی مسجد وغیرہ کی تعمیر کرائی اور شاہ جہاں بادشاہ نے اپنی بیگم ممتاز کی یاد میں گنبد و محراب کی شکل میں' تاج محل' بنوایا۔جس نے پوری دنیا میں صرف آگرہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کو زینت بخشی۔تاج محل دنیا کا ایک عجوبہ ہے۔جس کو پوری دنیا سے لوگ دیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں۔کسی بھی ملک کا باشندہ ملک ہندوستان آئے اور تاج محل کی خوبصورتی کو دیکھے بغیر رہ جائے۔ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

میرزا ابو طالب کلیم ہمدانی،شاہ جہاں کا ملک الشعرا تھا۔اس نے 'شہنشاہ نامہ' نظم کیا ہے۔وہ اس میں آگرہ کی تعریف کرتے ہیں۔(ص98)

''اکبرآباد میں دل و دماغ کو مطمئن رکھنے، ساز و سامان ارزاں ہے۔ہزار شہر اس کے کوچوں میں گم ہیں۔ یہاں بہتا دریا، دریائے نیل کا ثانی ہے۔اس شہر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی اپنے دوست کی خبر گیری کے لیے قاصد بھیجے، تو واپس آتے آتے وہ قاصد بوڑھا ہو جائے۔ایسا شہر دنیا میں موجود نہیں ہر ملک کے لوگ یہاں بستے ہیں ظلم و ستم کا یہاں گزر نہیں،کوئی بلا، تمغا اور دیوانی پریشانیاں لاحق نہیں۔ہاں یہاں کے پری چہرہ دل ضرور اچک لیتے ہیں۔''

سب سے پہلے شاہ جہاں نے ہی آگرہ کو اکبرآباد کے نام سے پکارا ہے۔

اس کو بڑے بڑے نامور شعرا اساتذہ کرام اور دانشوروں نے اپنے نام و کام دونوں سے سینچا ہے۔ادب میں دبستان اکبرآباد بن کر ابھرا ہے۔ہمارے اردو ادب

کی یہ خوش قسمتی کہوں یا ادب کا اس سے لگاؤ کہ بڑے بڑے نامور شعراء اکرام اس سرزمین آگرو سے ہی نکلے ہیں جس نے ادب کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔اردو ادب کا نام لیا جائے اور دبستان اکبرآباد کو فراموش کر دیا جائے،ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

ادب کی تاریخ اکبرآباد کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

آگرہ شہر نے ہی اردو غزل کے بادشاہ میر تقی میر جیسا قادر الکلام شاعر اردو ادب کو دیا۔ اور مغلیہ دور کی آخری کڑی اور جدید دور کی پہلی کڑی سمجھے جانے والے مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی اسی شہر آگرہ کی دین ہیں۔

نظیر آکبرآبادی تو خود کہتے ہیں کہ

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے
ملا کہو، دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

اردو ادب کا سب سے بڑا عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی جو دہلی میں 1835 میں پیدا ہوئے لیکن آگرہ ایسے آئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنے کلام میں جابجا آگرہ شہر کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں صرف آگرو کے ہی رسم و رواج، آگرہ کے تہوار، آگرہ کی ککڑی، آگرہ کے میلے تیرا کی، بلدیو جی،کمال خاں اور دیگر میلوں،تہواروں، ہولی، دیوالی اور موسم کا ذکر اس طرح ادب میں پیش کیا ہے کہ اکبرآبادی ہونے کا حق ادا کر جاتے ہیں۔

میاں نظیر اپنی ایک مسلسل بردیف نظم 'آگرہ' میں اس شہر کے شاندار ماضی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

شداد زر لگا نہ بناتا بہشت کو
گر جانتا کہ ہووے گا آباد آگرہ

آگرہ کی جتنی خوبصورت منظر کشی نظیر اکبرآبادی نے کی ہے۔ اتنی شاید ہی کسی شاعر نے کی ہو۔ نظیر اکبرآبادی صاحب آگرہ میں موجودہ تاج گنج محلہ نوری دروازہ میں کرائے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ تاج گنج سے لڑکوں کو درس دینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ راستے میں آگرہ بازار سے روبہ رو ہونے کا موقع ملتا تھا۔آگرہ بازار کی وہ منظر کشی کرتے ہیں کہ آگرہ کی ہو بہ ہو تصویر کھینچ دیتے ہیں اور'ہولی' تو ان کی مشہور نظم ہے۔ تقریباً گیارہ نظمیں کلیات میں 'ہولی' پر موجود ہیں۔ نظم 'ہولی' میں اس کی بہاروں کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔

بقول کلیم الدین احمد:

''نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے۔''

نظیر کی شاعری سماجی شاعری ہے۔ اس میں سماج سے روبہ رو ہونے کا موقع ملتا ہے جس میں آگرہ تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اپنی نظم 'مفلسی' میں لکھتے ہیں:

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی
وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

وہ اپنی نظموں کے ذریعے معاشرے میں پھیلی گندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان چھوٹا بڑا خود نہیں ہوتا۔ اس کو حالات صحیح اور غلط کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں مفلس (غریب) آدمی کی حیثیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ جو صرف آگرہ کی ہی نہیں ملک ہندوستان کے ساتھ پوری انسانی حیثیت کو بیان کرتے ہیں۔ نظم آدمی نامہ میں لکھتے ہیں:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار ۔ بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر اکبرآبادی نے اپنی نظموں میں صرف زبان کے چٹخارے ہی نہیں بھرے بلکہ ان کی شاعری انسان دوستی کا درس دیتی ہے۔

آگرہ شہر ان کی محبت میں ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ہر سال بسنت پر رگھونشی گھرانے کی جانب سے 'بزم نظیر' کمیٹی مشاعرے کا انعقاد کرتی ہے اور ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ 'حبیب تنویر' نے بھی ایک ڈراما نظیر کے حالات و شاعری پر۔ 'آگرہ بازار' کے نام سے لکھا ہے۔ جو آج بھی ٹکنالوجی کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی شاعری اردو ادب میں درخشندہ ستارے کی مانند چمکتی رہے گی اور اکبرآبادی ہونے کا حق ادا کرتی رہے گی۔

آگرہ جسے صلح کل کی نگری کہا جاتا ہے۔ یہ صرف میر و نظیر کی دھرتی نہیں بلکہ صلح کل کی نگری اکبرآباد یہاں آنے والے ہر شخص کو محبت کا پیغام دیتا ہے۔ یہ ہماری وراثت ہے، جو کل بھی تھی، آج بھی ہے، اور ہمیشہ رہے گی۔ بقول رشید احمد صدیقی:

''مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں، تاج محل، اردو، اور غالب۔''

یہ آگرہ کی خوش قسمتی ہے کہ غالب اور تاج محل دونوں ہی شہر آگرہ ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی وراثت ہے اور جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے۔ اس زبان سے وابستہ ادبی روایت کی ایک خاص شکل بھی اکبرآباد میں پروان چڑھی۔

بادشاہ اکبر سے لے کر شاہ جہاں تک یہاں حکمراں ہوئے۔ اس زمانے سے لے کر آج تک آگرہ شہر اردو ادب کے قابل قدر شعرا و ادبا پیدا کرتا رہا ہے۔ جس سے اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہوتا رہا ہے۔

آگرہ شہر میں اردو ادب کے قدیم وجدید شعراء کرام ایک نظر میں:

اردو شاعری کا باوا آدم تو ولی دکنی کو کہا جاتا ہے جو کہ 1807 میں دہلی آئے اور شمالی ہند میں اردو شاعری کا رواج ہوا۔ ان ہی کے دور کے ایک اہم شاعر سراج الدین علی خاں آرزو تھے جو 1687 میں آگرہ میں ہی پیدا ہوئے۔ آرزو صاف سادہ آسان زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ جو کچھ دل میں آتا تھا کہہ گزرتے تھے۔ 26 جنوری 1756 میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

اور شاہ مبارک آبرو اور مظہر جانِ جاناں کی پیدائش بھی آگرہ میں ہوئی۔

اس کڑی میں دوسرا اہم نام غزل کے بادشاہ میر تقی میر کا لیا جائے گا جو کہ آگرہ کی سرزمین کے چشم و چراغ ہیں جس نے اردو ادب کو وہ زینت بخشی ہے جس کا مقابلہ آج تک کوئی نہیں کرسکتا۔ شہر آگرہ میں موجودہ ہینگ کی منڈی میں ان کا اصل مکان تھا۔ جو آج جوتا مارکیٹ ہے۔

میر 1723 میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے لیکن دہلی چلے گئے پھر اکبرآباد اور پھر دہلی اور دہلی اجڑنے پر لکھنؤ آصف الدولہ کے پاس چلے گئے۔ 1810 میں شہر لکھنؤ

مارے اردو ادب کی یہ خوش قسمتی ہوں یا ادب کا اس سے لگاؤ کہ بڑے ڑے نامور شعراء اکرام اس سر زمین گرہ سے ہی نکلے ہیں جس نے ادب ے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔اردو دب کا نام لیا جائے اور دبستان اکبرآباد و فراموش کر دیا جائے، ایسا ہو ہی ہیں سکتا۔

میں ہی انتقال ہوا۔ انھوں نے ادب کو 8 دیوان دیے ہیں۔ ان کی شاعری کو دل اور دلی کا مرثیہ کہا جاتا ہے۔ عشقیہ شاعری کرتے ہیں۔ میر کو عشق کی تعلیم ان کے والد نے دی تھی۔ چونکہ عشق ہی وہ شے ہے جس سے رازِ ہستی کا سفر طے کیا جاسکتا ہے۔ عشق میں میر کی ظاہری حالت، ان کے طور طریقے، ان کی طرزِ حیات ان کی کیفیات اور اپنے معاشرے سے عشق کی نوعیت محبوب سے بے التفاتی، اس کی بے وفائیاں درد و خلوص جس نے اردو غزل میں مثالی عاشق کا معیار قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

سمجھے انداز شعر کو میرے
میر کا سا کمال رکھے

پتہ پتہ بوٹہ بوٹہ حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

عشق کرتے ہوئے تھے بے خود میر
ان کو اپنا ہے انتظار ہنوز

ان کی خودنوشت 'ذکرِ میر' ہے جس میں پوری تفصیلات موجود ہے۔ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ 'نکات الشعرا' کے نام سے لکھا۔ کئی عشقیہ مثنویاں لکھیں اور مثنوی دریجو میر بھی میر کی مثنوی ہے۔

نجم الدولہ دبیر الملک خطاب، مرزا نوشہ لقب، اسد اللہ خاں نام، پہلے اسد پھر غالب تخلص اختیار کیا۔ اور اردو شاعری کا سب سے عظیم نام اس شہر آگرہ کی پیدائش ہے۔ غالب آگرہ میں 1897 میں موجودہ کالا محل جہاں آج اندر بھان گرلس انٹر کالج ہے میں پیدا ہوئے 13 برس کی عمر میں آگرہ سے کوچ کر دلی آگئے۔

غالب کو اپنے شہر کی یاد ستاتی تھی جس کا ذکر ایک خط میں کرتے ہیں۔

منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں:

''ہماری بڑی حویلی وہ ہے۔ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک گھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالاں محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اس کے آگے بڑھ کر ایک اور کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹہرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔''

کالے محل پیپل منڈی میں آج بھی مغلوں کے انداز کی یہ حویلی موجود ہے۔

اردو شاعری میں غالب وہ پہلے شاعر ہیں جس نے اپنے غم کو غمِ دوراں بنادیا۔ بقول عبادت بریلوی۔

غالب کی غزلوں میں ان کی زندگی کے المیہ کے ساتھ اس دور کا المیہ بھی موجود ہے۔ جس نے ان کو پیدا کیا تھا اور جس کے زیرِ سایہ انھوں نے اپنی زندگی کے دن گزارے تھے۔ ان کی شاعری کا غم انسانیت کا غم ہے۔

فرماتے ہیں:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

ان کی شاعری میں زندگی کا مربوط فلسفہ پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ان کے یہاں غم کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب نے شاعری کے ساتھ ساتھ 1850 میں اردو میں ایک نئے طرز میں خطوط نویسی کی بنیاد ڈالی جس سے اردو نثر کو فروغ ملا۔ غالب کے خطوط نے ہی، مراسلہ کو مکالمہ بنایا ہے۔ اردو میں وہ رنگ اختیار کیا ہے جو آج تک کسی کو نصیب نہ ہوسکا۔ یعنی اردو میں ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔

کیوں صاحب، پیر و مرشد، میاں بھائی صاحب جیسے الفاظ سے اس طرح خط کا آغاز کرتے ہیں کہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے خط نہیں بلکہ سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ غالب بلا کے شوخ مزاج تھے نظم ہو یا نثر شوخیاں ان کے یہاں موجود ہیں۔ ایک دوست کو رمضان میں خط لکھتے ہیں۔ نمونہ کلام دیکھیں:

''دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھالیا، یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے۔ اور روزہ بہلانا اور بات۔''

اور دہلی میں گلی قاسم جان بلی ماران میں ہی 1869 میں غالب اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔

جہاں 1869 میں آگرہ کا ایک عظیم شاعر رخصت ہوتا ہے وہیں 1869 میں آگرہ کی سرزمین نے ثاقب لکھنوی جیسا شاعر پیدا کیا جو کہ 1869 میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن لکھنؤ ایسا بسایا جس سے لکھنوی کہلائے۔

آگرہ کی ایک اور عظیم شخصیت سیماب اکبرآبادی کی شکل میں ہم سے روبرو ہوتی ہے۔ سیماب اکبرآبادی بھی شہر آگرہ میں 1880 میں پیدا ہوئے لیکن ان کا اصل نام سید، عاشق حسین تھا۔ داغ صاحب کی شاگردی اختیار کی ان کا پہلا مجموعہ کلام 'کلیم عجم' 1936 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'سدرۃ المنتہیٰ' اس کے علاوہ 'ساز آہنگ'، 'کار امروز' اور 'لوح محفوظ' ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اردو صحافت میں بھی انھوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ آپ نے آگرے میں 'قصر الادب' کی بنیاد ڈالی جس کے زیرِ اثر روز نامہ، ماہانہ، سہ ماہی ادبی صحافت کا انتظام کیا۔ ان کی سب سے اہم یادگار 'شاعر' ہے۔ یہ رسالہ 1935 سے آگرے سے تقسیم ہند تک شائع ہوا اور اس کے بعد ممبئی سے آج تک شائع ہو رہا ہے۔ سیماب اکبرآبادی صاحب اردو ادب میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں جو سرزمین آگرہ کی ہی دین ہے۔

سیماب اکبرآبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی اور یاس یگانہ چنگیزی کے زمانے میں صبا اکبرآبادی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ صبا اکبرآبادی 14 اگست 1908 میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ علی محمد آگرہ کے ممتاز ڈاکٹر تھے۔

صبا صاحب نے غالب کے دیوان کی تضمین کی ہے۔ آگرہ چھوڑ کر کراچی چلے گئے تھے۔ انھیں اپنے اکبرآبادی ہونے پر فخر تھا۔ لکھتے ہیں۔

زمانے نے مجھے بدلا نہیں ہے
ہمیشہ اکبرآبادی رہا ہوں

سیماب صاحب کے ہی ہم عصر شاعروں میں میکش اکبرآبادی کی شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں جو سرزمیں اگرہ کی وراثت ہے۔ میکش اکبرآبادی کی پیدائش مارچ 1902 میں بمقام میوہ کٹرہ آگرہ میں ہوئی اور شہر آگرہ نے ان کو زینت بخشی ہے۔ میکش اکبرآبادی کا اصل نام سید محمد علی شاہ تھا۔ صوفی شاعر تھے۔ یہ ان کی خاندانی وراثت تھی۔

ان کے بارے میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''حلیہ دیکھو تو ٹھیٹھ اکبرآبادی۔ دل ٹٹولو تو مکی مدنی بغدادی و اجمیری۔ میکش صاحب شاعری میں اس قدر صحیح مذاق اور لطیف طبیعت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے بس اللہ کا نام ہے۔''

پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق۔

آج میکش سے ملاقات میں محسوس ہوا
ہند میں صاحبِ عرفان ابھی باقی ہیں

لاکھ برباد سہی پھر بھی یہ ویران تو نہیں
اس خرابے میں کچھ انسان ابھی باقی ہیں

ان کے کلام میں کلاسکیت ,تصوف اور تغزل کی ہم آہنگی ہے۔ ان کے شعری مجموعے 'میکدہ'، 'داستان شب' ہیں۔ان کے علاوہ 'نغمہ اور اسلام'، 'نقد اقبال' اور 'مسائل تصوف' ہیں۔

آگرہ پر ان کی خصوصی کتاب 'آگرہ اور آگرے والے' ہے جس میں آگرہ کی تہذیب، رہن سہن، طور طریقے۔ آگرہ کی ادبی شخصیتیں تاج محل اس کا معمار، آگرہ کے مشاعرے آگرہ کے۔ میلے، جوتے دال موٹھ دری کار چوبی وغیرہ کا ذکر اس طرح پیش کیا ہے کہ آگرہ کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے۔

حقیقت سے فسانے تک فسانے سے نگاہوں تک
مرے پاس آتے آتے اس نے کتنے پیرہن بدلے
(میکش)

میکش صاحب آگرہ کے صوفیانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔اتنا ہی نہیں آگرہ سے ان کا دلی رشتہ ہے۔ جو آج تک 'بزم میکش' کے نام سے آگرہ میں انعقاد کی جاتی ہے جس کے سرپرست اجمل علی شاہ ہیں جو آستانہ میکش آگرہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ہر سال ادبی خدمات 'پر میکش ایوارڈ' تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بزم میکش کی جنرل سکریٹری موجودہ بیکنٹھی دیوی گرلس ڈگری کالج کی پروفیسر اور ہماری استاد ڈاکٹر نسرین بیگم صاحبہ اس کام کو اور شہر آگرہ کو اس کی خصوصیات کی بنا پر میکش اکبرآبادی صاحب کو عروج عطا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پورے ملک میں شہر آگرہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انھوں نے 'جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات' پر تحقیقی کام انجام دے کر اردو ادب میں اس کمی کو پورا کیا ہے۔جس کا پہلا ایڈیشن 2002 میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ آپ کے کئی مضامین رسائل وجرائد میں دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ آپ کئی نیشنل انٹرنیشنل سیمنار میں اپنے مقالات پڑھ کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

آگرہ کی مشہور ومعروف شخصیت ہمارے استاد محترم ڈاکٹر سید شفیق اشرفی نے آگرہ کا ادبی ماحول، موجودہ وقت میں کافی گرمایا ہے۔ استاد محترم سینٹ جانس کالج میں مولانا حامد حسن قادری صاحب کے بعد شعبہ اردو کے صدر رہے ہیں۔ تاریخی سینٹ جانس کالج میں پی جی اردو کلاسز کی شروعات آپ کی ہی محنت کا ثمرہ ہے جس سے طلبہ کی راہ روشن ہوئی۔ آپ نے شہر آگرہ کی ادبی سرگرمیوں کو کافی ہوا دی استاد محترم نے پچھلے 26-25 سالوں سے آگرہ کے ادبی حلقوں میں جو محنت صرف کی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مشاعروں سیمناروں وغیرہ کا انعقاد کرنا اس کو عملی جامہ پہنانے میں اپنی ادبی نوازش کا ثبوت پیش کر آگرہ کے ادبی حلقوں کو وہ وقار عطا کیا ہے کہ جس سے آگرہ شہر آج بھی اپنے ادبی معیار کو قائم کیا ہوا ہے۔ آج بھی آگرہ سے استاد محترم کی محبت اسی آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔ان کی نگرانی میں آگرہ شہر کے ادبی حلقوں نے ادب میں گرانقدر اضافہ کر ادب میں اپنا وقار اونچا کیا ہے۔استاد محترم کا ادب سے لگاؤ اور دلچسپی ہے کہ آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

اس کے علاوہ ادب کے گیسو صرف شعراء کرام حضرات ہی نہیں سنوارتے بلکہ ہمارے اہل قلم ادیب و دانشور بھی اس سازگار فضا میں اپنی سرزمین آگرہ کو اپنی تخلیقات سے ادب میں بلند مقام عطا کرتے ہیں۔ جن میں عظیم بیگ چغتائی، ل احمد اکبرآبادی، لطیف الدین احمد، انجم آفندی، مفتی انتظام اللہ شہابی، مرزا حاتم علی بیگ، بلوان سنگھ راجہ، رجب علی بیگ سرور، آل احمد سرور وغیرہ کے نام لیے سکتے ہیں۔

حامد حسن قادری صاحب تاریخی سینٹ جانس کالج آگرہ میں طالب علم اور پھر پروفیسر رہے ہیں۔

مختلف صنف میں انھوں نے اپنی یادیں چھوڑی ہیں۔تاریخ گوئی میں ان کو امتیاز حاصل ہے۔ان کا سب سے اہم کارنامہ ضخیم تصنیف 'داستان تاریخ اردو' ہے جو 1938 میں لکھی گئی۔ داستان کی صورت میں اردو کی پیدائش سے لے کر عہد جدید تک کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔اس سے کوئی بھی محب اردو استاد اور طالب علم بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

اس رومان انگیز ادبی فضا میں اردو کے ایک ممتاز انشاپرداز شاہ نظام الدین دلگیر اکبرآبادی نے بھی آگرہ سے 'نقاد' کا پہلا پرچہ جنوری 1913 میں شائع کیا۔

1930 میں سیماب اکبرآبادی صاحب کا رسالہ 'شاعر' بھی آگرہ کی دین ہے۔

مرزا غالب ریسرچ اکادمی آگرہ سے سید اختیار جعفری صاحب نے 2014 میں 'آگرہ میں اردو صحافت' کے حوالے سے گیارہ ابواب پر مشتمل کتاب تحریر کی جس میں جعفری صاحب نے کافی تحقیق کے بعد 182 اردو رسالوں اور دیگر زبانوں کے رسائل کا ذکر کتاب میں کیا ہے جو آگرہ میں اردو صحافت کی کمی کو پورا کرنے میں ایک مثال قائم کرتی ہے۔

اردو کے ارتقا میں آگرے کے اہل علم و ہنر نے ہر دور میں نہایت اہم حصہ لیا ہے۔اور لے رہے ہیں۔

یعنی شہر آگرہ اردو ادب کے ہر شعبے میں آگے ہے۔ ہر دور میں بلند پایا شعراء اکرام کے ساتھ ساتھ علم دوست انسان پیدا کرتا رہا ہے۔ جس سے ملک وادب کا وقار اونچا ہوتا ہے۔ ہمارے اہل قلم دوست آج بھی اسی آب وتاب کے ساتھ اردو ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اور ان شاء اللہ دیتے رہے گے۔ یہ علم و ہنر کا مرکز اور صلح کل کی نگری ادب میں یوں ہی اپنے قلم کے ذریعے ،اپنی تخلیقات کے ذریعے ملک وادب میں محبت کا پیغام دیتی رہے گی۔

''اکبر کے نام سے ہوا آباد آگرہ۔''

شہر آگرہ اردو ادب کے ہر شعبے میں آگے ہے۔ ہر دور میں بلند پایا شعراء اکرام کے ساتھ ساتھ علم دوست انسان پیدا کرتا رہا ہے۔ جس سے ملک وادب کا وقار اونچا ہوتا ہے. ہمارے اہل قلم دوست آج بھی اسی آب وتاب کے ساتھ اردو ادب کی خدمات انجام دیے رہے ہیں۔اور ان شاء اللہ دیتے رہے گے۔ یہ علم و ہنر کا مرکز اور صلح کل کی نگری ادب میں یوں ہی اپنے قلم کے ذریعے ,اپنی تخلیقات کے ذریعے ملک وادب میں محبت کا پیغام دیتی رہے گی۔

حوالہ جات

1. غالب اور آگرہ، مرتب: شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی
2. آگرہ اور آگرہ والے ,میکش اکبرآبادی ,مرتب :سید حیدر علی شاہ رند
3. یادگار غالب :الطاف حسین حالی
4. غالب نامہ: پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
5. ماہنامہ 'شاعر' آگرہ نمبر، اعجاز صدیقی اکبرآبادی، مکتبہ الادب آگرہ
6. غالب ایک مطالعہ :ممتاز حسین
7. کلیات نظیر :نظیر اکبرآبادی
8. نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی :پروفیسر آل ظفر
9. آب حیات :محمد حسین آزاد
10. آگرہ میں اردو صحافت :سید اختیار جعفری
11. جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات :نسرین بیگم
12. ماہنامہ 'آجکل' فروری 2001

Mehmooda Qureishi
22/78, Dholi Khar Mantola Ngra Fort
Agra - 282003 (UP)
Mob.: 7417912943

استوتی اگروال

ڈاکٹر سیفی سرونجی سے گفتگو

سیفی سرونجی کا تعلق مدھیہ پردیش کی مردم خیز سرزمین سرونج سے ہے۔ انھوں نے مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ تقریباً 75 کتابیں ان کی منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بھی کتابیں اور مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی ادارت میں 'عالمی انتساب' کے نام سے ایک رسالہ طویل عرصے سے شائع ہورہا ہے۔ اس مجلے کے کئی خصوصی شمارے علمی اور اردو دنیا میں بہت مقبول ہوئے۔ سیفی سرونجی سے استوتی اگروال نے ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔ پیش ہیں انٹرویو کے کچھ اہم اقتباسات:

استوتی اگروال: سب سے پہلے آپ اپنی زندگی پر روشنی ڈالیں؟

سیفی سرونجی: میں اپنی زندگی کے بارے میں کیا بتاؤں کہ اس بارے میں کئی انٹرویو میں جواب دے چکا ہوں ظاہر ہے اگر میں 1953 میں پیدا ہوا تو اب 54 کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بہر حال میں سرونج کے ایک گاؤں پگرانی مہوہ کھیڑا میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوا۔ پورا بچپن گاؤں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا اور دس بارہ سال کی عمر میں گاؤں سے سرونج قرآن حفظ کرنے کے لیے اسلامیہ مدرسے میں داخلہ لیا۔ کچھ پارے حفظ کیے پھر ہی آوارہ گردی۔ بچپن میں فلمیں دیکھنے کا بہت شوق رہا اور فلمی گانے سننے کا اس حد تک شوق تھا کہ ایک اعلان پڑھ کر دہلی سے قسطوں میں ریڈیو منگوا لیا پچاس روپے پیشگی بھیج دیے جب وی پی آئی تو اُس میں صرف خالی ڈبہ نکلا اور اُس میں ایک خط کہ ہم سو روپے وی پی کے ساتھ ریڈیو الگ سے بھیج رہے ہیں۔ اُس زمانے میں سو روپے ہمارے لیے دس ہزار روپے سے کم نہ تھے وی پی آئی تو ریڈیو رہن رکھنا پڑا۔ بہر حال ریڈیو آ گیا اور اُس میں پہلا گانا 'او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے' آیا ویسے بھی اس فلم 'اڑن کھٹولا' میں جب یہ گانا دیکھا تو ہم پر بے ہوشی طاری ہو گئی اس گانے نے اتنا متاثر کیا کہ بعد میں ہم نے 'ہم رہ گئے اکیلے' کہانی لکھی جو کئی رسائل میں شائع ہوئی حد تو یہ ہے کہ پہلے افسانوی مجموعے کا نام بھی 'ہم رہ گئے اکیلے' رکھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی بیڑی کارخانے میں بیڑی بنانے کا کام کرنے لگے کمایا کچھ بھی نہیں جتنے کی بیڑی بناتے تھے اُس سے زیادہ پیسوں کی چائے پی جاتے تھے تیرہ سال کی عمر میں ہی ہماری شادی پڑوس کے ایک نصیر خان کی بیٹی آسیہ سے ہوگئی سولہ مئی 1969 جب ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتقال ہوا تھا ہم دولہا بنے تھے کئی دن تک ہمارے ریڈیو پر گانے آنا بند ہو گئے تھے اس لیے ہمیں یاد رہا ہمارا تعلق گدی برادری سے ہے۔ میرے نانا مشہور ڈاکو تھے جو اسحاق ڈاکو کے نام سے جانے جاتے تھے ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد ان کا دل سوا سیر کا نکلا تھا راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بہت مشہور تھے کئی اخبارات اور ستیہ کتھا میں ان کے بارے میں خبریں شائع ہوئی تھیں گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا نہ کوئی ادبی ماحول تھا بیڑی کارخانے میں ضرور شعری نشستیں اور مشاعرے ہوا کرتے تھے اتفاق سے یہ کارخانہ مشہور شاعر دلکش ساگری کا تھا سید منور علی جو بیڑی

> بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی بیڑی کارخانے میں بیڑی بنانے کا کام کرنے لگے کمایا کچھ بھی نہیں جتنے کی بیڑی بناتے تھے اُس سے زیادہ پیسوں کی چائے پی جاتے تھے۔

میرے نانا مشہور ڈاکو تھے جو اسحاق ڈاکو کے نام سے جانے جاتے تھے ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد ان کا دل سوا سیر کا نکلا تھا راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بہت مشہور تھے کئی اخبارات اور ستیہ کتھا میں ان کے بارے میں خبریں شائع ہوئی تھیں۔

کارخانے میں کام کرتے تھے ایک استاد شاعر تھے یہ نشستیں اور مشاعرے سُن سُن کر ہمارے ذہن پر بھی شاعری کا بھوت سوار ہوگیا اور سب سے پہلے نعت لکھی جو ماہنامہ حریم، لکھنؤ سے شائع ہوئی بس یہیں سے ہمیں ادبی ذوق پیدا ہوا اور شعر کہنے کی ابتدا ہوئی۔

اا: سیفی صاحب آپ کی زندگی میں آسیہ سیفی کا کیا رول رہا ہے؟ تفصیل سے بتایئے

س س : شادی چونکہ بچپن میں ہوگئی تھی۔ چار پانچ سال کے بعد رخصتی ہوئی ہم نے کبھی زندگی میں کچھ کمایا نہیں تھا آسیہ سیفی کے آتے ہی ہمیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا لیکن قدرت ہم پر ہمیشہ مہربان رہی ہے آسیہ سیفی پہلے ہی بیڑی بنانا سیکھ چکیں تھیں اس لیے گھر کا سارا خرچ گویا آسیہ سیفی کے بیڑی بنانے سے ہی چلتا تھا بلکہ کئی مرتبہ تو ہم ان کے پیسے بھی کھا جاتے تھے بہرحال زندگی گزرنے لگی لیکن ہمارے سر پر تو شاعری کا بھوت سوار تھا اسلامیہ مدرسے میں پہلی بار طرحی مشاعرہ ہوا جس کا مصرعہ تھا 'خاک کو کندن بناتی ہے نگاہِ مصطفیٰ' ہم نے پہلی بار اس طرحی مشاعرے میں شرکت کی اب بیڑی کارخانے میں ہم تاریخی ناول پڑھ کر سنانے لگے نسیم حجازی، صادق سردھنوی جب یہ تمام ناول ختم ہوگئے تو ابنِ صفی کے ناول پڑھنے لگے ان کتابوں کے پڑھنے سے ہمیں کہانی لکھنا آگیا ابتدائی رسائل جن میں کہانیاں غزلیں چھپیں حریم، بڑھتے قدم، گلکدہ، خاتون مشرق وغیرہ تھے اُس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا تو آج تک ختم نہیں ہوا۔

اا: اب تک آپ کی کتنی کہانیاں، غزلیں اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں؟

س س : 1969 سے چھپنا شروع کیا تھا گویا نصف صدی ہوگئی ان پچاس سالوں میں دو ہزار غزلیں، سیکڑوں مضامین، کہانیاں، تبصرے، انشائیے، اور 75 کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں 8 کتابیں میری شخصیت اور فن پر ہیں باقی 67 کتابوں کا میں مصنف اور مرتب ہوں۔

اا: آپ نے 'انتساب عالمی' کب نکالا اور 'انتساب نام' آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟ سولہ صفحات کے انتساب سے لے کر آج تک کے انتساب کے سفر کے بارے میں تفصیل سے بتایئے۔

س س : دراصل بات یہ ہے کہ 82-80 میں فضل تابش جو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سیکریٹری تھے۔ ان کے گھر پر اقبال میدان میں بہت سے پروفیسر حضرات جمع تھے پروفیسر آفاق احمد صاحب، کوثر جہاں، وقار فاطمی صاحب جن کی وجہ سے ہم فضل تابش صاحب کے بالکل قریب ہوگئے تھے۔ فضل تابش نے وہاں کہا کہ یار وقار! میں 'انتساب' کے نام سے اردو اکادمی کا رسالہ نکالنا چاہتا ہوں ویسے ہمارا خواب تو بہت پرانا تھا بچپن سے ہی ہمیں رسالہ نکالنے کا شوق تھا وہ بھی اس لیے کہ ہم نے تمام بڑے ادیبوں کی سوانح حیات پڑھی تھی اور زیادہ تر بڑے ادیبوں نے رسالہ یا اخبار ضرور نکالا ہے مثال کے طور پر ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سرسید احمد، علی سردار جعفری، نیاز فتح پوری، پریم چند اور ہمارا یہ یقین تھا کہ آدمی کو اپنی بات کہنے کا سب سے اچھا وسیلہ اگر ہے تو اخبار یا رسالہ ہے۔ ایک سال تک فضل تابش نے کوئی رسالہ نہیں نکالا۔ ایک دن ہم نے فضل تابش صاحب سے کہا کہ صاحب انتساب تو آج تک نہیں نکل پایا اگر آپ نہیں نکال پا رہے تو ہم نکال لیں؟ فضل تابش نے کہا، ''جب اردو اکادمی نہیں نکال سکی تو تم کیسے نکال لوگے؟ سرمایہ کہاں سے لاؤ گے؟ ہم نے کہا کہ سرمایہ کی ضرورت نہیں، سرمایہ سے زیادہ اس میں ہمت اور ارادے کی ضرورت ہے جو ہم میں ہے اس طرح ہم نے جون 1983 میں پہلا پرچہ اخباری شکل میں 16 صفحات پر مشتمل شائع کیا۔ 16 صفحات سے بڑھ کر اب انتساب 250 صفحات پر مشتمل شائع ہو رہا ہے، جبکہ اس کے خصوصی نمبر جو 25 کے قریب ہیں 500-500 صفحات پر مشتمل ہیں جیسے بشیر بدر نمبر سات سو صفحات پر مشتمل ہے اسی طرح ظفر گورکھپوری نمبر، خالد محمود نمبر، ایوب واقف نمبر، دیپک بدکی نمبر، چندر بھان خیال نمبر، گوپی چند نارنگ نمبر، ندا فاضلی نمبر، پروفیسر حامدی کاشمیری نمبر، مظفر حنفی، حافظ کرناٹکی نمبر اور دیگر کئی نمبر شائع ہوچکے ہیں اور اب انتساب کی ادبی خدمات پر ایک ریسرچ اسکالر نے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کرلی ہے۔

اا: 'انتساب عالمی' کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟

س س : یہ سوال مجھ سے کئی لوگ کرچکے ہیں حد تو یہ ہے کہ لیاقت جعفری نے ایک ٹی وی سیریل کے لیے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا تھا ''اگر آپ کی زندگی سے انتساب نکال لیا جائے تو آپ کیا بچتے ہیں؟'' میں نے اُس وقت بھی کہا تھا کہ انتساب کی اشاعت سے پہلے میری سیکڑوں غزلیں، کہانیاں، انشائیے چھپ چکے تھے بلکہ انتساب کی اشاعت سے میری شاعری پس پردہ چلی گئی اور مجبوراً مجھے تبصرے اور مضامین لکھنا پڑا۔ رہا انتساب کی مقبولیت کا راز تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں پانچ مرتبہ لندن کے انٹرنیشنل سیمناروں میں شرکت کرچکا ہوں جہاں دنیا کے تمام بڑے شاعروں ادیبوں سے رابطہ ہوا اور بے شمار انتساب کے خریدار لندن، امریکہ، جرمنی، کینڈا، پاکستان سے آئے ہوئے ادیب وشاعر سب انتساب کے نہ صرف خریدار بن گئے بلکہ، ان تمام نے پوری دنیا میں انتساب کو پھیلانے میں ایک اہم رول ادا کیا اس طرح انتساب مقبول ہوتا چلا گیا۔

ایک دن ہم نے فضل تابش صاحب سے کہا کہ صاحب انتساب تو آج تک نہیں نکل پایا اگر آپ نہیں نکال پا رہے تو ہم نکال لیں؟ فضل تابش نے کہا، ''جب اردو اکادمی نہیں نکال سکی تو تم کیسے نکال لوگے؟ سرمایہ کہاں سے لاؤ گے؟ ہم نے کہا کہ سرمایہ کی ضرورت نہیں، سرمایہ سے زیادہ اِس میں ہمت اور ارادے کی ضرورت ہے جو ہم میں ہے۔

اا: آپ کی خودنوشت 'یہ تو سچا قصہ ہے' بہت مقبول ہوئی اس کی کیا وجہ ہے؟

س س: اُس کی وجہ صرف اُس کی سچائی ہے کہ میں نے اپنی سوانح حیات میں جھوٹ سے پرہیز کیا ہے جو زندگی میں نے جی اسے ہو بہو پیش کردیا ہے دوسرا یہ کہ میں نے اس میں اعلیٰ زبان استعمال نہیں کی ویسے بھی میں اعلیٰ زبان سے واقف نہیں ہوں لیکن اس کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ سادہ زبان میں ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں نے کیا ہے اور اسے بہترین خودنوشت تسلیم کیا ہے مثال کے طور پر اختر الواسع، مقصود الٰہی شیخ، انجم عثمانی، علی احمد فاطمی، افتخار امام، نصرت ظہیر، احمد عثمانی، حقانی القاسمی، مراق مرزا وغیرہ حد تو یہ ہے کہ نصرت ظہیر نے یہ تک لکھ دیا تھا کہ'' گاندھی جی کی آپ بیتی 'تلاشِ حق' یا truth My expressions with کے علاوہ کوئی ایسی سوانح عمری نہیں پڑھی جس کی ہر سطر پر دل نے گواہی دی ہو کہ ہاں! یہ سچ ہے، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سیفی سرونجی کی کتاب کی ہر سطر کو سچ ماننے

کی دل گواہی دیتا ہے'' اسی طرح میرا سفرنامہ ''سرونج سے لندن تک'' بیحد مقبول ہوا جس کے بارے میں پاکستان کے مشہور نقاد انور سدید نے لکھا تھا،'' یہ سفرنامہ ایسا ہے کہ جسے 50 سے زیادہ ادیب پڑھ چکے ہیں اور سفرنامہ اب بھی سفر میں ہے'' اسی طرح اس سفرنامے پر کینڈا کے مشہور ادیب عبدالقوی ضیا، لندن کے مقصود الہٰی شیخ، سوہن راہی، گلشن کھنہ، ساحر شیوی، نقشبند قمر نقوی، معراج جامی کے علاوہ کئی قلمکاروں نے بیحد پسند کیا۔ یہ دو کتابیں میری بہت مشہور ہوئیں۔

اا: میں نے آپ کی آپ بیتی میں پڑھا تھا کہ آپ نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب خریدنے کے لیے تین دن تین راتیں بیڑی بنائیں جس سے متاثر ہوکر انور سدید نے بہت بہترین تبصرہ کیا تھا اور ڈاکٹر مہتاب عالم نے ای ٹی وی کے ذریعے اس واقعے کو پوری دنیا میں پھیلایا۔ ذرا تفصیل سے بتائیں۔

س س : بات یہ ہوئی کہ میری لائبریری میں اکثر شہر کے تمام معتبر شاعر ادیب بیٹھتے تھے اور بارہ بجے رات تک ادبی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا اب تک ہم نے کوئی ادبی کتاب نہیں پڑھی تھی، صرف تاریخی ناول اور جاسوسی ناول پڑھے تھے لیکن ہماری انہیں دنوں ایک نظم 'ہماری زبان' میں شائع ہوئی جس کے ایڈیٹر اُس وقت آل احمد سرور تھے جب پروفیسر خالد محمود دہلی سے آئے تو انھوں نے نظم کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا،'' تمھارے چھپنے کا سلسلہ اچھا ہے، لیکن کیا تم نے ادبی کتابیں پڑھیں؟'' انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا اور غالب سے متعلق کچھ کتابوں کے نام بتائے ہم نے کہا پڑھنے کی بات تو دور، ہم نے اُن کے نام بھی نہیں سنے وہ حیران رہ گئے اور کہا کہ پھر تمھارے چھپنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی درمیان پروفیسر مختار شمیم آئے تو انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ پہلے ادبی کتابیں پڑھیے۔ اس طرح ہم نے سب سے پہلے جس کتاب کا انتخاب کیا وہ تھی ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب'' اردو شاعری کا مزاج'' اس کتاب کو خریدنے کے لیے ہم نے تین دن تین راتیں محنت سے بیڑی بناکر کتاب کے پچھتر روپے جمع کیے، لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہم شاعری مکمل طور پر بھول چکے تھے اور ہم نے محسوس کیا کہ واقعی اب تک تو پورے جاہل تھے۔ اس طرح تنقیدی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ واقعہ جب ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید نے سنا تو اتنے متاثر ہوئے کہ وزیر آغا نہ صرف اپنا رسالہ ''اوراق'' بلکہ اپنی ہر نئی کتاب بھیجنے لگے۔

اا: آپ کس طرح کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں؟ اور اب تک اندازاً کتنی کتب کا مطالعہ کر چکے ہوں گے؟

س س : مطالعے کی کوئی حد نہیں ہوتی، نہ کتابیں گن کر پڑھی جاتیں جو کتاب اچھی لگتی ہے وہ مطالعے کے لیے خود مجبور کر دیتی ہے ہاں! تنقیدی کتابیں ضرور زبردستی پڑھنا پڑتی ہیں۔ جیسا کہ میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ بچپن میں نے تاریخی ناول پڑھے نسیم حجازی، صادق سردھنوی، عبدالحلیم شرر، خان محبوب طرزی، الیاس سیتاپوری کے بعد ابن صفی کے تمام ناول پڑھ ڈالے یہی نہیں انگریزی ناولوں کے ترجمے 'مثلاً ظلِ ہما'، 'ایشا ایشا کی واپسی' مظہر الحق علوی کے تمام انگریزی ترجمے وغیرہ۔ ادبی کتابیں میں نے بہت بعد میں پڑھنا شروع کیں 'مقدمہ شعر و شاعری'، 'یادگار غالب'، 'شعر العجم' اور سب سے زیادہ میں نے تمام بڑے مصنفین کی آپ بیتیاں پڑھی ہیں جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' گاندھی جی کی The Story of my Experiments with Truth پنڈت جواہر لعل نہرو کی "Discovery of India" ابوالکلام آزاد کی 'غبار خاطر' وغیرہ۔ نئے ناول

ہم نے سب سے پہلے جس کتاب کا انتخاب کیا وہ تھی ڈاکٹر وزیز آغا کی کتاب'' اردو شاعری کا مزاج'' اس کتاب کو خریدنے کے لیے ہم نے تین دن تین راتیں محنت سے بیڑی بناکر کتاب کے پچھتر روپئے جمع کیے، لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہم شاعری مکمل طور پر بھول چکے تھے اور ہم نے محسوس کیا کہ واقعی اب تک تو پورے جاہل تھے۔

نگاروں میں مشرف عالم ذوقی کا 'آتش رفتہ کا سراغ' رحمٰن عباس کا 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' صادقہ نواب، پیغام آفاقی، عبدالصمد، ائل ٹھکر، شموئل احمد، شوکت حیات، شفق سوپوری، غضنفر، نورالحسنین، رینو بہل، سلام بن رزاق، نقشبند قمر نقوی کے ناولوں کو بھی پڑھا ہے۔

اا: اس میں کوئی شک نہیں سرونج میں 'انتساب' نے ہی نثر نگار پیدا کیے ہیں، بلکہ کئی شاعر ادیب تو انتساب کی ہی دین ہیں اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

س س : بالکل صحیح فرمایا۔ انتساب سے پہلے سرونج میں نثر نگاروں کا وجود نہیں تھا مختار شمیم، خالد محمود، شاہد میر چونکہ سرونج سے باہر تھے اس لیے یہ نثری مضامین لکھتے بھی رہے ہیں لیکن سرونج میں انتساب نے جن کو روشناس کرایا اور نثر لکھنے کی ترغیب دی ان کے نام کچھ اس طرح ہیں رؤف جاوید، محمود ملک، آصف سعید، نفیس تقی، متین ندوی، ڈاکٹر ظفر سرونجی، استوتی اگروال حد تو یہ ہے کہ محمد توفیق صاحب جو ریٹائر ہونے کے بعد تک ادب کی دنیا سے دور تھے انہیں بھی نثری مضامین لکھنے کا نہ صرف شوق پیدا کیا بلکہ اُن کی کئی نثری کتابیں انتساب پبلی کیشنز نے ہی شائع کیں۔

اا: سرونج کو ادب کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔.کیا یہ صحیح ہے؟

س س : لکھنؤ، بھوپال، رام پور، ٹونک، سرونج جنھیں ادب کا گہوارہ کہا جاتا تھا لیکن اب لکھنؤ کا یہ عالم ہے کہ وہاں اردو کا اخبار بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ ابھی چند سال پہلے میں اور آپ کے والد انل اگروال منور رانا کی بیٹی کی شادی میں گئے تو ریلوے اسٹیشن سے لے کر منور رانا کے گھر تک تلاش کرنے کے بعد بھی اردو کا اخبار نہیں ملا تو ہم نے منور رانا سے پوچھا،'' رانا صاحب..کیا یہ میر انیس اور مرزا دبیر والا لکھنؤ ہے؟ جہاں اردو کا اخبار بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جتنی مسلم اسٹیٹ رہی ہیں انہیں ادب کا گہوارہ صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان شہروں کی ہر گلی میں شاعر موجود ہیں گویا شاعروں کا زیادہ ہونا ادب کا گہوارہ ہونا ہے یہی سرونج کا حال ہے جہاں شاعر تو بے شمار ہیں، لیکن کسی دکان یا بازار میں اردو کا ایک اخبار بھی نہیں ملے گا ان اردو کے گہواروں سے بہتر تو اب وہ علاقے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے جیسے مہاراشٹر، بنگال وغیرہ۔

اا: سیفی صاحب جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر چند سالوں سے کافی کچھ لکھا جارہا ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

س س : ایک سچے اور اچھے شاعر ادیب کے لیے کسی جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی ضرورت نہیں رہتی بقول جتیندر بلو،'' جان دار تخلیق ہزار پردوں کو چیر کر اپنا لوہا منوا لیتی ہے'' یہ تو لیبل ہیں جو چپکائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے علمبردار بن گئے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کے اور سارے لکھنے والے ایسے چکر میں آئے کہ وہ اچھا لکھنا ہی بھول گئے۔

اا: آپ نے اردو کی نئی بستیوں پر بہت کام کیا ہے کہیں اداریوں کے ذریعے، کہیں کتابوں کے ذریعے اس کی کیا وجہ ہے؟ اور اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س س : اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پانچ مرتبہ لندن کے سفر کے دوران بیرونی ممالک کے تمام اہم شاعروں ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور بہت سے لوگوں نے کتابیں بھی عنایت فرمائیں جن میں سید عاشور کاظمی، مامون ایمن، اطہر رضوی، قمر نقوی، محمد سالم، پروین شیر

وغیرہ۔ تو اس طرح لکھنا پہلے مجبوری اور بعد میں شوق بن گیا تعلقات، دوستی اور انتساب میں اُن سب کی تخلیقات کا شائع ہونے کا سلسلہ ایسا ہوا کہ اُن پر لکھنا اور تعلقات قائم رکھنے کی وجہ سے اُن پر کام کرنے کا سلسلہ بن گیا جو آج بھی جاری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب لوگ انٹرنیٹ یا دیگر سہولیات کی وجہ سے پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ نہیں رہے لیکن کتاب کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اردو کی نئی بستیوں میں جو لوگ ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے ہیں وہ اپنی تہذیب اور زبان کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں آئے دن نشستیں، مشاعروں کا اہتمام کر رہے ہیں، اخبارات و رسائل بھی نکال رہے ہیں اور اردو کا شوق پیدا کرنے کے لیے فری تقسیم بھی کر رہے ہیں اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری نسل کے بعد نئی نسل میں اردو کا جذبہ ختم ہو جائے گا لیکن یہ بات پچاس سال پہلے بھی لکھی جا چکی ہے لیکن ان پچاس سالوں میں اردو تو ختم نہیں ہوئی جو لوگ یہ کہتے تھے وہ ختم ہو گئے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے کہ کوششوں کے بعد بھی یہ آج تک مٹ نہیں سکی اور نہ مٹے گی۔

اا: آپ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ پر بہت کام کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

س س: سب سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ میں اپنے محسنوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہے وہ دوست ہو یا ادیب یا پھر شاعر ہو جو دل کے قریب ہوتا ہے وہ میرے قلم کے بھی قریب آ جاتا ہے مثلاً ایوب واقف، ندا فاضلی، بشیر بدر، گلشن کھنہ، خالد محمود، مختار شمیم، انجم عثمانی میرے محسن و کرم فرما رہے ہیں اسی طرح نارنگ صاحب نے اپنی محبتوں سے بہت نوازہ دوسرے یہ کہ نارنگ صاحب کی شخصیت اور فن میں اتنی خوبیاں اور خصوصیات ہیں کہ ان پر تو میں اب بھی بہت کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ نارنگ صاحب محسنِ اردو ہی نہیں محسنِ انسانیت بھی ہیں۔

اا: اس سے پہلے بھی آپ سے متین ندوی اور دیگر لوگوں نے سوال کیا ہے کہ آپ تنقید میں بہت سادہ زبان استعمال کرتے ہیں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

س س: اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے مشکل زبان آتی ہی نہیں ہے میں شاعری بھی آسان زبان میں کرتا ہوں اور مضامین، تبصرے بھی سادہ زبان میں لکھتا ہوں، حالانکہ میرے کچھ دوست میری سادہ تحریروں کو غیر معیاری بھی قرار دیتے ہیں لیکن میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ معیاری زبان یعنی ادق الفاظ اور فارسی زدہ تحریریں لکھ کر معیار کی دھاک بٹھاتے ہیں جبکہ وہ زبان اخذ کی ہوئی ہوتی ہے تخلیقی زبان نہیں ہوتی اس سلسلے میں میرے سفر نامے 'سرونج سے لندن تک' اور 'یہ تو سچا قصہ ہے' نے اپنی شہرت کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے کیونکہ اس میں میرا اپنا لہجہ ہے نہ بناوٹی باتیں ہیں نہ بناوٹی لہجہ ہے یہی وجہ ہے کہ پروفیسر عبدالقوی ضیاء (کینیڈا)، غلام شبیر رانا (پاکستان) وغیرہ نے اسی سادہ زبان کی وجہ سے اسے اہمیت دی۔ سچائی یہ ہے کہ جنھیں آسان زبان میں لکھنا نہیں آتا وہ معیار کی باتیں کرنے لگتے ہیں کیونکہ آسان زبان میں لکھنا آسان نہیں ہے اور پھر میں باقاعدہ نقاد بھی نہیں ہوں، میں پہلے ہی ایک کتاب 'تنقید مجھے نہیں آتی' لکھ چکا ہوں۔

اا: سب جانتے ہیں کہ رسالہ نکالنا گھاٹے کا سودا ہے پھر بھی آپ نے ایسا گھاٹے کا سودا کیوں کیا؟

س س: صحیح بات تو یہ ہے کہ میں نے ہر کام گھاٹے کا ہی کیا ہے اور کسی بھی کام میں، کسی بھی بزنس میں کامیابی نہیں ملی دوکان کی تو اس میں گھاٹا ہوا، ایک جگہ پرائیویٹ نوکری کی اس نے تنخواہ بجائے دینے کے میرے اوپر باقی پیسے نکال دیے تبھی تو میں نے شعر کہا تھا۔

مجھ کو حیرت ہے کہ گھاٹا نہیں ہوتا تم کو
کس سے سیکھا ہے میاں تم نے تجارت کرنا

لیکن رسالہ نکالنے کا خواب تھا جبکہ ان دنوں بیڑی کارخانے میں کام کرتا تھا جہاں مشکل سے ہفتے میں دس روپے ملتے تھے گھر کی حالت بھی اچھی نہیں تھی اگر آسیہ سیفی نہ ہوتیں اور بیڑی بنا کر گھر ہستی نہ چلاتیں تو گھر میں فاقوں کی نوبت آ جاتی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے ہر خواب کو پورا کیا اور خدا نے مدد کی۔

اا: سیفی صاحب کچھ ایسے شعر سنائیے جو آپ کی زندگی سے متعلق ہوں اور جن میں آپ کے گہرے تجربات و مشاہدات ہوں۔

س س: ایک مرتبہ میرے گھر کی دیوار بہت شکستہ ہو گئی تھی، بارش کا مہینہ تھا کچھ لوگ ادھر سے گزرے تو ایک نے بلند آواز سے کہا ذرا دور سے... دیوار سر پر نہ گر پڑے۔

سر پر نہ آ پڑے کہیں چلتے ہیں بچ کر لوگ
سیفی ترے مکان کی دیوار دیکھ کر
خدا کا شکر ہے ورثہ میں گھر ملا ورنہ
ہم آج تک کوئی دیوار بھی اٹھا نہ سکے

اسی طرح ایک مرتبہ ایک صاحب نے اپنے طنزیہ جملوں سے بہت تکلیف پہنچائی تب ایک شعر ہوا۔

کوئی سمجھائے ذرا اس کے سوا کیا پائے گا
دل دکھا کر وہ ہمارا دیکھنا پچھتائے گا

زیادہ تر سچ لکھنے کی عادت رہی ہے لیکن کبھی کبھی سچائی کے اظہار میں جان کا بھی خطرہ ہوتا ہے بارہا ایسا ہوا ہے کہ پٹنے کی نوبت آ گئی ہے تبھی اخبار کے لیے یہ شعر نازل ہوا۔

کالم لکھوں میں جھوٹ تو کوسے مرا ضمیر
سچ میں لکھوں تو اور بھی خطرہ ہے جان کا

اا: آپ تین مرتبہ عمرہ کر چکے ہیں خدا نے آپ کا یہ خواب بھی پورا کیا لیکن آپ نے وہاں مکہ مدینہ میں بیٹھ کر ایک منظوم سفرنامہ بھی لکھا اور اس کے علاوہ آپ کی شاعری کی ایک مقبول کتاب 'ایک بحر سو غزلیں' جو اپنی نوعیت کی پہلی ادبی کتاب ہے کے بارے میں بتائیں۔

س س: بالکل! یہ صحیح ہے خدا کا مجھ پر بہت بڑا انعام ہے کہ میں نے عمرہ کرنے سے پہلے ہی یہ عہد کر لیا تھا کہ

تیرا لبوں پہ ذکر ہو تیری ہی بات ہو
مکے میں حمد اور مدینے میں نعت ہو

اور خدا نے غیب سے میری مدد فرمائی اور مکے مدینے میں بیٹھ کر ہی ڈیڑھ سو اشعار کا منظوم سفرنامہ اور دو درجن کے قریب حمد، نعتیں، سلام ہوئے۔ یہ کتاب بھی بے حد مقبول ہوئی۔ افتخار امام نے تو یہ لکھا تھا کہ "میں یہ پہلا منظوم سفرنامہ پڑھ رہا ہوں"۔

اا: 'کتاب' سے متعلق آپ کی ایک غزل بہت مشہور ہے جس کے بارے میں لندن میں آپ نے اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری محبوبہ تو صرف کتاب ہے جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا اس پر روشنی ڈالیں۔

س س: یہ شعر میں نے اُس وقت کہا تھا جب کتابوں کے چھپوانے کے شوق میں ہماری زمین بھی بک چکی تھی۔

زمین بک گئی گھر میں بھی کچھ نہیں سیفی
مگر یہ شوق کتابوں میں کھو رہا ہوں میں

اس کے بعد کتاب سے متعلق میری یہ غزل کافی مقبول ہوئی جسے گلزار صاحب نے بھی بہت پسند کیا۔

لایا مزہ حیات میں پڑھنا کتاب کا
دیکھا عجیب ہم نے کرشمہ کتاب کا
کیا پوچھتے ہو راز میری شہرتوں کا تم
جو کچھ ملا ہے مجھ کو ہے صدقہ کتاب کا
تنہائیوں کی جنگ میں ہتھیار ہے یہی
تلوار سے بلند ہے درجہ کتاب کا
بچپن میرے قریب سے ایسے گزر گیا
جیسے کہ بچہ پھاڑ دے پنّا کتاب کا
رکھا ہے میرے پاس حفاظت سے آج بھی
اس نے دیا تھا جو کبھی تحفہ کتاب کا

■

Stuti Agrawal
Agrawal Jewellers
Sironj - 464228 (MP)
Mob.:9575089694

زیب النسا

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

زندگی نہیں رہتی مگر اچھی یادیں انسان کے چلے جانے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز میں ہر انسان ایک مسافر جیسا ہی ہے اور اتنا ہی نہیں اس کو دوران سفر کئی مرحلوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا سفر اس کا بچپن ہے، جس میں وہ صرف انھیں چیزوں کو پسند کرتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اس کی چاہت اگر کہانی ہے تو وہ وہی سننا چاہتا ہے۔ بڑے ہونے تک بھی انسان میں کہیں نہ کہیں ایک بچپن ضرور ہوتا ہے مگر تب وہ حالات کی آندھی میں تمام ذمے داریوں کے بوجھ تلے اپنے بچپن کی ہر یاد کہیں چھپا کر جیتا ہے کیونکہ تب تک اس کے سامنے کئی راستے اسے اپنی طرف بلا رہے ہوتے ہیں لیکن تب بھی وہ کہیں اپنے بچپن کی یادوں سے جڑا ضرور رہتا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ رب نے انسان کے اندر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھی ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یعنی عقل کی قوت رکھنے کی وجہ سے اسے اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے لیکن رب نے انسان کی فہم اور اس کی عقلی صلاحیت کے باوجود اپنے انبیا اور رسول بھیجے اور صحیفے اور کتابیں بھی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں جب بھی آپ ایک اچھی کتاب پڑھتے ہیں تو کہیں نہ کہیں دنیا میں آپ کے لیے روشنی کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔

اچھی کتاب اور اس سے لگاؤ نے ایک بار پھر ہمیں یاد دلایا کہ احمد وان ڈینفر (Ahmad Von Denffer) کی لکھی وہ کتاب جس کا نام تھا 'Islam for Children' اس کو پڑھنے کے بعد آج تک وہ ہماری یادوں کے دریچوں میں موجود ہی نہیں بلکہ ہمارے دل پر دستک دے کر کہتی ہے۔ واقعی بچوں کا ذہن اس سادے کاغذ کی طرح ہوتا ہے جس پر کچھ لکھا نہ گیا ہو۔ وہ جس ماحول میں بچپن گزارتے ہیں اس کا اثر ان پر پوری زندگی باقی رہتا ہے۔ یہی وجہ رہی جب اس کتاب کا ہندی ترجمہ ہوا اور ہماری نظروں سے گزرا تو اسے پڑھ کر آج تک نہ بھولے۔ سچ تو یہی ہے کہ اچھی نصیحت آموز بات بچوں کے حوالے سے کہی گئی ہو یا بڑوں کے مگر شرط اتنی ہے وہ فلسفہ دل پر اثر رکھنے والا ہو تو پھر وہ انسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ بچوں کے ادب نے بڑوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کی پہلی مثال مائل خیرآبادی کی لکھی 'بڑوں کی مائیں' کتاب ہے۔ اس میں جھوٹ نہ بولنے والے ایک بچپن کا ذکر تھا اور ننھا بچہ کوئی اور نہیں عبدالقادر جیلانی تھے۔ اس کتاب کی مہک نے دور دور تک اپنی پہچان درج کرائی او رہمارے دل پر جو اثر ہوا وہ نہ بھولنے والی یاد بن گیا۔ موضوع کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے اب ہمارا احساس اس کتاب سے جڑے بنا نہیں رہ سکتا جس کا نام ہے مصر کی بیٹی 'زینب غزالی'۔ اس کے مطالعے نے دل کی دنیا ہی بدل دی کیونکہ اس کی ابتدا مصر کی وادیوں سے ہوئی اور اختتام ایک اعلی شخصیت پر جس نے دنیا کو اپنے کلام کے ذریعے یہی پیغام دیا کہ دنیا میں اگر آئے ہو تو کچھ نہ کچھ اچھا ضرور کر کے جاؤ تا کہ دنیا دیکھ کر یہی کہے ہم کرتے ہیں آپ کا احترام کیونکہ اعلی ہے آپ کا مقام۔ ایک عظیم شخصیت جو اب اس دنیا میں تو نہیں ہے مگر ان کا پیغام ایک روشنی بن کر یہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے زندگی میں تبدیلی اور اس کی تعمیر کتاب سے ہی ممکن ہے اور بھی اور کچھ نصیحت آموز اور انسانیت سے جڑے بہت سارے

> سچ تو یہی ہے کہ اچھی نصیحت آموز بات بچوں کے حوالے سے کہی گئی ہو یا بڑوں کے مگر شرط اتنی ہے وہ فلسفہ دل پر اثر رکھنے والا ہو تو پھر وہ انسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ بچوں کے ادب نے بڑوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کی پہلی مثال مائل خیرآبادی کی لکھی 'بڑوں کی مائیں' کتاب ہے۔ اس میں جھوٹ نہ بولنے والے ایک بچپن کا ذکر تھا اور ننھا بچہ کوئی اور نہیں عبدالقادر جیلانی تھے۔ اس کتاب کی مہک نے دور دور تک اپنی پہچان درج کرائی او رہمارے دل پر جو اثر ہوا وہ نہ بھولنے والی یاد بن گیا

نئے سویرے کے آغاز سے یاد آیا وہ درختوں کے سائے کے بیچ رکھی 'ندائے تربیت' نام کی کتاب جس کو بیچنے والا نہ جانے کون تھا مگر اس کے دامن سے لپٹی اس کتاب کی قیمت دیکھ کر جب گھر لوٹے اور اسے پڑھنا شروع کیا تو ہر لفظ یہی کہہ رہا تھا کہ شخص بن کر نہیں شخصیت بن کر رہو کیونکہ شخص تو خاک ہوجاتے ہیں مگر شخصیت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

ایسے پہلو نظروں سے گزرے اور پھر ہمارے دل کی صدا نے یہی اقرار کیا۔

مڑے مڑے سے ہیں کتاب عشق کے پنے
یہ کون ہے جو ہمیں بار بار پڑھتا ہے

کہتے ہیں کہ کچھ زندگانیاں رب کے حکم سے اپنی منزل کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں اور ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ کچھ اچھا کر کے جانا ہے۔ زمانے کو ان دلائل ان حقائق اور وقت کی اہمیت کے بارے میں بتا کر ہی جاتا ہے تاکہ ہر انسان یہ جان لے کہ وقت دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا اور جو آج ہے اس کا ایک ایک لمحہ کیسے سنوارنا ہے۔ وقت کی اہمیت جی ہاں! یوسف القرضاوی کی کتاب 'وقت فی حیات المسلم' عربی سے اردو ترجمہ کو جب پڑھا تو اس کتاب نے ہمیں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار یہی سوچنے پر مجبور کیا کہ وقت صرف سونا ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سونا چاندی اور ہیرے جواہرات ہر چیز سے زیادہ قیمتی چیز ہے یا یوں سمجھ لیں وقت ہی زندگی ہے۔ ویسے اس سلسلے میں قرآن دو موقعوں پر انسان کے افسوس اور پچھتاوے کا ذکر کرتا ہے، جب وہ اپنے وقت کے برباد ہونے پر پچھتائے گا اور اس وقت کا پچھتانا کام نہ آئے گا۔ اس کتاب سے متاثر ہونے کی خاص وجہ یہی رہی کہ اس کے مصنف ڈاکٹر یوسف قرضاوی صاحب نے وقت کی مثالیں کس طرح انسان کو سمجھائیں، سچ تو یہی ہے کہ انسان اگر غور کرے اور اپنی زندگی کے ہر لمحے کا حساب کرے کہ اس نے کیا کھویا کیا پایا تو یقیناً اسے آسانی سے ایسے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ جیسے جیسے ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہے یہی خیال آتا رہا کہ اپنی دنیا کے لیے اس طرح کام کرو مانو کہ تمھیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور اپنی آخرت کے لیے اس طرح کام کرو مانو کہ کل تمھیں مرنا ہے۔ سچ کی زمین پر یہ درج فلسفہ کوئی مانے یا نہ مانے یا پھر نظر انداز کردے، پر حقیقت سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ کسی بھی کتاب کا لکھا اگر کسی ایک فرد کی سوچ بدل دے تو یقیناً وہ دن دور نہیں کہ ایک نئے سویرے کا آغاز ہو۔ نئے سویرے کے آغاز سے یاد آیا وہ درختوں کے سائے کے بیچ رکھی 'ندائے تربیت' نام کی کتاب جس کو بیچنے والا نہ جانے کون تھا مگر اس کے دامن سے لپٹی اس کتاب کی قیمت دیکھ کر جب گھر لوٹے اور اسے پڑھنا شروع کیا تو ہر لفظ یہی کہہ رہا تھا کہ شخص بن کر نہیں شخصیت بن کر رہو کیونکہ شخص تو خاک ہو جاتے ہیں مگر شخصیت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ کتابیں تو اور بھی بہت سی ہیں جو اپنے آپ میں بے مثال ہیں اور وہ زمانے کو بہت کچھ نصیحت کر گئیں مگر ہم نے جن کتابوں کو اپنے دل کے قریب پایا اور آج تک وہ نہ بھولنے والی یاد بنیں وہ یہی تھیں کیونکہ ماضی وہ پرندہ ہے جو جس کسی کے دل میں ایک بار بس جائے تو آشیانہ وہیں بنا لیتا ہے۔ انسان کسی بھی ڈگر کسی بھی عمر میں چلا جائے اس کی یادوں کے پس منظر میں اس کی پسندیدہ ہر چیز قید رہتی ہے جب تک اس کی سانسیں ہیں، یہی کچھ یہاں بھی ہوا۔ جن کتابوں سے آشنائی ہوئی وہ ہماری پسندیدہ بن گئیں۔ ویسے سچ ہی تو ہے کہ سبق آموز کتابیں جہاں ایک طرف ہماری پسندیدہ کتابوں کی فہرست میں شامل ہوتی ہیں تو وہیں علم کے میدان میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ مصنف رہے نہ رہے مگر اس کے قلم سے نکلے لفظ اکثر امر رہتے ہیں۔ یہ زمانے کا دستور ہے وقت کے ساتھ زندگی بہت سے موڑ

وقتاً فوقتاً کتابیں متاثر کرتی رہیں اور ہم انہیں اپنے دل کے کونے میں سجوتے رہے۔ مثلاً سمیہ رمضان کی کتاب 'قرآن پر عمل'۔ مصنفہ نے بڑی سچائی کے ساتھ تحریک سے جڑی خواتین کے مثالی تجربے پر ایک نایاب مجموعہ تیار کیا اور اس کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ ہوا جس نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا، اس کی شہرت کی گونج ہمارے کانوں تک پہنچی تو یقیناً ہم میں بھی اسے پڑھنے کی جستجو ہوئی اور واقعی اس کتاب نے ہمیں بہت متاثر کیا۔

سے گزرتی ہے۔ دن مہینے سال کی طرح انسانی سوچ میں بھی بدلاؤ ہوتا ہے۔ سوچ بدلی تو نظریہ بدلا مگر ہم کہیں گے کہ کتابیں اسی موڑ پر ہوتی ہیں جہاں انھیں چھوڑا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے رب کا ایک انعام ہوتی ہیں۔

وقتاً فوقتاً کتابیں متاثر کرتی رہیں اور ہم انھیں اپنے دل کے کونے میں سجوتے رہے۔ مثلاً سمیہ رمضان کی کتاب 'قرآن پر عمل'۔ اس کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ ہوا جس نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا، اس کی شہرت کی گونج ہمارے کانوں تک پہنچی تو یقیناً ہم میں بھی اسے پڑھنے کی جستجو ہوئی اور واقعی اس کتاب نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کتاب میں لکھا ہر لفظ یہی دلیل دیتا رہا کہ ہاں یہی سچ ہے۔ سچ کڑوا ہو یا میٹھا مگر اس کا دوسرا نام سچ ہی ہوتا ہے اور بھی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ سبھی بہترین نمونہ اور عمل کی دہلیز پر ہر عورت کو پیغام دیتی ہیں کہ اچھی کتابیں ایسے باغات کی طرح ہوتی ہیں جن میں انسان کچھ پل ٹھہر کر سکون محسوس کرتا ہے۔ انھی میں ایک کتاب 'مہیلا سوتنترتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں' ہے۔ اس کے مصنف شیخ ابو عبدالرحمن عبدالحلیم ہیں۔ اس کا عربی زبان سے ترجمہ ہندی میں ہوا اور اس نے متاثر اس لیے کیا کہ اس میں خواتین کے حقوق اور ان کی شخصیت، ان کے مقام کا بیان دل کو چھو لینے والا ہے۔ اتنا ہی نہیں خواتین سے متعلق شاندار واقعات کا سچا تانا بانا یہی احساس کراتا رہا کہ جن دلوں میں رحم، طبیعت میں سادگی، احساس میں خلوص اور سوچ میں سچائی ہو تو ان کا وجود اللہ کی طرف سے مخلوق کے لیے نعمت ہے۔

علامہ اقبال کی نہ صرف ایک کتاب نے متاثر کیا بلکہ ان گنت کتابوں نے دلوں پر گہری چھاپ چھوڑی۔ ان کی شاعری نے عوام کو بیدار کیا اور ان میں وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔

وہ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ بچوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھیں اور ان کو نصیحت آموز باتیں سکھانے کی کوشش اپنے کلام کے ذریعے کی۔

■

Zaibunnisa
A-1, Fourth Floor, MM Apartments
Okhla Vihar, Jamia Nagar
New Delhi - 110025, Mob.: 9718042178
Email.: zaibunnisa2012@gmail.com

اردو کتب، رسائل و جرائد کی اشاریہ سازی

محمد غازی فہیم الدین

زمانے کا ارتقا تغیر و تبدل سے مشروط ہے۔ مسائل زیست کی نوعیت کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے زاویے اور سوچ کے پیرائے تبدیل ہور ہے ہیں۔ نئے رجحانات اور تحقیقی و تنقیدی تناظرات متعارف ہورہے ہیں۔ ٹکنالوجی کی رفتار نے ہر زاویہ ہر سوچ کو مرتعش کر رکھا ہے، آن واحد میں دنیا کے کسی بھی خطے سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے، ہر چیز صرف گوگل کی محتاج ہو چکی ہے۔ انٹرنیٹ کے اس دور میں جب ہم تحقیق و تالیف کا کام کرتے ہیں اور ہمیں مطلوبہ کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے، یا پھر مطلوبہ مضامین کی ضرورت پڑتی ہے جو فرض کریں کہ 1970 یا اس سے پہلے کسی رسالے یا جریدے میں شائع ہوا تھا تب ہمیں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تلاش بسیار کے بعد بھی مطلوبہ مواد تک اکثر رسائی نہیں ہو پاتی۔ لائبریری در لائبریری چکر لگانے پڑتے ہیں، لائبریری میں کتابوں کو ڈھونڈنا ایک مشکل ترین کام ہوتا ہے، اور جب کتابیں دستیاب ہو جاتی ہیں تو ان کتابوں میں مطلوبہ مواد تک رسائی اور بھی مشکل کام ہے۔ بسا اوقات ہم ساری کتاب چھان لیتے ہیں تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب میں تو ہمارا مطلوبہ مواد موجود ہی نہیں ہے۔

مذکورہ بالا مسائل کے لیے اشاریہ سازی سے بہترین کوئی اور حل نہیں ہوسکتا۔ اشاریہ سازی اور توضیحی اشاریہ سازی میں ہمیں مواد تک رسائی گوگل تو نہیں پر گوگل ہی کی طرح آسان سے آسان تر ہو جاتی ہے۔ اشاریہ سازی کس طرح ایک محقق اور تحقیقی سرگرمیاں انجام دینے والے کے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہے اس کو جاننے کے لیے ہمیں اشاریہ سازی کی نزاکتوں سے واقفیت ضروری ہے، اس مضمون میں اشاریہ سازی کی اہمیت و افادیت اور اشاریہ سازی کو کس طرح عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، پر مختصر گفتگو کی جائے گی۔

اشاریہ دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کسی کتاب یا رسالے میں شامل مضامین کی تفصیلی فہرست ہے، جس میں کتاب کے مضامین، موضوعات، اور عناوین، کو حروف تہجی کی ترتیب یعنی الف بائی ترتیب سے مرتب کیا جاتا ہے۔ بعض اشاریے حروف تہجی کے بجائے تاریخی اور موضوعی اعتبار سے بھی ترتیب دیے جاتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ اشاریہ کو Index کہا جاتا ہے جو کہ لاطینی زبان کے لفظ انڈیکٹر سے ماخوذ ہے۔

علمی دنیا میں ہر محقق اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ کسی بھی موضوع یا کسی بھی چیز پر تحقیق کرنے سے قبل یہ جاننا نہایت ضروری ہوتا ہے کہ اس موضوع پر آج سے قبل کیا تحقیق ہو چکی ہے۔ سابقہ تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ تحقیق کہاں سے شروع ہوگی۔ مزید یہ کہ سابقہ تحقیق سے آگاہی حاصل کرنے پر اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کیا کیا کام ہو چکے ہیں۔ اس کے لیے کتابیات اور اشاریہ نویسی کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ موجودہ تیز رفتار اور اسپیشلائزیشن کے دور میں اس کی اہمیت بہت بڑھ چکی ہے۔ پاک و ہند کی جامعات میں اس حوالے سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی مقالے بھی لکھوائے جا رہے ہیں اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ کتابیات ہی کی طرح اشاریہ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اشاریہ سازی کو عموماً رسائل و جرائد کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ لیکن اشاریہ سازی صرف رسائل و جرائد کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس سے علمی و تحقیقی میدان میں نبرد آزمائی کرنے والوں اور مصنفین کو بڑا فائدہ اور آسانی ہوتی ہے۔ زبان و ادب کے ماہرین جنھوں نے اپنی لیاقت اور صلاحیت کے بل بوتے پر اردو ادب کے ذخیرے کو وسعت عطا کی ہے ان سے متعلق مقالات و مضامین یا خود ان کی بیشتر تصانیف و مضامین ادھر ادھر بکھرے پڑے ہوتے ہیں اور وہاں تک ایک عام قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی کہ فلاں مصنف کی کتاب یا ان کا مضمون کس جگہ اور کہاں مل سکتا ہے۔ اس پریشان کن صورت حال سے بچنے میں صرف اور صرف اشاریہ ہی ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس خیال کے پیش نظر آج کل اردو میں بھی اشاریہ سازی کو اہمیت دی جارہی ہے جو کہ ایک بہترین رجحان ہے، مزید یہ کہ اس رجحان کو فروغ دینے کے لیے سنجیدہ کوشش کی ضرورت ہے۔

یہ عمل دراصل علمی اور تحقیقی ہے جس کے بارے میں محمد اطہر مسعود کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''اردو کی ادبی تاریخ میں اشاریہ سازی کو جو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اشاریہ کی مدد سے کسی بھی ادیب شاعر کے بارے میں نہایت قلیل وقت میں بہت زیادہ کافی حد تک مکمل اور بہترین معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اشاریہ کے توسط سے ادبا اور شعرا کی تخلیقات اور سوانح کے علاوہ نادر و نایاب تصاویر، عکس ہائے تحریر، ادبی کارنامے، کتابوں کے نام، مخطوطات کی فہرست غرض ہر طرح کی ضروری معلومات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ مختلف رسائل اور کتب تک عام طور سے ہر کس و ناکس اور خصوصاً تحقیقی کام کرنے والوں کی رسائی نہیں ہو پاتی اور ضروری اور مطلوبہ مواد کے رسائل کا بھی جا بجا بکھرا ہونا اور پھر رسائل کا مہیا نہ ہونا یا محدود ہونا ان کے کام میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔ لیکن جب تحقیق کرنے والوں کے سامنے کتب یا رسائل کے اشاریے موجود ہوتے ہیں تو اپنے تحقیقی کام کو زیادہ بہتر اور اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں۔''

(محمد اطہر مسعود سامون: اشاریہ سازی، رسالہ شاعر، نومبر 2010، ص 72)

جس طرح اشاریہ کی تحقیقی نوعیت سے انکار ممکن نہیں اسی طرح وضاحتی اشاریہ بھی تحقیقی تناظر میں خاص مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ وضاحتی اشاریہ، اشاریہ کی ہی ایک قسم ہے جس کی بنیاد اطلاعات، تفصیلی معلومات پر قائم ہوتی ہے۔ 'وضاحت' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تشریح یا توضیح یا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے ہیں۔ اس لفظ سے وجود میں آنے والا لفظ 'وضاحتی' ہے، جب یہ لفظ اشاریہ کے ماقبل لگ جاتا ہے تو اسے وضاحتی اشاریہ کہتے ہیں۔ وضاحتی اشاریہ میں قلم کاروں کی تحریروں کو مختصر تشریحات کے ذریعے اس طرح پیش کیا جاتا ہے جو پورے مضمون کی گرہیں کھول کے رکھ دیتا ہے۔ وضاحتی اشاریہ میں کوئی خیالی اور قیاسی بات پیش نہیں کی جاتی ہے بلکہ مضمون کی حقیقتوں کو لفظوں، جملوں اور فقروں کے ذریعے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ بات مدنظر ہوتی ہے کہ منفرد طرز اظہار کے ذریعے ایک ریسرچ اسکالر کو مطلوبہ مواد سے قریب تر کر دیا جائے۔ تحقیق کے کٹھن میدان میں کتب خانے کی مطبوعات کی فہرست وسیلہ تحقیق ہوتی ہے۔ اگر سادہ فہرست کے بجائے وضاحتی

فہرست ہو تو محقق یا ریسرچ اسکالر کا کام آسان ہوتا ہے۔ وضاحتی اشاریہ میں صرف مصنف اور تصنیف کے ناموں کی صراحت پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مصنف کے نام کے علاوہ اس کی دیگر اہم تصانیف کے نام، پیش نظر کتاب، مضمون وغیرہ کی اہمیت، اس کے اہم نکات کی صراحت اور مصنف کے طریقۂ کار کی وضاحت بھی کی جاتی ہے۔ وضاحتی اشاریہ کی مدد سے اسکالر کو بہ آسانی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی مطلوبہ کتاب یا مطلوبہ مواد کہاں ہے۔ اشاریہ دراصل اسکالر کے لیے رہبرِ اول کے مترادف ہوتا ہے۔

پروفیسر جیمس نائی وضاحتی اشاریہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''وضاحتی کتابیات پر علمی کاموں کا دارومدار ہوتا ہے۔ حوالوں کے یہ ماخذ اس وقت اور قیمتی ہو جاتے ہیں، جب انھیں عالموں نے خود اپنے مخصوص تحقیقاتی میدان کے لیے تیار کیا ہو۔ ایسی فہارس نہ صرف یہ کہ کسی مضمون پر دستیاب ادب تک رسائی کا در کھول دیتی ہیں بلکہ علمی تحقیقات کے کسی میدان میں موجود معلومات کی تلخیص پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مخصوص کتاب کو ایک وسیع تر تناظر میں قائم بھی کر دیتی ہیں۔''

(وضاحتی اردو کتابیات (عمرانی علوم) جلد اول۔ ترتیب و تزئین، انور معظم)

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے یہ بات بھی صادق ہوتی جا رہی ہے کہ پوری دنیا میں اور خاص کر تحقیق کے میدان میں اشاریہ، وضاحتی اشاریہ کی سخت اور اشد ضرورت ہے اور اس کی اہمیت و افادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی بھی محقق یا ریسرچ اسکالر اپنے مطلوبہ مواد کو تلاش کرنے میں لگتا ہے تو کبھی کبھی اپنی علمی اکائی تک اسے پہنچنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے باوجود بھی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ایک محقق یا ریسرچ اسکالر کے سامنے حوالہ جاتی کتب، اشاریہ، وضاحتی اشاریہ وغیرہ موجود ہو تو کافی حد تک اس کی رہنمائی ہوگی، اس کے علاوہ اشاریوں کو دیکھنے سے کچھ نئے نکات اور حقائق کے سامنے آنے کا امکان بھی موجود رہتا ہے۔ مزید یہ کہ اس پر اگر عام فہرست کے بجائے وضاحتی فہرست موجود ہو تو یہ سونے پہ سہاگا ہوگا۔ کیونکہ وضاحتی اشاریہ، عام اشاریہ کی نسبت وقت کی زیادہ بچت کرتا ہے۔

مذکورہ امور سے یہ بات عیاں ہے کہ وضاحتی اشاریہ کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اشاریہ سازی اپنے آپ میں ایک وسیع تر مقاصد کا حامل فن ہے جو علم و ادب سے متعلقہ علم کے بے بہا ذخائر کو نہایت ہی سہل اور آسانی کے ساتھ تشنگانِ علم و دانش کی سیرابی کرنے کا باعث ہے۔ چونکہ موجودہ دور سائنس اور تکنالوجی سے عبارت ہے۔ ایک ایسے دور میں جہاں صرف ایک ہی کلک سے علم کے دفینے ابلنے لگتے ہیں اور ہم ایسے دور میں بھی اپنے علمی سرمائے کاغذ اور کتابوں تک ہی کیوں کر محدود رکھیں۔ آج انٹرنیٹ پر Google جیسے کئی ادارے Indexing اور summarization کے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے ہمیں مطلوبہ مواد کی دستیابی میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

تاہم جب ہم تکنالوجیکل ماحول میں اشاریہ سازی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ہمہ نوعیتی اشاریہ سازی کے نمونے فراہم ہوتے ہیں۔ جن کو آج کل آن لائن آرٹیکل اور کنٹینٹ رائٹرس اپنے بلاگس یا آرٹیکل وغیرہ میں استعمال کر رہے ہیں۔ بالخصوص جب نیوز ایجنسیوں کو دیکھتے ہیں تو اپنے پاس آن لائن فراہم مواد کو با آسانی اور بہ کثرت استعمال کرنے کے لیے متعدد طریقے جیسے کلیدی الفاظ یا Keyword، Tags، Meta tags اور ٹیکس ڈسکرپشن وغیرہ استعمال کرتے ہیں، جس کی مدد سے ایک آن لائن قاری یا کوئی مخصوص آلائن خدمت کا طالب فرد با آسانی اپنے مطلوبہ مواد تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فطری زبان کاری اور کمپیوٹری لسانیات کے بضمن جب ہم اشاریہ سازی کو دیکھتے ہیں تو وہاں پر خودکار تلخیص Automated summarization اور تلخیص کاری Abstraction باقاعدہ ایک مد کے طور پر کارفرما ہے اسی طرح مصنوعی ذہانت (آرٹیفیشل انٹلیجنس) کے بضمن جب ہم اشاریہ سازی کے وسیع تر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر آن لائن دستیاب جملہ متون یا نصوص کی اس طرح تلخیص کاری ہوتی ہے کہ اس میدان سے وابستہ ہر فرد اپنے تصور کو مختصر ترین انداز میں فہمائش کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے ہدف میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح لائبریری سائنس کے میدان میں کیٹلاگ سازی جب کی جاتی ہے تو جدید انداز میں فراہم شدہ کتب کی جمیع تفاصیل کے ہمراہ اس میں موجود اہم امور کی توضیحی اشاریہ سازی بھی کی جاتی ہے، تا آں کہ ایک محقق اپنے مطلوبہ مواد تک با آسانی رسائی حاصل کر سکے۔ عصر حاضر میں اس تلخیص کاری کا استعمال تحقیقی اداروں سے زیادہ تجارتی ادارے کر رہے ہیں۔ جس میں مشہور گوگل بکس، امیزون کنڈل، بلوب، اور انگرام اسپارک جیسے ای پبلی کیشن کی خدمات فراہم کرنے والے ادارے ہیں، جو اپنے اپنے پلیٹ فارم پر کسی بھی محقق کے مقالے یا اس کی تحقیق کو فروخت کرتے ہیں اور اس فروخت کاری کے عمل سے قبل تحقیق یا کتاب میں موجود مواد میں کتاب کی توضیحی اشاریہ سازی کرواتے ہیں۔ بعد ازاں اس کتاب کو ڈیجیٹل یا آن ڈیمانڈ پبلی کیشن کے لیے اپنے اپنے سیلرس کے کیٹلاگ میں اندراج کرواتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک محقق یا قاری سب سے پہلے ان سیلرس کی ڈائریکٹری میں اپنے مطلوبہ مواد کی تلاش کرتا ہے۔ اگر وہ ان کے پاس فراہم شدہ مواد یا تلخیص میں کچھ توضیحی اشاریہ حاصل کرتا ہے تو اس کتاب کو خریدتا ہے۔ مزید برآں سائنسی، طبی، مالیاتی رپورٹ وغیرہ کی تلخیص کاری اشاریہ سازی کے لیے کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ جو آن لائن مواد کو مکمل طور پر اخذ کرتے ہوئے اس کی تلخیص کاری شماریہ کاری اور اشاریہ سازی کرتے ہوئے لاکھوں کروڑوں میں اسے فروخت کرتے ہیں، جس کو جدید اصطلاح میں مارکیٹنگ ریسرچ کی توضیحی اشاریہ سازی بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا عصر حاضر ہم سے بار بار اردو زبان کو اس میدان میں ترقی کروانے اور زبان کو جدید تکنالوجی سے لیس کرنے اور جدید تکنالوجیکل ماحول میں اردو زبان کے متون اور نصوص کو اشاریہ سازی کروانے کی جانب مجبور کر رہا ہے۔ ماہرین زبان و لسانیات اور بالخصوص اردو محققین سے یہ درخواست ہے کہ اس جانب توجہ دیں اور اپنی زبان کو فروغ دینے میں کوئی کسر نا چھوڑیں۔ لہٰذا اردو زبان سے جڑی تمام علوم و فنون کی کتابوں، رسالوں اور جریدوں کے اشاریہ نا صرف تیار کرنے کی ضرورت ہے بلکہ انہیں ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر بھی لانے کی ضرورت ہے تا کہ انٹرنیٹ کی برق رفتاری کا استفادہ اہالیان اردو بھی اٹھا سکیں۔ جس طرح انگریزی اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں اس طرح کا کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ موجودہ دور علمی و فنی ترقی کا دور ہے جس میں لوگوں کے پاس مصروفیات بہت زیادہ ہیں، پہلے کی نسبت علوم و فنون میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے روزانہ ہزاروں کتابیں، رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کسی ایک رسالے کی مکمل کاپی کا مطالعہ کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اشاریہ سازی کے میدان میں بتدریج کام ہو رہا ہے لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے، اس میدان میں باقاعدہ کام کی اشد ضرورت ہے۔ اشاریہ سازی کا کام اردو کی خدمت انجام دینے والے اداروں کی نظر خاص کا محتاج ہے۔

حوالہ جات:

1. وضاحتی کتابیات، گوپی چند نارنگ۔ دیباچہ۔
2. محمد اظہر مسعود سامون۔ اشاریہ سازی، رسالہ شاعر نومبر 2010،
3. ڈاکٹر جمیل اختر۔ اردو میں رسائل کی اشاریہ سازی۔ رسالہ فکر و تحقیق۔ جولائی تا دسمبر 1997
4. رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ، ڈاکٹر فرزانہ خلیل۔ ص 15

■

Mohd Ghazi Faheemuddin
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli,
Hyderabad-500032 (Telangana)

خضرِ بے منزل حسن بشیر مرحوم

سید صفدر

کچھ خوبیوں والے لوگ بڑی ذمے داریاں اور مختصر عمر لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ پھر بہت جلد سارا وجود سمیٹ کر چاہنے والوں کی یادوں میں سما جاتے ہیں۔ قضا وقدر سے اس فریاد کی مہلت بھی نہیں ملتی کہ کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر۔ ایسی ہی ہنگامہ خیز زندگی گزاری جناب حسن بشیر نے۔

ساتویں دہائی کے آغاز میں کھنڈوا (مدھیہ پردیش) اردو تحریک کی حشر سامانیوں سے گونج رہا تھا۔ اس تحریک کے قافلہ سالار تھے مظفر حنفی، حسن بشیر اور قاضی حسن رضا۔ اُردو لائبریری کا قیام، اردو ہائی اسکول کا آغاز، اطراف میں پرائمری اردو مدارس کے اجرا کی کوششیں، ادبی سرگرمیاں، شاعری، افسانہ، ادبی سمینارز، مذاکرے اور ایک ہنگامہ خیز ادبی رسالہ 'نئے چراغ' (کھنڈوا) کا اجرا، کھنڈوا ہندوستان بھر کے اردو اہلِ قلم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

نئے ادب کے فروغ میں شب خون کے علاوہ جن ادبی رسالوں نے اپنا کردار ادا کیا، ان میں ایک اہم نام نئے چراغ بھی ہے۔ جلد ہی نئے چراغ ادبی جریدہ سمجھا جانے لگا۔ ان حضرات نے اپنے پرچے کو اپنی تخلیقات کی اشاعت ذریعہ نہیں بنایا۔ مظفر حنفی کو اللہ نے لمبی عمر عطا فرمائی، وہ آسمانِ ادب کا درخشندہ ستارہ بن گئے، جناب حسن بشیر کے طلوع و غروب کا عرصہ بہت مختصر رہا۔ پھر بھی شمس الرحمان فاروقی جیسے یگانہ عصر نقاد حسن بشیر کو نئی غزل کے اہم ناموں میں شمار کرتے ہیں۔

میں 1967 میں بی اے فائنل کا طالب علم تھا۔ میرے دوست رسول فاضل نے اردو ہائی اسکول وروڈ میں ملازمت کی پیشکش کی۔ میں اپنے حالات سے ٹوٹا ہوا تھا، فوراً تیار ہو گیا۔ جولائی 1967 میں بحیثیت استاد اردو ہائی اسکول وروڈ پہنچ گیا۔ ساتھی اساتذہ کو یہ بات قبول کرنے میں تامل تھا کہ ایک دبلا پتلا کوتاہ قد لڑکا صفدر، شاعر بھی ہے۔ یومِ آزادی کی تقریب میں بچوں سے پڑھوانے کے لیے مجھ سے ایک نظم لکھوائی گئی مگر اسے رد کر دیا گیا مجھے باور کرایا گیا کہ یہ منہ اور مسور کی دال! یہ میری پہلی دل آزاری تھی۔ میں نے وہ نظم ماہ نامہ قومی راج (ممبئی) میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔ وہ نظم صفحہ اول پر شائع ہوئی۔

رسالہ دیکھ کر ساتھی اساتذہ کے تعصب میں کمی آئی۔ ہمارے اسکول میں صدر مدرس کے عہدے کے لیے ایک بی اے بی ایڈ استاد کی ضرورت تھی علاقے بھر میں کوئی بی ایڈ پاس شخص وروڈ آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وروڈ کے ایک بزرگ عبدالرحمٰن خان کھنڈوا میں سرکاری ہائیر سکینڈری اسکول کے پرنسپل تھے۔ موصوف نے حسن بشیر صاحب سے گفتگو کی یہ حضرت قومی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے، راضی ہو گئے۔

یہ یکم مارچ 1969 کی بات ہے اسکول انتظامیہ کے صدر محمد صدیق صاحب کے ساتھ ایک اجنبی اسکول میں وارد ہوا سانولی رنگت، کشادہ پیشانی، نکلتا ہوا قد، ذہانت کی غماز بڑی بڑی روشن آنکھیں، لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک پیکرِ وقار سے اسٹاف کا تعارف ہوا یہ جناب حسن بشیر تھے، ہمارے نئے صدر مدرس۔

دوسرے دن میں اسٹاف روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ (سبزے خان، چپراسی نے مجھے اطلاع دی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں میں پہنچا، سلام عرض کیا، حضرت نے خیریت دریافت کی، ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد دریافت فرمایا ''آپ شعر کہتے ہیں'' اقرار میں ایک لفظ میری زبان سے نکلا ''جی'' فرمایا ''بہت خوشی کی بات ہے۔''

اب شامیں جناب حسن بشیر کے ساتھ گزرنے لگیں۔ میں اپنی غزلیں انھیں دکھاتا۔ واہ واہی نہیں ہوتی تھی ضروری ہوا تو وہ اصلاح دیتے ہمت افزائی کے کلمات سے نوازتے اپنی غزلیں مجھے دکھاتے۔ میں اپنی رائے پیش کرتا مگر میں نے کسی شعر میں تبدیلی کا مشورہ نہیں دیا وہ جدید انداز کے نہایت خوبصورت شعر کہتے تھے۔ سادہ الفاظ، خوش آہنگی اور مضمون کی تازگی رگ وپے میں اتر جاتے تھے۔ موصوف کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ان سے ان کی قادر الکلامی ندرتِ خیال اور فکر کی تازگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دل کی نرمی کا مظہر ہے میرے آنگن کی بگیا
دل کی سختی کا مظہر ایک لوہے کا دروازہ ہے
کیسے کہوں خراب کسی نے نہیں دیا
منھ پر میرے جواب کسی نے نہیں دیا

بوڑھا فقیر شام ڈھلے رو دیا مگر
سکہ بھی ایک خراب کسی نے نہیں دیا
خوشبو چمن سے اڑ کے میری چھت پر آ گئی
جب مجھ کو ایک گلاب کسی نے نہیں دیا
ہم صبح کی سرخی کو دیتے ہیں لہو دل کا
تب جا کے کہیں شب کے عنوان بدلتے ہیں

جناب حسن بشیر نے نئے چراغ (کھنڈوا) مزاج بھوپال اور شب خون الہ آباد کے چند شمارے برائے مطالعہ عنایت فرمائے۔ میں روایتی طرز کی غزلیں کہتا تھا۔ اب ایک نئی دنیا سامنے تھی جلد ہی شب خون (الہ آباد)، کتاب (لکھنؤ)، تحریک (دہلی)، آہنگ (گیا) وغیرہ رسالے وروڈ آنے لگے۔ میں حالی، شبلی، احتشام حسین، آل احمد سرور وغیرہ کو پڑھ چکا تھا۔ نئے ناقدین کو پڑھ کر ذہنی کشادگی کا تجربہ ہوا رفتہ رفتہ میں جدیدیت کا ہم نوا بن گیا، ہماری مجالس میں اب کئی لوگ شریک ہونے لگے۔ کسی رسالے کا نیا شمارہ آتا تو ہم اس کے مشمولات پر گفتگو کرتے، وہ میرے معروضات سن کر خوش ہوتے، ہمت افزائی فرماتے میری کسی بات سے اتفاق نہ ہوتا تو تردید نہ کرتے، خوش دلی سے اپنی رائے پیش فرماتے۔

میں مسجد سے بے گانہ تھا وہ صوم وصلات کے پابند تھے۔ حضرت نے مجھے کبھی کوئی نصیحت نہیں کی۔ ان کی تربیت کا انداز نرالا تھا مجھے اسلام کے مطالعے کی طرف راغب کیا، اسکول لائبریری کے لیے بہت سی دینی کتابیں منگوائیں۔ تاریخ اسلام (اسلم جیراج پوری) قصص القرآن (مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی) مسلم شریف، اور مولانا علی میاں کی تصنیفات وغیرہ۔ ان کتابوں کے مطالعے سے میرے اندر کی دنیا بدل گئی۔ مقامی تقاضوں کے پیش نظر تبلیغی جماعت کی دعوت سے میرا تعلق پیدا ہو گیا۔ صوم وصلات کی پابندی کے ساتھ میں دعوتی کام میں حصہ لینے لگا جلد ہی میں اچھا شاعر اور اچھے مقرر کی حیثیت سے معاشرے کا ممتاز رکن بن گیا حسن بشیر صاحب میری زندگی کی بدلتی تصویر سے بہت خوش تھے۔

موصوف نے مجھے نئے رسائل میں اشاعتِ کلام کی ترغیب دی۔ میری غزلیں نظمیں صفِ اول کے رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ اس زمانے میں شب خون، کتاب، تحریک، آہنگ وغیرہ میں جگہ ملنا بڑے فخر کی بات تھی۔

شاعری کے ساتھ ساتھ موصوف نے مجھے نثر نگاری کی طرف بھی راغب کیا۔ اسکول میگزین (صبح نو) کے لیے مضامین لکھوائے، ادبی تقریبات اور تعلیمی اسفار کے رپورتاژ لکھوائے اس طرح نثر میں بھی میرا قلم رواں ہو گیا۔ ایک دن فرمایا آپ تنقیدی مضامین لکھیے۔ آپ تنقید لکھ سکتے ہیں۔

میں نے مظفر حنفی کی شاعری پر مضمون لکھا "پانچواں درویش- مظفر حنفی"، میں نے یہ مضمون آہنگ (گیا) میں اشاعت کے لیے ارسال کر دیا کلام حیدری صاحب نے مجھے لکھا کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کی پہلی کوشش ہے۔ مضمون کا مزاج اختلافی ہے اس لیے اسے مورچہ میں شائع کر رہے ہیں تاکہ تفصیلی بحث ہو سکے یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ کئی رسالوں نے مظفر حنفی پر نمبر نکالے، یہ مضمون ان سب میں شامل رہا۔ جلد ہی میرے تنقیدی مضامین دیگر معیاری رسائل میں آنے لگے حسن بشیر صاحب بہت خوش تھے میری ہمت افزائی کی۔ لکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ حسن بشیر صاحب اپنے کلام کی اشاعت سے بے پرواہ تھے۔ میں ان کی غزلیں رسالوں کے لیے بھیج دیتا ان کا کلام اہمیت کے ساتھ شائع ہوتا۔ وہ زود گو نہ تھے اس لیے گاہے گاہے ان کی غزلیں شائع ہوتیں۔ ان کے کھنڈوا قیام کے زمانے کا کلام ہم تک نہیں پہنچا۔ انھوں نے اپنا شعری مجموعہ بھی مرتب نہیں کیا نئے چراغ میں مظفر حنفی 'مشاہداتِ ارسطو' کے نام سے ایک کالم لکھتے تھے۔ کبھی کبھی حسن بشیر صاحب کو بھی یہ کالم لکھنا پڑھتا تھا۔ موصوف نے اس کا بھی ریکارڈ نہیں رکھا۔

میں نے اپنی کتاب 'جدید شعری تنقید' کا انتساب حسن بشیر کے نام کیا ہے اس انتساب کی عبارت حسب ذیل ہے :

"اس خضرِ بے منزل، حسن بشیر، کے نام جس کی جنبشِ انگشتِ شہادت میں، میں نے اپنے سفر کی سمتیں دریافت کیں۔"

اسکول میں حسن بشیر صاحب نے اپنی کارکردگی سے سب کا دل جیت لیا۔ انتظامیہ کا، اسٹاف کا، طلبہ کا اور سرپرستوں کا۔ وہ وروڈ میں کیا آئے "شب دیجور میں ایک چراغ روشن ہو گیا، وروڈ ایک دور افتادہ قصبہ تھا یہاں تہذیبی، ثقافتی، ادبی، لسانی سرگرمیاں برائے نام بھی نہ تھیں۔ ہمارے ایک دوست پروفیسر میر اظہر علی کہا کرتے تھے:

The only culture in world is agriculture .

ہمارے ایک اور دوست عطاء اللہ خان اکثر اپنے کسی استاد کا قول بڑے مزے سے سناتے تھے کہ:

(باغبانی تمام علوم کا جامع ہے)

مراٹھی زبان کے ایک بڑے ادیب پروفیسر مدھوکر کچے یونیورسٹی امتحان کے ذمے دار کی حیثیت سے وروڈ آئے انھوں نے وروڈ کا خاکہ لکھا: (ایک خوابیدہ گاؤں۔ وروڈ)

ان حالات میں حسن بشیر نے وروڈ میں زبان وادب اور تہذیب وثقافت کی بنیاد رکھی۔ بچوں میں، اساتذہ میں اور سرپرستوں میں تعلیم وتعلم کا جذبہ پیدا کیا۔ شعر وادب کا ذوق پروان چڑھایا۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس قصبے میں شعر وادب کے ماحول نے سماجی ہم آہنگی کے راستے ہموار کیے۔ ان کے بعد بھی سہ لسانی مشاعرے منعقد ہوتے رہے جن میں ہندی اور مراٹھی کے مقامی شعرا اور اساتذہ اردو والوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ اردو اور مراٹھی ادب کے تذکرے ہوتے۔ اردو کے اساتذہ میں بھی کئی لوگ شعر کہنے لگے تھے مثلاً! رسول فاضل، افتخار نظمی، ستار سوز، مقتول وارثی وغیرہ۔ شعری نشستوں اور مذاکروں کا سلسلہ شروع ہوا تو اساتذہ اور طلبا میں اچھے مقرر سامنے آئے بین المدارس تقریری مقابلوں میں اردو ہائی اسکول کے بچے اول انعام حاصل کرنے لگے مضمون نویسی کے مقابلے ہوتے بچوں میں تحریری اظہار میں دلچسپی بڑھنے لگی مطالعے کا ایک معیار ابھر کر سامنے آیا۔ اسکول میں جو زبانیں پڑھائی جاتیں بچوں کو ان زبانوں میں تقریر کرنے کے لیے کہا جاتا ایک موقع پر ایک ذہین طالب علم کو مراٹھی زبان میں تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ بچہ تیار نہ تھا۔ اسے حسن بشیر کے حضور میں پیش کیا گیا موصوف نے بچے سے کہا "اردو میں تو سبھی تقریر کرتے ہیں۔ مراٹھی میں تقریر کر کے آپ اپنی صلاحیت کا لوہا منوا سکتے ہیں اور آپ ایسا کر سکتے ہیں۔"

یہ بچہ محمد اسد اللہ تھے جی ہاں ! وہی ڈاکٹر محمد اسد اللہ جو آج برصغیر میں اردو انشائیہ کا بڑا نام ہے۔ انشائیہ کے پارکھ اور نقاد ہیں۔ اردو مراٹھی کے رابطے کی مضبوط کڑی ہیں۔ مراٹھی طنز و مزاح اور للت لیکھوں کے ترجموں پر مشتمل ان کی کتابیں 'جمالِ ہم نشیں' اور دانت ہمارے اردو مراٹھی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ بچوں میں مقابلہ آرائی سے زیادہ تحریری اظہار میں دلچسپی بڑھنے لگی محمد اسد اللہ، عارج میر، اختر مرزا، اور دوسرے اہل قلم سامنے آئے۔ ایک لڑکی میں اس کا نام بھول رہا ہوں تواتر سے بچوں کے رسائل میں مضامین اور کہانیاں لکھنے لگی۔ رؤف خاں اچھے مصور بن کر ابھرے۔

وقت کے ساتھ وروڈ میں ادبی سرگرمیاں بڑھنے لگیں محمد اسد اللہ ممتاز مزاح نگار اور انشائیہ نگار بن کر ابھرے۔ عارج میر آج معروف جدید شاعر ہیں۔ (شعری مجموعہ ناشنیدہ) اختر مرزا افسانہ لکھنے لگے۔

متعدد پرچوں میں ان کے افسانے شائع ہوئے۔ اساتذہ میں شاہد رشید پہلے طنز ومزاح لکھتے تھے۔ پھر سائنسی مضامین لکھنے لگے۔ شاہد رشید کی سائنسی مضامین پر مشتمل دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پھرتا ہے فلک برسوں، مکاشفات (تیسری کتاب تنقیدی اور تبصروں پر مشتمل ہے۔)

ایک بار ڈاکٹر محمد اسداللہ بذریعہ ریل ممبئی سے واپس آرہے تھے۔ان کی ملاقات مشہور محقق نورالسعید اختر سے ہوئی۔نورالسعید اختر یہ جان کر حیرت زدہ رہ گئے کہ ورود ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔فرمایا میں تو ورود کو ایک بڑا ادبی مرکز سمجھتا رہا ہوں۔ایک بار میرے ایک استاد ولی صدیقی (ذکا صدیقی کے برادر بزرگ) نے فرمایا بیٹا اور ورود جیسے گاؤں میں بیٹھ کر آپ تنقیدی کتابیں لکھ رہے ہیں یہ بڑی بات ہے۔

یہ سب ایک فرد حسن بشیر کی سعی جمیلہ کا حاصل ہے۔ حسن بشیر صاحب ایک مثالی ایڈمنسٹریٹر تھے ایک بار اردو ہائی اسکول کی انتظامیہ کے صدر اسکول آفس میں تشریف لائے اور فرمایا آپ سختی سے پیش آئیں ہم آپ کے ساتھ ہیں حسن بشیر صاحب نے کہا اس طرح اسٹاف سے کام نہیں لیا جاتا وہ ہمارے سکھ دکھ کے شریک تھے۔ ہمارے حالات کی خبر رکھتے تھے۔ممکن ہوا تو ہماری مشکلات کا حل نکالتے ایک ادارہ قائم کیا جس سے بلا سودی قرض اسٹاف ممبران کو ملتا تھا ہم میں سے ہر ایک کو یہ فکر ہوتی تھی کہ سر کو ناراض کرنے والی کوئی بات سرزد نہ ہو۔ ہر مہینے میں ایک بار چھٹی لے کر اپنے گھر تشریف لے جاتے ۔ان کی عدم موجودگی میں اگر اسکول میں کوئی اختلاف ہو جاتا تو طرفین اختلاف کو بڑھنے نہیں دیتے سر آئیں گے تو انھیں تکلیف ہوگی۔ ان کی غیر حاضری میں بھی اسکول اسی طرح چلتا جیسے ان کی موجودگی میں ہوتا۔

اسٹاف میٹنگ میں طریقہ درس ڈیلی ٹیچنگ نوٹس سالانہ منصوبہ بندی نئے تعلیمی نظریات پر روشنی ڈالنا میری ذمے داری ہوتی تھی۔ میرے ایک ساتھی سید محی الدین نے ایک بار مجھ سے پوچھا آپ بھی ہماری طرح ان ٹرینڈ ہیں پھر بھی آپ یہ سب باتیں کیسے جانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا سر مجھے کتابیں فراہم کرتے ہیں میرے ساتھ مذاکرہ کرتے ہیں۔ پھر میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوتا ہوں میں حسن بشیر صاحب کا قابل اعتماد مہرہ تھا۔ وہ مجھے ہر موقع پر آگے بڑھاتے تھے۔

آپ کی نرم مزاجی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک چپراسی اسٹاف روم میں آکر حکم صادر کرتا ہے۔ فلاں صاحب! فلاں کلاس میں جائیے۔ سب کو یہ ناگوار گزرتا تھا۔ میں نے اس سر سے اس کی شکایت کی۔ فرمایا ''آپ سب کیا طرح خدمات انجام دیتے ہیں جیسا میں چاہتا ہوں۔'' عرض کیا جی نہیں سر کمی کوتاہی تو ہوتی ہے۔'' فرمایا ''میں نظر انداز کرتا ہوں۔ آپ کو بھی درگزر کرنا سیکھنا چاہیے۔'' مجھے اپنی شکایت پر بے حد شرمندگی ہوئی۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کا احساس مر گیا تھا۔ ایک صاحب کچھ بے لگام تھے۔ سر راونڈ پر تھے۔ وہ صاحب ایک سینئر ٹیچر عبدالقدیر سے جھگڑتے ہوئے بدکلامی سے پیش آرہے تھے۔ایک گالی حسن صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی۔ اسی وقت اسکول کمیٹی کی میٹنگ بلوائی فرمایا میں ایسے آدمی کے ساتھ کام نہیں کر سکتا جو اپنے ساتھیوں کو گالیاں دیتا ہو۔ الغرض اس کو ٹرمی نیٹ کر دیا گیا مجھے حسن بشیر کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

دل کی نرمی کا مظہر ہے میرے آنگن کی بگیا
دل کی سختی کا مظہر ایک لوہے کا دروازہ ہے

وہ زاہد خشک نہیں تھے۔ وہ خود بھی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ شہر کے ایک پہلوان حسن بشیر صاحب کے دوست تھے۔ عبدالعزیز ان کا نام تھا۔ وہ بہت کیم شحیم آدمی تھے۔ ایک دن فرمایا "پہلوان ! یہ بھاری تن و توش پر عبدالعزیز نام بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ پہلوان بولے'' کیا ہونا چاہیے تھا۔'' فرمایا ''عبد الغزیز'' ہونا چاہیے۔ موجودہ احباب کے ساتھ پہلوان بھی ساختہ ہنس پڑے۔''

ہمارا اسکول کرائے کی بلڈنگ میں لگتا تھا۔ حسن بشیر صاحب ایک عالیشان عمارت کی تعمیر کے منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ ایک وسیع خطہ ارض اس مقصد کے لیے خرید لیا گیا تھا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی یہ 27 اگست 1974 کی بات ہے۔ میں 28 اگست کی چھٹی لے کر امراوتی آ گیا تھا ۔ 28 اگست کی صبح مجھے ٹیلی گرام کے ذریعے اطلاع ملی کہ ہمارے رہنما، ہمارے بزرگ، ہمارے قافلہ سالار، جناب حسن بشیر حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے ۔جسد خاکی کو کھنڈوا لے جایا جا رہا ہے۔فوراً پہنچو میں ورود پہنچا تو قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ میں بدقت تمام کھنڈوا پہنچا۔ میں پہنچا وہاں تو صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ دوسرے دن 29 اگست 1974 کو کھنڈوا قبرستان میں سیکڑوں غمگساروں نے نم آنکھوں سے اپنے عزیز از جان یار جانی کو سپرد خاک کر دیا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسن بشیر یکم اپریل 1933 کو کھنڈوا میں پیدا ہوئے تھے۔ 28 اگست 1974 کو ورود میں آخری سانس لی۔ 29 اگست کھنڈوا میں آسودہ خاک ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حسن بشیر نے ورود میں اردو ہائی اسکول کی عالی شان عمارت کا خواب دیکھا تھا۔ ان کے شاگردوں نے اسے حقیقت بنا دیا۔اس اسکول کی انتظامیہ میں ان کے شاگرد ہیں۔ عارج میر، ناصر الدین قاضی، عبدالوحید، جابر خان وغیرہ ادارہ اب جنیئر کالج بن گیا ہے۔ وہاں ایک عظیم الشان عمارت، وسیع کھیل کے میدان کے ساتھ ان کے خواب کی تعبیر بن کر کھڑی ہے۔ اردو دنیا ان کے شاگردوں کی تخلیقی صلاحیتوں سے جگمگا رہی ہے۔

شاہد رشید نے میرے بارے میں ایک کتاب مرتب کی ہے 'صفدر تخلیقی وتنقیدی جہتیں' یہ کتاب میں نے یگانہ عصر عالم ادبیات جناب شمس الرحمان الرحمٰن فاروقی کی خدمت میں ارسال کی فاروقی صاحب نے کتاب کی وصولیابی کی اطلاع دیتے ہوئے خط لکھا۔ میں یہ خط من وعن نقل کرتا ہوں۔

11 جنوری 2018

آپ کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں شاہد رشید کی کتاب کچھ مدت ہوئی ملی تھی۔ آپ نے دستخط کر کے اس کی قدر اور بڑھا دی شرمندہ ہوں کی رسید لکھنے کی نوبت اب آرہی ہے۔ میری مصروفیات موسم یہ سب ناسازگار ہے کیا کروں۔

آپ کے مختصر مضمون سے معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ حسن بشیر سے آپ کے مراسم تھے۔ اور آپ کی ادبی تربیت میں ان کا بھی حصہ رہا ہے۔ مرحوم عمدہ شاعر تھے۔ افسوس کہ معاشی مسائل اور عمر کی تنگی نے انھیں پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا۔ اس کتاب میں آپ کے کئی پرانے مضامین دوبارہ دیکھنے کو ملے۔ پرانے دن بھی یاد آگئے اور آپ کی تنقید سے ملاقات اور تجدید نو بھی ہوئی۔

دعا ہے کہ اللہ آپ کو سلامت اور فعال رکھے ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟

اتنی صاف ستھری کتاب مرتب کرنے اور شائع کرنے کے لیے شاہد رشید کو مبارکباد۔

آپ کا
شمس الرحمان فاروقی

میری ابتدائی ادبی زندگی کے پانچ برس حسن بشیر کے ساتھ گزرے ہیں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں انھیں کی صحبتوں کا فیض ہے۔

■

Dr. Safdar
Kohe Noor Colony
Post.:VMV,
Amravati - 444604 (Maharashtra)
Mob.:7499854978

دردِ دل
اطبا اور ادبا کی نظر میں

اشرف آثاری

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

میر تقی میر

”.....میرے دونوں شانوں کے درمیان جو درد تھا اس میں فائدہ نہیں ہوا، بعض دفعہ میں رات کو اس کی وجہ سے سو نہیں سکتا۔ اٹھ کر سیدھا بیٹھ جاتا ہوں تو قدرے ریلیف ہوتا ہے۔ اگر علی بخش دونوں ہاتھ سے ذرا مل دے تو پھر تھوڑی دیر کے لیے آرام ہو جاتا ہے۔ شاید دورانِ خون کی وجہ سے ہے۔“

علامہ اقبال نے انجائینا یا دردِ دل کا ذکر اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ علامہ اقبال نے اس قیاس سے کہ شاید یہ تکلیف دورانِ خون کی وجہ سے ہے اپنی ژرف نگاہی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ حقیقت میں بھی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہ مرض ایک پرانا مرض ہے اور اس کے متعلق جانکاری قدیم طبی دستاویزات میں بھی ملتی ہے۔ دنیا بھر میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے جو قدیم مزارات دریافت کیے ہیں جن میں اکثر چین و مصر میں موجود ہیں ان مزارات میں محفوظ کیے گئے انسانی ڈھانچوں کے سائنسی تجزیے سے اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ قدیم چین اور مصر کے باشندوں کو دل سے نکلنے والی باریک لال رگوں یا عروقِ شعریہ کے متعلق جانکاری حاصل تھی۔ لگ بھگ تین ہزار برس پرانے چینی طبی صحیفوں میں، اس بات کے متعلق آگاہی ملتی ہے کہ چینیوں کو یہ علم تھا کہ دل سے لہو کا دھارا چلتا رہتا ہے جو انسانی جسم میں رواں دواں ہے اور اسی سے ہر جاندار زندہ اور متحرک ہے اور اس کا رکنا ہی موت ہے۔ جسمِ انسانی میں دورانِ خون کا سارا دارومدار قلب کی انقباضی اور انبساطی حالت و کیفیت پر منحصر ہے اور دل کے اسی سکڑنے اور پھیلنے پر انسانی بقاء و دوام کا انحصار ہے۔ دل کے ظاہری افعال و خواص یا پھر طبی، معالجاتی یا خلقی نظام کی جانکاری یہیں سے شروع ہوجاتی ہے اور دل کے سکڑنے، پھیلنے، تنگ ہوجانے یا پھر وسیع ہوجانے پر ہی، سارا کاروبارِ زندگی منحصر ہے لیکن دل کی ان سب طبعی خصوصیات کے علامتی مفاہیم بھی ہیں جنھیں ہر دور کے شعرا و ادبا نے اپنے فن پاروں میں استعمال کیا ہے مثالیں لاتعداد ہیں یہاں مرزا غالب کے ان چند اشعار پر ہی اکتفا ممکن ہے جن میں دل کی تنگی یا پھر وسعت کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

تنگیِ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

دکھ جی کے پسند ہوگیا غالب
دل رک رک کے بند ہوگیا غالب

درد اور دل کا قصہ آج کا بھی ہے اور بہت پرانا بھی۔ ایک قدیم طبیب کا کہنا ہے:

”اس کا حملہ بالکل طوفان کی طرح ہوتا ہے، باقی بیماریوں میں تو صرف بیمار ہونے کا احساس ہوتا ہے، لیکن حملہ قلب میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری وقت آ پہنچا ہے۔“ (اوبیس سدیکا) (قبل مسیح)

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ بیماری شاید اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود حضرت انسان۔ اوپر مذکورہ عبارت آج سے ہزاروں برس، قبل مسیح کے کسی مفکر یا طبیب کی بتائی جارہی ہے آج بھی حملۂ قلب، بیماری کے ضمن میں اسے بالکل درست اور ناقابلِ تردید مانا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی اور نہ شاید آئندہ کبھی آئے گی:

”درد کے دوران جب میری نظر آئینہ پر پڑی تو میرا چہرہ زرد تھا، ہونٹ سفید اور شکل مردہ آدمی کی طرح معلوم ہوتی تھی۔“ (جان ہنٹر 1700)

عام طور پر اس طرح کا درد جسمانی محنت سے پیدا ہوتا ہے خواہ وہ چلنا پھرنا یا سیڑھیاں چڑھنا یا اترنا وغیرہ جیسی جسمانی محنت یا اور کوئی جفاکشی ہو، اور جب ٹھہر کر آرام کیا جائے تو فوراً افاقہ بھی ہوجاتا ہے۔ یہ درد سینے یا چھاتی پر سامنے کی ہڈی کے مقام پر اٹھتا ہے، یہاں سے پھیل کر بائیں کندھے یا بازو یا ہاتھ میں یا پھر بعض دفعہ دونوں بازوؤں یا کلائی یا پھر انگلیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ ان اعضا کے علاوہ جسم کے دیگر اعضاء تک بھی دور دور تک پھیل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ گردن، نچلے جبڑے، پیٹھ، عقب میں دونوں کندھوں کے درمیان یا پھر فم معدہ تک بھی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انجائینا کا درد ہلکا بھی ہوسکتا ہے۔ اور ہلکا ہونے کے باوجود بھی خطرناک ہوسکتا ہے دراصل یہ دل سے متعلق باریک لال رگوں کے تنگ ہوجانے سے لاحق ہوجاتا ہے اور اگر یہ رگیں ستر فیصدی تنگ ہوچکی ہوں تو درد حرکت کرنے سے ہوجاتا ہے اور اگر یہ نوے فیصدی تک تنگ ہوگئی ہوں تو بغیر کچھ کیے بھی درد ہوسکتا ہے۔

اردو ادب میں سید عابد علی عابد نے انجائینا کا ذکر ادبی چاشنی کے ساتھ یوں کیا ہے:

”اواخر عمر میں حافظ محمود شیرانی، اقبال مرحوم کی طرح، تاثیر کی طرح، تاجور کی طرح، حسرت کی طرح اور اب یہ کہہ دینا چاہیے کہ میری طرح، مرضِ قلب (انجائینا)

اردو شاعری میں دل و دماغ اور جگر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے یہ شاعری بطورِ خاص دل کے تذکرے سے بھری پڑی ہے۔

میں مبتلا ہوگئے تھے،ان کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں،ان سے پتہ چلتا ہے، کہ ان کو وجع القلب تھا یعنی دردِ دل۔اس موذی مرض کا جب دورہ پڑتا ہے اور مجھ پر یہ کیفیت گزر چکی ہے تو مریض کو یوں معلوم ہوتا ہے گویا اس حملے سے جانبر نہیں ہوگا۔پھر یکا یک درد رفع ہوجاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد طبیعت بحال ہوجاتی ہے،تو مریض کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے درد کبھی تھا ہی نہیں۔"

ان تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انجائینا کی علامات بالکل واضح ہوتی ہیں اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔یہاں یہ باتیں بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ انجائینا کو یہ نام 1868 میں ایک انگریز طبیب نے دیا جس نے اس کی تشخیص کے لیے چار اہم علامات کا موجود ہونا لازمی قرار دیا ہے۔

(1) درد سینے کے درمیاں سے اٹھے (2) درد بائیں ہاتھ کی طرف پھیلے (3) درد حرکت کرنے سے شروع ہو جائے۔(4) درد تیس سیکنڈ سے زیادہ اور تیس منٹ سے کم وقفے تک رہے۔موجودہ دور میں پانچویں اہم بات یہ جوڑ دی گئی ہے کہ یہ درد نائٹروگلسرین کی گولی کو منہ میں، زبان کے نیچے رکھنے سے فوراً رفع ہوجائے۔دراصل اس زمانے میں یہ دوائی ابھی دریافت نہیں ہوئی تھی اس کے سو سال بعد دریافت ہوگئی۔

جسم انسانی میں موجود پانچ اہم اعضاء،جنہیں اعضائے رئیسہ بھی کہا جاتا ہے، میں دل کو انتہائی اہمیت حاصل ہے جو قرآن و حدیث سے بھی ثابت ہے۔پانچ ہزار سال قبل بھی انسانی قلب کے بارے میں یہ معلومات تھیں کہ قلب سرچشمہ حیات ہے اور دل کا مختلف اعضائے بدن کے ساتھ ایک قریبی اور اہم تعلق اور رشتہ ہے اور اس تعلق اور رشتے کو انسانی ارتقا کے ابتدائی دور سے ہی محسوس کیا گیا ہے انسانی عقل و خرد کے موجودہ ارتقائی دور میں،ہر روز اس پر نئی نئی تحقیق منظرِ عام پر لائی جارہی ہے۔

ہر انسان کا دل مسرت و شادمانی سے خوش ہوتا ہے اور حزن و غم و ملال سے رنجیدہ اور ملول ہوتا ہے انبساط و خوشی سے اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر جاتا ہے اور غم و اندوہ،درد و کرب سے وہ چیختا اور چلاتا ہے اور اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔مسرت و انبساط اور رنج و غم سے، اس کے جسم کا جو عضو سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے،وہ اس کا دل ہے۔کسی بھی شاعر کا کلام زیادہ تر دل کی ان ہی دو کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ہاں البتہ آہنگ و اسلوب ہر شاعر کا الگ الگ اور منفرد ہوتا ہے خوشی اور غم کے پیمانے بھی الگ الگ ہیں۔

اردو زبان و ادب کے صفِ اول کے ادبا اور شعرا بھی عصرِ حاضر میں تخلیق ہونے والے ادب میں،دل سے متعلق نئے نئے اور اچھوتے موضوعات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اردو شاعری میں دل و دماغ اور جگر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے یہ شاعری بطورِ خاص دل کے تذکرے سے بھری پڑی ہے۔اگر ہم صفِ اول کے شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے کلام کو ہی لیں تو اس میں جا بجا مختلف اور منفرد انداز و اسلوب میں،دل کا تذکرہ ملتا ہے اور حسرتِ دل،وحشتِ دل،جراحتِ دل، مرہمِ دل،زخمِ دل،داغِ دل،دشمنِ دل،سوزشِ دل،جوشِ دل،گوشۂ دل،راحتِ دل،خونِ دل،نالۂ دل،چاکِ دل تنگیِ دل اور دلِ ناشاد،دلِ افسردہ،دلِ حزیں،دلِ خستہ، دلِ بیتاب،دلِ ناداں،دلِ مجروح اور اس طرح کے لاتعداد الفاظ و تراکیب و استعارے ملتے ہیں جو نہ صرف میر و مومن، غالب و اقبال اور فراق و فیض کی شاعری میں بھی جا بجا ملتے ہیں بلکہ معاصر شعرا کی شاعری میں بھی منفرد و مخصوص معانی و مفہوم کے ضمن میں مستعمل ہیں۔ جس سے اردو شاعری میں انسانی اعضائے رئیسہ میں دماغ و جگر کے ساتھ ساتھ بطورِ خاص اہمیتِ دل کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔اس سلسلے میں مرزا غالب کے ان چند اشعار کی مثال دی جاسکتی ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

دیدۂ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال
ایک دل،تس پر یہ نا امید واری ہائے ہائے

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

لاتعداد اشعار ہیں،وہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک،سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو لکھا جائے اور کسے چھوڑا جائے۔

شاعروں، ادیبوں، مفکروں، عالموں، تاجروں، سیاست دانوں،غرض انسانی معاشرے سے جڑے ہر طبقے اور مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ہر فرد و بشر کو،اپنے سینے میں رکھے ہوئے گوشت کے اس ایک لوتھڑے کی،جو قدرت کے عجائبات میں سے ایک بہت بڑا عجوبہ ہے، اہمیت و افادیت کا بھرپور احساس و اندازہ ہے کہ جو اگر ستر سال بھی زندہ رہا تو چار کھرب دفعہ دھڑکے گا اور اس دوران دس کروڑ گیلن خون کا اخراج کرے گا۔اس حساب سے دل اپنی تین دھڑکنوں میں ایک پیالی خون خارج کرے گا اور سخت محنت کی جائے تو فی گھنٹہ 14 بیرل خارج کرے گا۔دل بظاہر ایک چھوٹا سا عضو ہے لیکن اس کو جس قدر اور جس نوعیت کا کام کرنا پڑتا ہے وہ ہر لحاظ سے نہ صرف تعجب خیز ہے بلکہ حیران کن بھی ہے۔آج کل کے اس کمپیوٹر ایج میں بھی کیا کوئی ایسی منظم، مستحکم، مربوط و پائیدار مشین ہے؟ جو اس کا مقابلہ کر سکے؟ اس میں انسانی جسم میں ہنگامی حالت سے پیدا شدہ ہر صورت حال سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت وصفت بھی ہے۔جسم کے تمام اعضا کو خون کی رسد پہنچانا اس کی ذمے داری ہے ہی اور ساتھ ساتھ اپنی نشوونما کے لیے خوراک حاصل کرنا بھی نہیں بھولتا۔

یاد رکھو تمہارے جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہو گا تو سمجھ لو تمہارا سارا جسم صحیح ہے اور اگر اس میں کوئی بگاڑ آگیا تو سمجھ لو تمہارے سارے جسم میں بگاڑ آگیا۔یاد رکھو وہ لوتھڑا قلب ہے۔

دل کے ہزار پہلو سہی، طبی، طبعی، ادبی یا شاعرانہ پہلو کا تذکرہ تو ٹھیک ہے،اشرف المخلوقات کے قلبِ سلیم کا،ان سب سے بڑھ کر ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ ہے اس کا روحانی پہلو، بخاری شریف کی حدیثِ مبارکہ ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ

"یاد رکھو تمہارے جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہوگا تو سمجھ لو تمہارا سارا جسم صحیح ہے اور اگر اس میں کوئی بگاڑ آگیا تو سمجھ لو تمہارے سارے جسم میں بگاڑ آگیا۔یاد رکھو وہ لوتھڑا قلب ہے۔"

اس مضمون کو ایک شاعر نے اپنے شعر میں کس خوبصورتی اور چابکدستی سے یوں باندھا ہے۔

دل کے بگاڑ سے ہی بگڑتا ہے آدمی
جس نے اسے سنبھال لیا وہ سنبھل گیا

■

Dr. Ashraf Asari
Sidra Bal, Hazrat Bal
Srinagar - 190006 (J&K)
Mob.: 9419017246
Email.: dr.ashraf.asari@gmail.com

سریتا چوہان

مجروح سلطانپوری اور فلمی نغمے

'جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں گے' جیسے نغمے سے اپنے فلمی گیتوں کے سفر کا آغاز کرنے والے اسرارالحسن خاں یعنی مجروح سلطانپوری اردو کے عظیم ترقی پسند شاعر اور نغمہ ساز تھے۔ مجروح اتر پردیش کے ضلع سلطانپور کے قصبہ گجری میں 1919 یا 1920 میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ذہین طالب علم تھے۔ انھوں نے طب میں مہارت اور شہرت دونوں حاصل کر لی تھی اور 1938 میں کالج سے سند حاصل کرنے کے بعد فیض آباد کے ایک قصبہ ٹانڈہ میں اپنا مطب قائم کیا۔ شاعری سے دلچسپی کے باعث غالباً 1935 یا 1936 میں غزل کا رخ کیا یہ بات اور ہے کہ ان کی غزلوں کی تعداد مختصر ہے، پھر بھی ان کی شاعری لوگوں کے دلوں میں دھڑکتی ہے جس کی اہمیت و انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی دور میں 'اسرار ناصح' نام سے شاعری کرتے تھے لیکن بعد میں 'مجروح' ہو گئے۔

مجروح نے اس وقت غزل کا دامن تھاما جب نظم کے پیرایے میں اظہار کی راہیں زیادہ آسان تھیں۔ غزل کے اس انحطاط کے وقت میں انھوں نے غزل کو حسن و وقار عطا کیا جو کسی لحاظ سے معمولی جسارت نہیں تھی۔ حالانکہ ان کے ساتھ ساتھ فیض، جذبی، نیاز حیدر، سردار جعفری، مجاز، جاں نثار اختر وغیرہ بھی غزلیں کہہ رہے تھے۔ ہر ایک کا اپنا الگ فکر اسلوب تھا۔ یہ بھی ترقی پسند شاعری کے علمبردار بھی ہیں اور ایک دوسرے کے رفیق و رقیب بھی۔ ایسے دور میں مجروح نے خود کی الگ شناخت بنائی۔

جیسا کہ مجروح صاحب نے خود بھی کہا ہے کہ:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروح کی شاعری بھیڑ میں گم ہونے والی نہیں ہے۔ ان کی آواز بھیڑ میں بھی خود کو ظاہر کر دیتی ہے۔ مجروح کی غزلوں کے متعلق وارث کرمانی لکھتے ہیں:

''غالب کے بعد اگر اردو کی پوری غنائی شاعری کے صرف ایک ہزار شعروں کا انتخاب کیا جائے جس میں حالی، داغ، اقبال اور نہ جانے کتنے بلند اقبال شاعر نظر آئیں گے تو اس انتخاب میں مجروح سلطان پوری کا کوئی شعر ضرور آئے گا اور اگر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے تمام شاعروں کے کلام سے سو بہترین غزلیں منتخب کی جائیں تو اس میں مجروح کی کئی غزلیں آ جائیں گی اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ایسے اشعار کو یکجا کیا جائے جو اس وقت باذوق لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں تو ان میں مجروح کے شعروں کی تعداد اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہوگی۔'' (ایضاً ص 35)

اچھے غزل گو ہونے کے باوجود بھی مجروح کی مقبولیت کا باعث فلموں میں لکھے گئے ان کے نغمے ہیں۔ مجروح نے ساٹھ سال کے طویل عرصے تک ہندی فلموں کے لیے گیت لکھے جہاں ایک طرف ان کے غزلوں کی تعداد 50 کے آس پاس ہے وہیں فلمی نغموں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ حالانکہ جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی اور دیگر شعرا بھی فلموں سے وابستہ تھے اور ان کا تخلیقی سرمایہ بھی اچھا خاصا ہے لیکن مجروح نے فلمی دنیا میں اپنی تخلیقی کاوش کا پرچم لہرایا اور ایک سے ایک سپر ہٹ گانے دیے حالانکہ انھیں اس بات کا افسوس بھی تھا کہ اب اہل فن بھی بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ اس المناکی کا نوحہ انھوں نے کچھ یوں لکھا ہے۔

ہم ہیں متاع کوچۂ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

مجروح کے گیتوں کے اس سفر کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ آزادی سے دو سال قبل ایک مشاعرے میں حصہ لینے کے لیے مایانگری ممبئی جانا ہوا جہاں ان کی ملاقات مشہور فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اے۔ آر۔ کاردار سے ہوئی، اور جیسا کہ سونے کی پرکھ ایک جوہری ہی کر سکتا ہے کاردار نے بھی اس نگینے کو پہچانا اور اپنی فلم 'شاہجہاں (1946)' کے گیت لکھنے کی درخواست کی۔ پہلے تو مجروح نے منع کر دیا لیکن بعد میں جگر مرادآبادی جو مولانا آسی کے بعد ان کی شاعری کے استاد تھے، کے کہنے پر راضی ہو گئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ اس فلم کے نغمے بہت مشہور ہوئے۔ جن میں 'غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل' اور 'جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے' خاصے اہم تھے۔ 'جب دل ہی ٹوٹ گیا' کو کے۔ ایل۔ سہگل صاحب نے اپنے جنازہ پر اس کے رکارڈ کو بجائے جانے کی درخواست کی تھی جو پوری بھی ہوئی۔ یہ گیت آج بھی اتنے ہی پسند کیے جاتے ہیں جتنے کہ ستر، اسی سال پہلے۔ اور اس طرح پہلے طب، اس کے بعد ترقی پسند غزل گو اور اب مجروح کے گیتوں کی دنیا کا آغاز ہوا۔

مجروح سلطانپوری کے گیتوں میں اردو شاعری اور لفظیات کی گرفت نے ان کو امر کر دیا۔ ابتدائی دور میں ان کا انداز کلاسیکی تھا لیکن بدلتے وقت کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آئی۔ مجروح کے گیتوں میں گاؤں کی مٹی کی خوشبو کے ساتھ ساتھ ہندوستانی دیہات کی خوبصورتی اور تہذیب نظر آتی ہے اور یہ جذبہ جب پوری شدت کے ساتھ شعری آہنگ کا جزو بنتا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی سامع سے ایک رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ مجروح کے گیتوں میں ایسے جذبے ان کے نغمے 'بوجھ مرا کیا ناؤں رے، ندی کنارے گاؤں رے (سی آئی ڈی 1956)'، 'جو میں ہوتی راجا تھری دلھنیاں، ملک رہتی راجا تورے بنگلے پر' (کالا پانی 1958)، 'ماں ری میں کا سے کہوں پیر اپنے جیا کی، پی کی ڈگر میں بیٹھی میلا ہوا ری مورا آنچرا' (دستک 1970)، 'تھارے رہیو او بانکے یار رے' (پاکیزہ 1972) میں خاصے اثر انداز نظر آتے ہیں جو انھیں عوام کے اور قریب لے آتے ہیں۔

مجروح کے گیتوں میں عورت کے جذبات و احساسات، کیفیات و ادائیں اور ناز و نخرے بھی خوب ملتے ہیں جن میں رومانیت کے ساتھ ساتھ پاکیزگی بھی دامن نہیں چھوڑتی۔

مثلاً: 'وادیاں مرا دامن راستے مری باہیں، جاؤ میرے سوا تم کہاں جاؤ گے (ابھیلاشا 1968)' اور 'لے کے پہلا پہلا پیار، بھر کے آنکھوں میں خمار، جادو نگری سے آیا ہے کوئی جادوگر (سی آئی ڈی 1965)'۔ اس کے بعد فلم 'دوستی' (1964) کا 'میری دوستی میرا پیار'، 'راہی منوا دکھ کی چنتا کیوں ستاتی ہے دکھ تو اپنا ساتھی ہے'، 'چاہوں گا میں تمہیں سانجھ سویرے، پھر بھی کبھی اب نام کو تیرے آواز میں نہ دوں گا' بھی مجروح کے قلم سے نکلے جس نے پچھی کانت پیارے لال کو پچھی کانت پیارے لال بنا دیا اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کو مجروح کے قالب میں ایک نگینہ مل گیا۔ اس کے علاوہ راجیش روشن، آنند ملند، آر۔ ڈی۔ برمن، او۔ پی نیر وغیرہ کے لیے مجروح صاحب نے نغمے لکھے اور ان کو مشہور کر دیا۔ مجروح نے ہندی سنیما کو کامیاب زبان کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ بھی دیے مثلاً۔ صنم، بندہ پرور، محترمہ، قبلہ وغیرہ۔ بقول وہاب اشرفی ''وہ خود بھی کہتے ہیں کہ جو طرز انھوں نے ایجاد کی آج سارے گیت کار اسی پر چل رہے ہیں۔ موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ رومانٹک کامیڈی کی ایجاد انھوں نے ہی کی تھی۔'' (ایضاً، ص 64)

زندگی کی رومانیت بیانی میں مجروح کو مہارت حاصل ہے یا یوں کہیں کہ ایک نئی روش کا نام ہے مجروح سلطانپوری۔ ان کی رومانیت میں ایک خاص وزن و وقار نظر آتا ہے۔ چند گیت دیکھیں: 'چھپا لو دل میں یوں پیار مرا، کہ جیسے مندر میں لو دیے کی (ممتا 1966)'، 'ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے، ساغر میں زندگی کو اتارے چلے گئے (کالا پانی 1958)'، 'ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک، خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے (بہو بیگم 1967)'، 'تصویر تری دل میں جس دن سے اتاری ہے، پھروں تجھے سنگ لے کے نئے نئے رنگ لے کے سپنوں کی محفل میں (مایا 1961)'، 'محبت نے چھیڑا ہے پھر ساز دل کا، وہ ہر تار میں راگنی بن کے آیا (انداز 1949)'، 'اب کیا مثال دوں میں تمھارے شباب کی، انسان بن گئی ہے کرن ماہتاب کی (آرتی 1962)'، 'تجھے کیا سناؤں اے دلربا ترے سامنے میرا حال ہے، تیری اک نگاہ کی بات ہے میری زندگی کا سوال ہے (آخری داؤ 1975)'، 'کہیں بے خیال ہو کر یوں ہی چھو لیا کسی نے، کئی خواب دیکھ ڈالے یہاں میری بے خودی نے (تین دیویاں 1965)'۔

اس کے علاوہ جیسا کہ ہم واقف ہیں غم و یاس کسی شخص کو نہیں چھوڑتے۔ چونکہ غم اور دل کا معاملہ تو یوں ہے کہ یہ ہمسائے کی مانند ہیں۔ دل ہو اور درد نہ ہو تصور ہی خام ہے اور مجروح اس سے بخوبی واقف معلوم پڑتے ہیں۔ اداسی کے عالم میں، شام کی تنہائی میں، درد بھرے دل میں اور زندگی کی بے وفائی میں مجروح روح تک اتر جاتے ہیں۔ کلیجے کو چھلنی کرنے والی تنہائی مجروح کے گیتوں سے پھوٹ پڑتی ہے۔ مثلاً: 'ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح، اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح، مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام، ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح (دستک 1970)'، 'پتھر کے صنم تجھے ہم نے محبت کا خدا جانا، بڑی بھول ہوئی ارے ہم نے یہ کیا سمجھا یہ کیا جانا (پتھر کے صنم 1967)'، 'ہوئی شام ان کا خیال آ گیا، وہی زندگی کا سوال آ گیا (میرے ہمدم میرے دوست 1968)' اور 'انھیں لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا (پاکیزہ 1972)'، 'ٹکڑے ہیں مرے دل کے اے یار ترے آنسو، دیکھے نہیں جاتے ہیں دلدار ترے آنسو (میرے صنم 1965)' وغیرہ۔

عشقیہ احساسات کے علاوہ مجروح زندگی کے اور مرحلے بھی طے کرواتے ہیں۔ رشتوں کی اہمیت کو بھی ان کے گیتوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں سماجی رشتوں کے مابین تعلق کی ترجمانی نہایت دلفریب انداز میں پیش کی گئی ہے جس سے انسان کو حوصلہ بھی ملتا ہے اور دلکشی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مثلاً: 'اے ماں تری صورت سے الگ بھگوان کی صورت کیا ہوگی (دادی ماں 1966)'، 'بابل پچھتائے ہاتھوں کو مل کر، کاہے دیا پردیس ٹکڑے کو دل کے (بمبئی کا بابو 1960)'، 'ہم ہیں راہی پیار کے ہم سے کچھ نہ بولیے، ہم سے جو پیار سے ملا ہم اسی کے ہو لیے (نو دو گیارہ 1957)'، 'راہی منوا دکھ کی چنتا کیوں ستاتی ہے، دکھ تو اپنا ساتھی ہے (دوستی 1964)'، 'مری دنیا ہے ماں ترے آنچل میں، شیتل چھایا تو دکھ کے جنگل میں (تلاش 1969)' وغیرہ۔

اس کے علاوہ چند گیت بالکل الگ انداز کے ہیں۔ جیسے 'بابو سمجھو اشارے، ہارن پکارے، پم پم پم (چلتی کا نام گاڑی 1958)'، 'پانچ روپیہ بارہ آنا (چلتی کا نام گاڑی 1958)'، 'ہم تو محبت کرے گا (دلی کا ٹھگ 1958)'، 'اچھا جی میں ہاری چلو مان جاؤ نا (کالا پانی 1985)'، 'اک لڑکی بھیگی بھاگی سی، سوتی راتوں میں جاگی سی (چلتی کا نام گاڑی 1958)' وغیرہ۔

مجروح کے گیتوں کی ہر نسل دیوانی ہے، کیا بوڑھے، کیا بچے اور کیا جواں دل نوجوان کیوں کہ مجروح نے خود کو وقت کے ساتھ بدلا ہے۔ یہ ہنر سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ نئی نسل کو خطاب کر کے جو گیت انھوں نے لکھے ہیں ان میں 'ایسے نہ مجھے تم دیکھو، سینے سے لگا لوں گا (ڈارلنگ ڈارلنگ 1977)'، 'بچنا اے حسینو لو میں آ گیا (ہم کسی سے کم نہیں 1977)'، 'چلا جاتا ہوں کسی کی دھن میں، دھڑکتے دل کے ترانے لیے (میرے جیون ساتھی 1972)'، 'باہوں میں چلے آؤ، ہو ہم سے صنم کیا پردا (انامیکا 1973)'، 'چرا لیا ہے تم نے جو دل کو نظر نہیں چرانا صنم (یادوں کی برات 1973)'، 'یہ دل نہ ہوتا بے چارہ، قدم نہ ہوتے آوارہ (جویل تھیف 1967)'، 'پاپا کہتے ہیں بڑا نام کرے گا بیٹا ہمارا ایسا کام کرے گا مگر یہ تو کوئی نہ جانے کہ میری منزل ہے کہاں (قیامت سے قیامت تک 1988)'، اور 'جانم سمجھا کرو (1999)' وغیرہ قابل توجہ ہیں۔

نوجوان دلوں کو کھلکھلانے، ان کے غم میں شریک ہونے اور ان کی محبت میں جھومنے اور گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی تکلیفوں اور مایوسیوں سے پار پانے کا جو ہنر مجروح کو تھا وہ نایاب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجروح صاحب کا فن آج بھی نیا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی ہم ان کے نغموں کو گنگناتے جا رہے ہیں۔ ان کے گیت نہ صرف عوام کے لیے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسان کو زندگی کا آئینہ دکھا رہے ہیں۔ اور اس طرح مسکراتے اور زندگی کی راہیں دکھاتے مجروح سلطانپوری 24 مئی 2000 میں اس دنیا کو الوداع کہہ گئے اور ہمارے لیے اپنی روح کو گیتوں کے قالب میں ڈھال گئے جو انھیں کبھی فنا نہیں ہونے دیں گے۔

مجروح صاحب نے تین سو سے زائد فلموں میں ہزاروں گیت لکھے ہیں جو لافانی ہیں۔ شاہجہاں، انداز، ممتا، دوستی، ساتھی، دستک اور آرتی... سے لے کر خوددار، کالیا، قیامت سے قیامت تک، انداز اپنا اپنا، خاموشی اور غلام تک کا ان کا سفر انھیں ہمیشہ ہماری یادوں میں زندہ رکھے گا۔ فلمی دنیا اور اردو ادب میں ان کی خدمات کے لیے انھیں غالب ایوارڈ (180)، امتیاز میر سمان، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ، اقبال سمان (1992)، اور فلم کا سب سے بڑا انعام داداصاحب پھالکے ایوارڈ (1993) بھی ملا جو کسی بھی تخلیق کار اور اس ادب اور انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کے لیے فخر کی بات ہے۔

غرض یہ کہ مجروح صاحب نے اردو ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سنیما کو بھی اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ فلم 'ممتا' میں لکھے ایک گیت کے ساتھ میں اس امید سے اپنے بیان کا اختتام کر رہی ہوں کہ اس گیت کی طرح مجروح صاحب کی تخلیقات بھی اردو ادب اور جواں دلوں کو ہمیشہ معطر کرتی رہیں گی۔

رہیں نہ رہیں ہم، مہکا کریں گے
بن کے کلی بن کے صبا باغ وفا میں

■

Sarita Chauhan
117, Yamuna Hostel, JNU, New Delhi - 110067
Mob.:9717199351
Email.: sarita152jnu@gmail.com

ورک شیٹ کو سجانا
Enhancing Worksheet

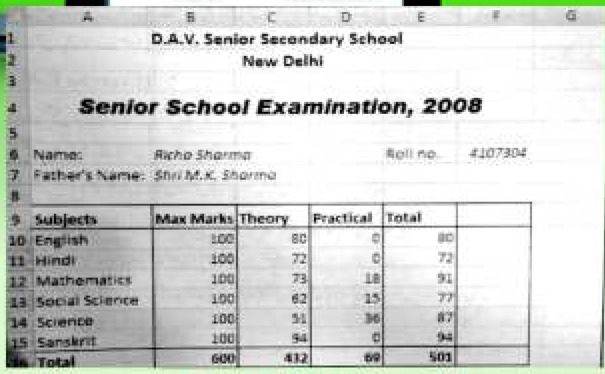

	A	B	C	D	E	F	G
1		D.A.V. Senior Secondary School					
2		New Delhi					
3							
4	Senior School Examination, 2008						
5							
6	Name:	Richa Sharma			Roll no.	4107304	
7	Father's Name:	Shri M.K. Sharma					
8							
9	Subjects	Max Marks	Theory	Practical	Total		
10	English	100	80	0	80		
11	Hindi	100	72	0	72		
12	Mathematics	100	73	18	91		
13	Social Science	100	62	15	77		
14	Science	100	51	36	87		
15	Sanskrit	100	94	0	94		
16	Total	600	432	69	501		

تصویر E-4.13 بارڈر لائنیں کھینچنے کے بعد ورک شیٹ

پیج سیٹ کرنا (Setting Page)

ایکسل میں آپ کو ورک شیٹ میں ہی پیج ختم ہونے کے اشارے ملتے ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک پیج میں کتنا مواد جا سکتا ہے۔ اس کے لیے نئی ورک شیٹ بناتے وقت اس کے پیج کی لمبائی اور چوڑائی طے کر دینا اچھا رہتا ہے۔ اس کے لیے Page Layout ٹیب کے Page Setup حصہ کو دیکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے زیادہ تر بٹن ایم ایس-ورڈ سے ملتے ہیں۔ Page Setup ڈائیلاگ باکس لانچر پر کلک کیجیے، جس سے آپ کی اسکرین پر تصویر E-4.14 کی طرح پیج سیٹ اَپ کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں چار ٹیب شیٹ ہیں، جن میں سے پہلی تین ٹیب شیٹوں میں بالترتیب پیج، حاشیوں اور ہیڈر/فوٹر اطلاعات دی جاتی ہیں، جو ایم ایس-ورڈ سے ملتی جلتی ہیں۔ تصویر E-4.14 میں Page ٹیب شیٹ دکھائی گئی ہے۔ اس کے Scaling حصہ میں دو ریڈیو بٹن ہیں۔ آپ ان میں سے پہلے ریڈیو بٹن 'Adjust to...' کو سیٹ کرکے اور اس کے اسپن باکس میں فیصد میں اسکیلنگ فیکٹر سیٹ کرکے مواد کو چھاپ سکتے ہیں۔ 100% اسکیلنگ فیکٹر کا مطلب ہے۔ یکساں سائز، یعنی جتنا آپ نے سیٹ کیا ہے۔ 50% کا مطلب ہے۔ آدھے سائز میں، یعنی چھوٹے حروف۔ اسی طرح آپ دیگر فیصدوں کے بارے میں سمجھ سکتے ہیں۔ فیصد گھٹا دینے سے ایک صفحہ پر زیادہ مواد چھاپا جا سکتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ سارا مواد کچھ متعینہ تعداد میں صفحات پر چھاپ دیا جائے، خواہ حروف کتنے بھی چھوٹے یا بڑے آئیں، تو اسکیلنگ حصہ کے دوسرے ریڈیو بٹن 'Fit to..' کو سیٹ کرکے اس اسپن باکسوں میں بالترتیب چوڑائی اور لمبائی میں صفحات کی تعداد سیٹ کیجیے۔

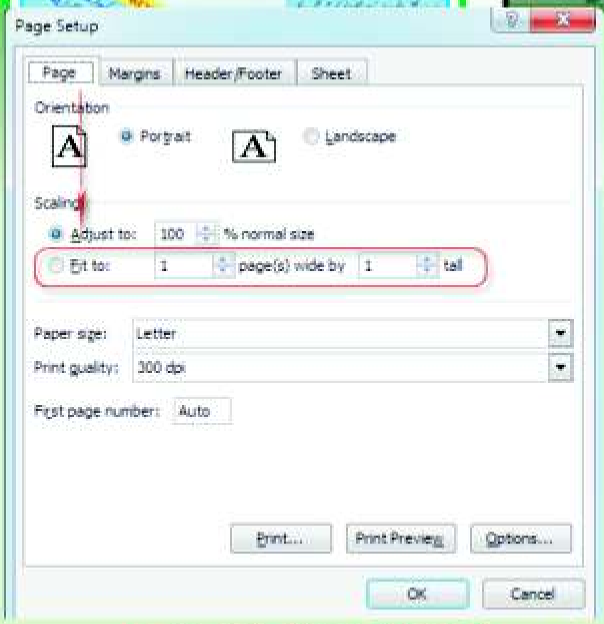

تصویر E-4.14 پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس کی Page ٹیب شیٹ

سبھی ضروری سیٹنگ کرنے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آپ کے ذریعے کی گئی سیٹنگ مؤثر ہو جائے گی۔

آپ اس ڈائیلاگ باکس میں '...Print' بٹن کلک کرکے ورک شیٹ کو چھاپ بھی سکتے ہیں اور 'Print Preview' ہدایت دے کر اسے پہلے دیکھ سکتے ہیں۔

پیج بریک ڈالنا اور ہٹانا (Inserting and Removing Page Breaks)

ایم ایس-ایکسل میں آپ کے ذریعے سیٹ کیے گئے یا ڈیفالٹ پیج سیٹ اَپ کے مطابق ہر ایک صفحہ پورا ہونے پر ان کی حد خود ہی بتا دی جاتی ہے، جو ہمیں ٹوٹی لائن (Dashed Line) کی شکل میں نظر آتی ہے لیکن کبھی کبھی بیچ میں ہی پیج ختم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے آپ کو پیج بریک ڈالنا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے اس سیل کو ایکٹو کیجیے (یعنی کلک کیجیے)، جو مطلوبہ بارڈر لائن کے ٹھیک دائیں اور ٹھیک

تصویر E-4.15: Break مینو

نیچے ہو۔اب تصویر E-4.15 کی طرح Page Layout ٹیب کے Breaks مینو میں 'Insert Page Break' ہدایت دیجیے۔ایسا کرتے ہی چنے ہوئے سیل کے اوپر اور بائیں صفحات کی بارڈر لائنوں کو بتانے والی ٹوٹی لائنیں نظر آئیں گی۔

پیج بریک کو ہٹانے کے لیے اسی سیل کو ایکٹو کرکے 'Breaks' مینو میں 'Remove Page Break' ہدایت دیجیے۔

ورک شیٹ کو چھپوانا (Printing a Worksheet)

ایم ایس-ورڈ کی دستاویزوں کی طرح ایکسل کی ورک شیٹوں کو بھی آپ آفس مینو کی '...Print' ہدایت کے ذریعے چھپوا سکتے ہیں۔عام طور پر کسی ورک شیٹ کا اتنا ہی حصہ چھاپا جاتا ہے، جتنے میں ڈاٹا بھرا ہوتا ہے،یعنی سیل A1 سے اس آخری قطار اور کالم تک،جس میں کوئی ڈاٹا بھرا ہوتا ہے۔تصویر E-4.13 کی ورک شیٹ کو چھاپنے کے لیے آفس مینو میں 'Print' ہدایت دیجیے۔اس کے بعد دائیں پٹی میں دیے گئے آپشنز میں سے Print آپشن چنیے۔اس سے آپ کو تصویر E-4.16 کی طرح Print کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔اس ڈائیلاگ باکس کے 'Print what' حصہ میں 'Active worksheet(s)' ریڈیو بٹن کو سیٹ کر دیجیے۔پرنٹر اور کاپیوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں سیٹنگ کرنے کے بعد OK بٹن کو کلک کیجیے۔اس سے آپ کی ورک شیٹ تصویر E-4.18 کی طرح چھاپ دی جائے گی۔ 'Preview' بٹن کو کلک کرکے آپ چھپائی سے پہلے اسے دیکھ بھی سکتے ہیں۔

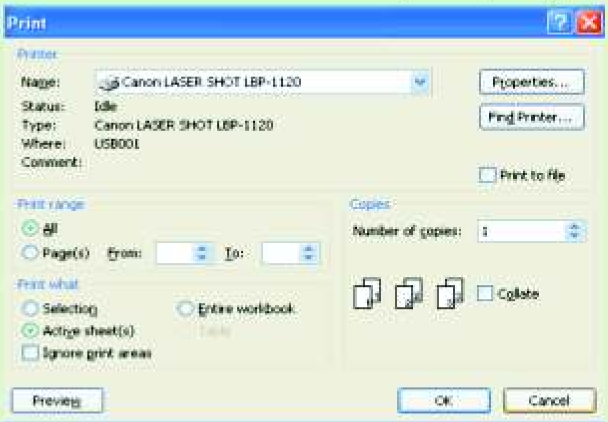

تصویر E-4.16: پرنٹ کا ڈائیلاگ باکس

اگر آپ کسی چنے ہوئے حصہ کو ہی چھاپنا چاہتے ہیں،تو اس حصہ کو چن کر آفس مینو کے ذریعے Print ہدایت دیجیے۔اس سے حاصل ہونے والے Print ڈائیلاگ باکس کے 'Print what' حصہ میں 'Selection' ریڈیو بٹن کو سیٹ کر دیجیے۔اس سے صرف چنا ہوا حصہ ہی چھاپا جائے گا۔

دھیان دیجیے کہ اس چھپی ہوئی ورک شیٹ میں سیلوں کو الگ الگ دکھانے والی گرڈ لائنیں (Gridlines) دکھائی نہیں دے رہی ہیں، بلکہ صرف وہ بارڈر لائنیں چھاپی گئی ہیں، جو آپ نے بارڈر ٹولس سے بنائی تھیں۔اگر آپ گرڈ لائنوں کو بھی چھاپنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس کی 'Sheet' ٹیب شیٹ (تصویر E-4.19) میں 'Gridlines' چیک باکس کو سیٹ کر دیجیے۔

پرنٹ ایریا سیٹ کرنا (Setting Print Area)

کئی بار ہم کسی ورک شیٹ کے ایک متعینہ چنے ہوئے حصہ کو ہی چھاپنا چاہتے ہیں، لیکن Print ڈائیلاگ باکس میں Selection آپشن کو سیٹ کرنا بھول جاتے ہیں، جس

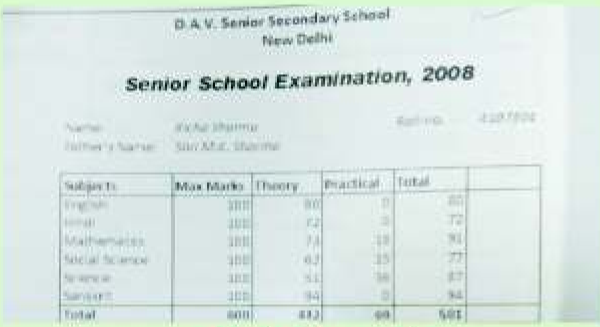

D.A.V. Senior Secondary School
New Delhi

Senior School Examination, 2008

Name: [illegible]
Father's Name: [illegible]
Roll no. [illegible]

Subjects	Max Marks	Theory	Practical	Total
English	100	80	0	80
Hindi	100	72	0	72
Mathematics	100	73	18	91
Social Science	100	62	15	77
Science	100	51	36	87
Sanskrit	100	94	0	94
Total	600	432	69	501

تصویر E-4.17: چھپی ہوئی ورک شیٹ

سے ساری ورک شیٹ چھاپ دی جاتی ہے اور ہمارا وقت برباد ہوتا ہے۔اس پریشانی سے بچنے کے لیے پرنٹ کیا جانے والا ایریا پہلے ہی سیٹ کر دینا اچھا رہتا ہے۔ایسا کرکے آپ صرف Print ہدایت دے کر ورک شیٹ کے ضروری حصہ کو چھاپ سکتے ہیں۔

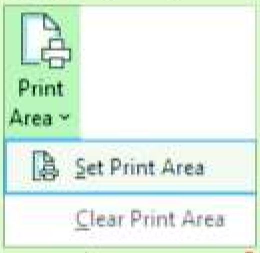

تصویر E-4.18: پرنٹ ایریا کا پل-ڈاؤن مینو

پرنٹ ایریا سیٹ کرنے کے دو طریقے ہیں۔پہلے طریقہ میں اس حصہ کو چن کر Page Layout ٹیب کے Page Setup حصہ میں 'Print Area' آپشن کے پل-ڈاؤن مینو (تصویر E-4.18 دیکھیے) میں 'Set Print Area' ہدایت دی جاتی ہے۔اس ہدایت کو دینے سے پرانا سیٹ کیا ہوا پرنٹ ایریا رد ہو جاتا ہے اور چنی ہوئی رینج کو پرنٹ ایریا بنا دیا جاتا ہے۔اگر آپ اس سیٹنگ کو صرف رد کرنا چاہتے ہیں، یعنی ساری ورک شیٹ کو چھپوانا چاہتے ہیں، تو اس مینو میں 'Clear Print Area' ہدایت دینی چاہیے۔

پرنٹ ایریا سیٹ کرنے کے دوسرے طریقہ میں پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس ڈائیلاگ باکس کی 'Sheet' ٹیب شیٹ، جو تصویر E-4.19 میں دکھائی گئی ہے، میں 'Print Area' ٹیکسٹ باکس میں آپ پرنٹ ایریا کی رینج بھر سکتے ہیں۔

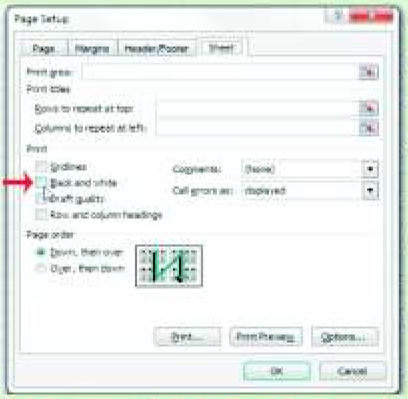

تصویر E-4.19: پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس کی Sheet ٹیب شیٹ

اس ٹیب شیٹ میں آپ ورک شیٹ چھاپنے کے بارے میں کچھ دیگر اطلاعات بھی دے سکتے ہیں، جیسے چھپائی کے ہر صفحہ پر دوہرائی، یعنی چھاپی جانے والی قطاریں اور کالم، گرڈ لائن چھاپنا چاہتے ہیں یا نہیں اور اگر مواد ایک پیج میں نہیں آپاتا، تو چھپائی کی ترتیب وغیرہ۔مکمل سیٹنگ کرکے 'OK' بٹن کو کلک کرنے سے آپ کی سیٹنگ لاگو ہو جاتی ہے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2، فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندھی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

عروض، آھنگ اور بیان

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 295، قیمت: 113 روپے، تیسری اشاعت: 2019

مبصر: فردوس بانو فلاحی، گلمرگ اپارٹمنٹ، M-109، فرسٹ فلور بیک ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی شخصیت یقیناً متنوع ہے، ان کی شخصیت کی کس جہت کو اولیت دی جائے یہ بہت مشکل امر ہے۔ ان کے کسی ایک میدان کو اولیت دینا دوسرے فن کے ساتھ ناانصافی کا احساس ہوتا ہے، تاہم اس بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی عروض دانی پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے ان کی مقبول تصنیف 'عروض آہنگ اور بیان' ہے جس کی یہ تیسری طباعت ہے۔ اس میں دو اولین اشاعتوں کی بہ نسبت قدرے حذف و اضافے اور ترمیم سے کام لیا گیا ہے۔ مزید تین ابواب سے کتاب کی تزئین و توسیع کی گئی ہے جو حسب ذیل ہیں (1) نقد معائب (2) اقبال کا عروضی نظام (3) غزل در غزل اور اولیپو۔

جب کسی ادارے یا معاشرے میں فطرت سے انحراف و اختلاف کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ضابطے و قوانین کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ یہی مرحلہ علوم وفنون کا ہے۔ دراصل علوم وفنون سماج کی ضرورت ہیں۔ ہر علم، ہر فن ایک مخصوص میدان سے منسلک و متعلق ہوتا ہے جس سے جڑے افراد کی زندگی میں تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے۔ جہاں علوم، ہادی و رہبر کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں فنون تطہیر و تنقیہ کار (Cathartic) کا درجہ رکھتے ہیں۔ شاعری دراصل معاشرے کے منفی اثرات سے بوجھل افراد کے دلوں کو ہلکا کرتی ہے، سکون بخشتی ہے اور زندگی کو آسان کرتی ہے، معاملات زندگی و مسائل حیات سے نجات و راحت کا ذریعہ بنتی ہے۔ تاہم جس مقام پر شاعری میں بگاڑ و بے راہ روی در آتی ہے، فطری آہنگ کے بجائے تصنع و تکلف کو زیادہ اہمیت دی جانے لگتی ہے وہیں ضابطے و قوانین وضع کیے جاتے ہیں، میزان و پیمانے اور اوزان و بحور متعین کیے جاتے ہیں۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ اولیت فن پاروں کو دی جاتی ہے نا کہ پیمانوں کو بقول شاعر 'ہر بحر میں ہے بحر طبیعت کی روانی' یعنی ہر فن پارہ فطری آہنگ میں ہوتا ہے۔ عروضیوں کے تشکیل کردہ میزان ایک مخصوص آہنگ میں ہوتے ہیں جن پر شعری تخلیقات تلتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے عروض و آہنگ پر بحث کرتے ہوئے اپنی تنقیدی جمالیات سے کام لیا ہے نیز مشرق و مغرب کے ماہرین عروض و آہنگ کی آرا پر اتفاق و اختلاف آمیز کلام کیا ہے اور متداول میزان میں نرمی و توسیع کی ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت انھوں نے ضرورت کو ترجیح دی ہے اور باب اول کی سرخی 'شعری آہنگ میں نئی فکر اور تنوع کی ضرورت' رکھی ہے۔ بحث کی ابتدا میں شعر، عروض اور آہنگ سے متعلق ارسطو، ازرا پاؤنڈ، ٹی ای ہیوم، جارج اسٹیوارٹ، شبلی نعمانی، نجم الغنی اور سیفی شیرازی کی آرا کو ان کے اقتباسات کی روشنی میں نقل کیا ہے لیکن اپنی گفتگو کا آغاز مشرقی مصنفین، سیفی، شبلی اور نجم الغنی سے کیا ہے۔ اس بحث نے کافی طول پکڑا حتیٰ یہ 23 صفحات کو محیط ہوگئی۔ اس بحث کا اختتام قدیم علوم پر دسترس کے بعد انحراف نیز نئے تازہ کار تجربات کو ممکن بنایا۔

باب دوم میں حرف و صوت اور ان کے اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث کافی طویل اور نہایت علمی ہے۔ یہ خالص متن اساس دقیق گفتگو ہے جو بہ یک وقت عربی، فارسی اور ترکی زبان کے قواعد و ضوابط سے مزین ہے اور جستہ جستہ اردو، عربی، فارسی کے متون درج ہیں۔ اس میں فاروقی صاحب کی عروضی علم دانی کا جوہر اپنی آب و تاب سے نمایاں ہوا ہے۔ گویا یہ باب شعر میں حرف کی آواز سے بحث کرتا ہے۔

باب سوم 'شکستہ بحر اور شکست ناروا' میں فاروقی صاحب کا تنقیدی شعور ان سے قبل کے ناقدین بحر مولانا حسرت موہانی، قاضی عبدالودود، آرزو لکھنوی کے بالترتیب رسالے 'معائب سخن' رسالہ 'فنون' لاہور میں شائع مضمون اور کتاب 'میزان الحروف' میں اجاگر ہوا ہے اور جگہ جگہ شعری متن سے استدلال کیا گیا ہے۔

چوتھا اور پانچواں باب نقد معائب (1) نقدِ معائب (2) ہے۔ نقد معائب (2) اس سے قبل کے ایڈیشن میں نہیں تھا۔ ان ابواب میں حسرت موہانی کے 'نکات سخن' کے عنوان سے پانچ مضامین متروکات سخن، معائب سخن، محاسن سخن اور نوادر سخن، فاروقی صاحب کی نظر سے گزرے لیکن ایک مضمون 'اصلاح سخن' انھیں دستیاب نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب نے احمر لاری، عابد علی عابد، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، حالی، سرسید، ارسطو، آرنلڈ، محمد حسین آزاد، غالب، صاحبِ غیاث اللغات، شوق نیموی وغیرہم کی آرا کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں اتفاق تو کہیں کہیں اختلاف رائے بھی ظاہر کی ہے۔

باب ششم 'غلطی عیب نہیں ہے' کے عنوان سے چوبیس صفحات پر محیط بحث ہے۔ اس عنوان کے تحت فاروقی صاحب نے غلطی اور عیب کو دو الگ الگ خانوں میں رکھ کر اپنی بات مکمل کی۔ ان کے نزدیک غلطی کی موجودگی میں بھی شعر اچھا ہوسکتا ہے تاہم عیب تو عیب ہے۔ اس کی مثال اشعار سے دی ہے۔

ان ابواب کے علاوہ چار مزید ابواب تسکین اوسط کے اسرار، اقبال کا عروضی نظام، غزل در غزل اور دسواں باب 'کچھ عروضی اصطلاحات' ہے۔ یہ کتاب خشک موضوع پر ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بہت سارے عروض دانوں کی آرا سے استفادے کا موقع ملے گا۔ دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت کار آمد کتاب ہے۔

تحقیق و تنقید

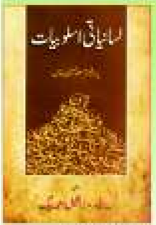

لسانیاتی اسلوبیات

مرتب: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 152، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: مصطفیٰ علی، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو میں اسلوبیاتی تنقید کا آغاز پروفیسر مسعود حسین خان کے ان اسلوبیاتی مضامین سے ہوا جو انھوں نے امریکہ سے اپنی واپسی کے بعد لکھنا شروع کیے۔ اس طرح پروفیسر مسعود حسین خان اس شخصیت کا نام ہے جس نے اردو میں اسلوبیاتی تنقید کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اردو میں پہلی بار نہ صرف اس کی نظری بنیادیں فراہم کیں بلکہ اس کے تجزیاتی نمونے بھی پیش کیے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مرتب پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ بذات خود لسانیات کے ماہر ہیں۔ وہ شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر اور مسعود حسین خان صاحب کے شاگرد رشید بھی ہیں۔ لسانیات اور اسلوبیات کے حوالے سے خود ان کی اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اپنے استاد کو خراج تحسین پیش کرنے اور لسانیات و اسلوبیات کے تعلق سے اپنے حق خدمت کو ادا کرنے کی ہی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے۔ ان کی شاگردی کے طفیل میں لسانیات و اسلوبیات کے حوالے سے ان کا ذہن کتنا روشن اور واضح ہو چکا ہے، اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیانات سے لگائیے:

''اسلوبیات کا بنیادی تصور 'اسلوب' (Style) ہے جس کی تشکیل ادب میں زبان کے استعمال سے عمل میں آتی ہے۔ کوئی بھی ادبی فن پارہ یا متن زبان کو بروئے کار لائے بغیر تخلیقی مراحل طے نہیں کر سکتا۔ دوسری جانب زبان لسانیات کا مواد و موضوع بھی ہے، چنانچہ ادب اور لسانیات کے درمیان گہرے رشتے کا پایا جانا لازمی ہے۔ اسلوبیات ادب میں کام آنے والی زبان یا ادبی زبان اور اسلوب کا مطالعہ و تجزیہ مشاہداتی (Empirical) بنیادوں پر لسانیات کی مختلف سطحوں (صوتی، صرفی، نحوی، معنیاتی) پر کرتی ہے، اور اس کی مصطلحات سے کام لیتی ہے۔ یہ مطالعہ معروضی ہوتا ہے نہ کہ داخلی و تاثراتی۔ اس مطالعے میں ادبی فن پارے کو اچھا یا برا ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے 'اسلوبی خصائص' کو نشان زد کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ مکملاً متن آشنا (Text-oriented) ہوتا ہے جس میں ماورائے متن ہر چیز سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

''مسعود حسین خان زبان کو 'انسانی ذہن کا ایک عمومی کارنامہ' قرار دیتے ہیں اور ادبی اسلوب کو 'انسانی ذہن کا کمال' متصور کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان جو ایک عام سی چیز ہے جب کسی ادیب کے تصرف میں آتی ہے تو تخلیقی اظہار کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔ 'اسلوب' کی اصطلاح قدما نے بھی استعمال کی ہے اور روایتی ادبی تنقید میں بھی اس کا بار بار ذکر ملتا ہے، لیکن یہاں اسلوب کی تعریفیں واضح اور متعین شکل میں نہیں ملتیں۔ جبکہ لسانیاتی اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے اسلوب کی وہی تعریفیں درست سمجھی جاتی ہیں جو زبان کے حوالے سے بیان کی گئی ہوں، اسی لیے ماہرین لسانیات نے 'ادبی اسلوبیات' سے ممیز کرنے کے لیے 'لسانیاتی اسلوبیات' کی ترکیب وضع کی ہے۔ اس کتاب کا نام بھی مسعود حسین خان ہی کے ایک مضمون 'لسانیاتی اسلوبیات اور شعر' سے لیا گیا ہے۔

ذرا سوچیں کہ جب شاگرد کا ذہن لسانیاتی اسلوبیات کے سلسلے میں اس قدر صاف ہے تو استاد کی بات کیا ہوگی۔ انھوں نے بڑے سیدھے سادے انداز میں یہ واضح کر دیا ہے کہ ادب کے اسلوبیاتی مطالعے اور تجزیے کی بنیاد لسانیات پر قائم ہے، چنانچہ اسلوبیاتی تنقید بھی اسی نہج پر کام کرتی ہے اور اپنی مصطلحات اور حربے لسانیات سے لیتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید روایتی ادبی تنقید کی طرح داخلی و تاثراتی نہیں بلکہ اس کا بنیادی تصور اسلوب ہے۔ یہ مصنف کے احوال و کوائف سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ادبی تخلیق یا متن کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہے اور اس کے اسلوبی خصائص کو نشان زد کر کے نتائج کا استنباط کرتی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنے لسانیاتی مطالعے سے اردو میں ادبی تنقید کا ایک نیا دبستان کھولا۔ زیر تبصرہ کتاب میں مرزا خلیل احمد بیگ نے مسعود حسین خان کے مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً چھپے ہوئے چھوٹے بڑے کل تیرہ اسلوبیاتی مضامین جمع کر دیے ہیں۔ ان مضامین سے مسعود حسین خان کے اسلوبیاتی نظریۂ تنقید کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ان تمام مضامین کے دو زمرے بنتے ہیں۔ ایک زمرہ مسعود حسین خان کے نظری آراء کو پیش کرتا ہے اور دوسرا غالب، اقبال، فانی، خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتح پوری کے نظم و نثر کے تجزیاتی نمونے کے ذریعے ان کے عملی مباحث کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ مرتب کی اس حسن ترتیب نے کتاب کی اہمیت و افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے لسانیات کی مدد سے ہی غالب کے تنافر حروف اور اقبال کے (بوجہ پنجابی ڈائلکٹ) 'ق' کو 'ک' تصور کرنے کو مدلل ثابت کیا ہے۔

کتاب پروف اور ٹائپنگ کی خامیوں سے منزہ ہے اور طباعت و جلد بندی بھی عمدہ ہے۔ شروع میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنا ایک مقدمہ بھی شامل کیا ہے، جس میں مسعود حسین صاحب کے اسلوبیاتی نظریۂ تنقید سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور آخر میں 'ضمیمہ' کے تحت ان کی حیات و خدمات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسعود حسین صاحب کے اسلوبیاتی نظریۂ تنقید کو پوری طرح واضح کرنے والی یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ علم و ادب کے شائقین اس مجموعۂ مضامین کو ضرور پسند فرمائیں گے۔

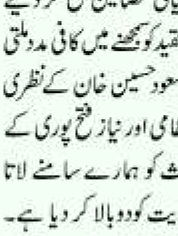

سنسکرت اور اردو کے لسانی و ادبی روابط و تہذیبی ہم آہنگی

مصنف: ڈاکٹر شیخ عبدالغنی
صفحات: 183، قیمت: 400 روپے، اشاعت: 2020
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
مبصر: سلمان فیصل، 3706A ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

زبانوں کے ایک دوسرے سے تعلقات بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کئی زبانیں ایک ہی زبان سے پیدا ہوئی ہیں۔ کئی زبانوں نے دوسری زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں۔ زبانیں اپنے ارتقائی سفر میں دوسری زبانوں سے گہرے تعلقات بھی بنا لی جاتی ہیں۔ اگر اردو کی بات کی جائے تو یہ ایسی زبان ہے جس نے مختلف النوع اثرات متعدد زبانوں سے قبول کیے ہیں۔ چونکہ اردو کا مولد و مسکن ایک ایسی جگہ ہے جہاں کی قدیم زبان سنسکرت ہے اس لیے اس کے اثرات سے اجتناب محال ہے۔ سنسکرت زبان کے کس قدر اثرات اردو زبان پر مرتب ہوئے ہیں اس تعلق سے زیر تبصرہ کتاب ''سنسکرت اور اردو کے لسانی و ادبی روابط و تہذیبی ہم آہنگی'' پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر شیخ عبدالغنی ہیں۔ جو کہ دکن سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو کے علاوہ سنسکرت، ہندی اور تیلگو زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں سنسکرت اور اردو کے باہمی رشتوں کی نشاندہی کی ہے۔

یہ کتاب اردو اور سنسکرت کے باہمی تعلقات اور اردو پر سنسکرت کے اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے 6 مختلف موضوعات کو محیط ہے۔ فاضل مصنف نے سب سے پہلے 'اردو زبان پر سنسکرت کے لسانی اثرات' پر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے لسانیات کی شاخوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مختلف لسانی مباحث کی وضاحت کی ہے۔ بائیہ آواز، تجسیم، تذبھو، فعل، الفاظ کی ساخت، تراکیب لفظی، اعداد اور جملوں کی ساخت کے حوالے سے مثالوں کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح اردو پر سنسکرت کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ لسانیات سے نابلد یا اس میدان کے مبتدیوں کے لیے اس باب میں بہت کچھ ہے البتہ کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت تھی۔ مصنف نے مختلف مثالوں کے ذریعے قدرے تفصیل سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا موضوع 'اردو شاعری میں ویدک تہذیب کے اثرات' سے متعلق ہے۔ اس کے تحت مصنف نے اردو شاعری کا جائزہ لیا ہے اور سنسکرت کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ویدک تہذیب کے بارے میں کس قدر اردو شاعری میں مواد موجود ہے اس پر بھی مثالوں کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً اقبال اور بھرتری ہری کا ذکر ہے۔ رامائن اور مہابھارت کو جس طرح اردو شعرا نے موضوع سخن بنایا ہے اس کا بیان ہے۔ مثنوی نیرنگ سحر اور مثنوی ستیہ وان ساوتری کا بھی بطور خاص ذکر ہے۔ ڈاکٹر شیخ عبدالغنی نے 'اردو نثر میں رامائن اور مہابھارت کے نقوش' کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے اور اس پر اختصار سے خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے اردو افسانوں اور ڈراموں میں رامائن اور مہابھارت کے دیو مالائی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے صرف چند ناولوں کے نام گنوائے گئے ہیں جن میں سنسکرت تہذیب کی بازگشت نظر آتی ہے مثلاً آگ کا دریا، آگے سمندر ہے، ٹیڑھی لکیر، شکست اور ایک چادر میلی سی وغیرہ۔

فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب میں سنسکرت علوم کے اردو تراجم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس میں پیش آنے والے مسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ اردو تراجم کا جائزہ لیتے ہوئے اپنشد، بھگوت گیتا، لیلاوتی اور ارتھ شاستر کے اردو تراجم کے بارے میں گفتگو کی ہے مزید یہ کہ اس میدان میں ترجمے کے ابھی کیا امکانات ہیں ان کو بھی بیان کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'ہتوپدیش کی حکایات کا اخلاقی پہلو' کے موضوع پر کچھ باتیں عرض کی ہیں۔ من جملہ پوری کتاب میں پہلا اور دوسرا حصہ قدرے مفصل ہے ورنہ بقیہ موضوعات میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس طرح یہ پوری کتاب ایک طرح سے ایک تعارفی کتاب ہے جس سے قاری سنسکرت اور اردو کے باہمی روابط سے متعارف ہو جاتا ہے البتہ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ قاری اس موضوع پر مزید مطالعے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ حلقہ اہل علم میں یہ کتاب قبولیت حاصل کرے گی۔

رمز عظیم آبادی

مصنف: نسیم احمد نسیم

صفحات: 128، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

مبصر: ابوالخیر نشتر، بتیا، مغربی چمپارن، بہار

رمز عظیم آبادی کا اردو کے معروف نظم گو شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے ذریعے رمز کی حیات اور ان کی خدمات پر حتی المقدور روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے رمز کی حیات کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے عہد طفلی سے لے کر اخیر عمر تک کے تقریباً تمام اہم واقعات کا ذکر کیا ہے۔ رمز چونکہ بنیادی طور پر نظموں کے شاعر تھے، اس لیے ان کی نظمیہ شاعری کا بھرپور اور مفصل احاطہ کیا گیا ہے۔ رمز ایک غریب اور مفلوک الحال شاعر تھے۔ گھر کے حالات بہت دگرگوں تھے اس لیے وہ اسکول اور کالج کا منہ نہ دیکھ سکے۔ لیکن انھیں اردو زبان و ادب سے حد درجہ محبت تھی اس لیے انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے سے اپنے علم کو مستحکم کیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ایوان ادب میں بڑے بڑے سند یافتہ شعرا کے درمیان عزت و تکریم سے دیکھے جانے لگے۔ رمز عظیم آبادی مرحوم کے اب تک دو شعری مجموعے 'نغمہ سنگ' اور 'شاخ زیتون' کے نام سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایک کتاب 'وہ سنگ میل جو لپٹا ہوا غبار میں تھا' ان کے فن اور شخصیت پر شائع ہو چکی ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر معروف ناقد اور محقق ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی یہ کتاب بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ بہار نے فردنامہ سیریز کے تحت بہار کی اہم شخصیات پر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے، اسی کی ایک کڑی 'رمز عظیم آبادی' بھی ہے۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اس کتاب میں رمز کے سوانحی کوائف، حالات زندگی، شاعری کا آغاز، نظمیں، غزلیں، قطعات و رباعیات نگاری اور تلامذہ رمز عظیم آبادی پر مفصل گفتگو کی ہے۔ حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ''ابتدا سے اخیر تک ان کی زندگی جدوجہد، احتجاج اور تضادات میں گزری، وہ اپنی سوچ اور مزاج کے خلاف رتی بھر کوئی بات برداشت کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ اردو ادب کے مفلوک الحال لیکن سچے عاشق تھے۔'' ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''معاشی تنگی کے سبب انھیں محنت و مزدوری بھی کرنا پڑی، کچھ دنوں تک رکشہ بھی کھینچنا پڑا۔''

رمز عظیم آبادی کی شاعری کے آغاز کے تعلق سے اس کتاب میں بڑی اہم بات لکھی گئی ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز رمضانی کلام سے ہوا۔ رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت روزے داروں کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے جو قافلہ نکلتا تھا اس کے شرکا رمز عظیم آبادی کا کلام پڑھا کرتے تھے اور اس قافلے کی سربراہی رمز صاحب فرماتے تھے۔

رمز عظیم آبادی نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیہ شاعری بھی کی ہے، انھوں نے جن موضوعات کو اپنی نظمیہ شاعری میں برتا ہے ان میں ظلم و جبر، طبقاتی کشمکش، فرقہ وارانہ کشیدگی، عصبیت و منافرت اہم ہیں۔

رمز گو کہ نظم کے شاعر تھے لیکن انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ان کی غزلیہ موضوعات میں خاصا تنوع بھی ہے۔ انہی کا ایک خوبصورت شعر ہے۔

رمز شکستہ آئینے کا ٹکڑا اک چہرہ ہے
شیش محل کو توڑ کے دیکھو سیکڑوں گھر بن جائیں گے

اعجاز علی ارشد نے ان کی غزل گوئی کے حوالے سے بڑی قیمتی بات لکھی ہے کہ:

''رمز کی بعض غزلوں میں عصر حاضر کی پیچیدہ زندگی اور انسانی نفسیات کے بدلتے ہوئے تیوروں کا بھی منظر ملتا ہے مگر یہ منظر سپاٹ یا مبہم بیانات پر مبنی نہیں ہے بلکہ رمز نے غزل گوئی کے فن پر اپنی بہترین گرفت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ذاتی تجربوں کے پیکر میں عصری صداقتوں کو پیش کیا ہے۔''

رمز عظیم آبادی نے قطعات و رباعیات بھی لکھے ہیں۔ 'شاخ زیتون' میں ان کے قطعات و رباعیات شامل ہیں اور ان دونوں میں انھوں نے اپنے کمال ہنر کا بھی ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر نسیم نے اس مونوگراف میں معروضی اور تحقیقی انداز اپناتے ہوئے رمز فہمی کی ایک نئی جہت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے یہ کتاب ادب کے سنجیدہ حلقوں میں توجہ کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ اور رمز کے ساتھ اب تک برتی گئی بے توجہی کا کچھ نہ کچھ ازالہ ضرور ہوگا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ مبارک باد کی مستحق ہے کہ بہار کی شخصیات پر فردنامہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ شاد عظیم آبادی،

کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، پرویز شاہدی اور شین مظفرپوری جیسی شخصیات پر فردنامے شائع کیے جاچکے ہیں۔ امتیاز احمد کریمی نے اپنے 'پیش لفظ' میں فردنامہ کے تعلق سے اس کے مقصد کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعروادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدرداں ہے نیز ان کے ادبی اور شعری سرمائے کو زندہ و تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسلوں تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت و خدمت سے انھیں روشناس کرانا، ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدرومنزلت پیدا کرنا ہمارا نصب العین ہے۔''

اس کتاب میں ڈاکٹر اسلم جاوداں نے بھی رمز عظیم آبادی کا ایک معروضی تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب کی عمدہ اور دیدہ زیب طباعت دادطلب ہے۔ نیز اس کی قیمت بھی اتنی ہے کہ بآسانی ہرقاری اسے حاصل کرسکتا ہے۔

شخصیات و سوانح

مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں

مصنف: محمد عبدالملک جامعی، مرتب: معصوم مرادآبادی
صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: دسمبر 2020
ناشر: خبردار پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: نایاب حسن، ہلہ ہاؤس، نئی دہلی

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت و سیاست اور زندگی کی دیگر سرگرمیوں کی تفصیلات پر مشتمل کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور اب بھی لوگ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں، مگر اس حوالے سے مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام اور کام خاص اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ مولانا دریابادی کو محمد علی جوہر سے بے پناہ عقیدت تھی، بہت سی سرگرمیوں میں ان کے رفیق رہے اور ان سے استفادے کا سلسلہ بھی رہا، سو مولانا کی وفات کے بعد 'محمد علی جوہر: ذاتی ڈائری کے چند ورق' کے نام سے انھوں نے جو سوانح لکھی ہے، وہ بہت ہی شاندار، جامع اور مولانا کی زندگی کی تمام جہات کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ ساٹھ سے زائد چھوٹے بڑے ابواب کے تحت انھوں نے شروع سے وفات تک محمد علی جوہر کی زندگی اور اعمال و تحریکات کا اپنے انوکھے اور دلچسپ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ یہ دراصل مختلف موقعوں پر لکھے گئے مولانا کے مضامین کا مجموعہ ہے، جنھیں معقول ترتیب و تسلسل کے ساتھ یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ پہلی بار دارالمصنفین اعظم گڑھ سے 1956 میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، بعد میں لکھنؤ صدق فاؤنڈیشن سے کمپوز کرواکے شائع کی گئی، جس کے صفحات پونے سات سو ہیں۔

اِس وقت میرے پیشِ نظر ایک ایسی ہی کتاب ہے، جس کے مصنف محمد عبدالملک جامعی ہیں، کتاب کا نام ''مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں'' ہیں اور جامعی صاحب کا تعلق بھی محمد علی جوہر سے نیازمندانہ، عقیدت مندانہ اور مخلصانہ رہا ہے۔ عبدالملک جامعی کا وطنی تعلق مرادآباد سے تھا، ان کے والد منشی عبدالقیوم صاحب ایک نفیس رقم خطاط تھے اور اس وقت کے اجلِ علما و دانشوران اور سیاسی رہنماؤں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ مولانا آزاد کی معرکۃ الآرا ترجمہ و تفسیر قرآن 'ترجمان القرآن' کی کتابت انھوں نے ہی کی تھی۔ مشہور زمانہ اخبار 'مدینہ' بجنور کی کتابت بھی ایک عرصے تک انھوں نے کی تھی۔ عبدالملک صاحب 1942 میں جامعہ سے گریجویٹ ہوئے۔ درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور آزادی سے کچھ پہلے ہی مدینہ منورہ ہجرت کرگئے، جہاں طویل عرصے تک علمی و دینی خدمات انجام دے کر 1991 میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

گوکہ جامعی صاحب کے مولانا محمد علی جوہر سے باضابطہ تعلق کی عمر بہت زیادہ نہیں رہی، جانتے تو بہت پہلے سے تھے، ان کی کئی تقریریں بھی سن رکھی تھیں، مگر جب 1929 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوئے تو جنوری یا فروری 1930 میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ذریعے ان سے براہ راست شناسائی ہوئی اور جنوری 1931 میں مولانا کا انتقال ہوگیا، گویا عبدالملک جامعی اور مولانا محمد علی جوہر کے راست تعلق کا عرصہ محض سال بھر کو محیط ہے، مگر اس قلیل عرصے میں ہی وہ ان کے اتنے قریب ہوگئے تھے کہ ان کے فردِ خانہ کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ مولانا کو ان سے خاص اُنس ہوگیا تھا اور اپنے بہت سے ذاتی کاموں میں بھی انھیں شریک رکھتے اور اس طرح عبدالملک صاحب کو مولانا کی سیاسی، قومی و صحافتی سرگرمیوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا۔ مولانا کی وفات کے بعد انھوں نے بھی اپنے مشاہدات و ملاحظات کی روشنی میں ان کی شخصیت و حیات کے مختلف گوشوں پر کئی مضامین لکھے، جو زیادہ تر غیرمطبوعہ تھے اور مدینہ منورہ میں ان کے اہلِ خانہ کے پاس محفوظ تھے۔ اللہ جزائے خیر دے اردو کے سینئر صحافی جناب معصوم مرادآبادی کو کہ انھوں نے یہ قیمتی علمی، ادبی و تاریخی ورثہ منظرِ عام پر لاکر مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے تعلق سے ان کے ایک عقیدت کیش کے خیالات، افکار و مشاہدات کو زندگی بخش دی ہے۔ عبدالملک جامعی صاحب معصوم مرادآبادی کے حقیقی ماموں تھے اور اس نسبت سے ان پر جامعی صاحب کا یہ حق بھی تھا، جسے انھوں نے ان کی وفات کے تیس سال بعد ہی سہی، مگر بڑی خوبی و ہنرمندی سے ادا کیا ہے۔

یہ کتاب کیا ہے، مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کا ایک خوب صورت مرقع، ایک دلکش جائزہ، حسین و جمیل یادوں کا سلسلہ۔ زبان اتنی ستھری اور نکھری ہوئی ہے کہ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں کرتا اور پوری کتاب پڑھ کر ہی طبیعت کو سیری ہوتی ہے۔ اس کی نثر میں ایسی شیرینی اور جاذبیت ہے کہ قاری پر محویت طاری ہوجاتی ہے۔ جامعی صاحب نے اپنے مضامین میں مولانا محمد علی جوہر کی زندگی، ان کے اہل خانہ و اولاد اور دیگر ذاتی احوال کے ساتھ تحریک خلافت اور ان کی سیاسی معرکہ آرائیوں پر نہایت دلچسپ، معلومات افزا تبصرے کیے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا رنگ کیا ہوتا تھا، ان کے رفقا و معاصرین انھیں کس نظر سے دیکھتے تھے اور خود ان کا رویہ ان کے ساتھ کیسا تھا، جامعہ سے ان کے تعلق کی نوعیت کیا تھی اور اہلِ جامعہ ان سے کیسی عقیدت رکھتے تھے، ان سارے امور پر نہایت عمدہ مضامین اس کتاب میں پڑھنے کو ملتے ہیں اور بہت سی فرسٹ ہینڈ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک بہت معلوماتی مضمون مولانا کے اخبار 'ہمدرد' کی قدیم فائلوں کے تعلق سے ہے کہ کتنے شمارے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ اخیر میں چوتھی گول میز کانفرنس میں مولانا کی تاریخی تقریر کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ مصنفِ کتاب کے نام محمد علی جوہر کے متعلقین جن میں ان کی اہلیہ، سعید انصاری، میرن صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا عبدالماجد دریابادی شامل ہیں، ان کے خطوط بھی جمع کردیے گئے ہیں۔ ایک خط جامعی صاحب کا معصوم مرادآبادی کے نام بھی ہے اور سب سے آخر میں مولانا محمد علی جوہر پر معصوم مرادآبادی کا مضمون بھی کتاب کا حصہ ہے۔ کتاب کی طباعت نہایت شاندار اور دیدہ زیب ہوئی ہے۔ خبردار پبلی کیشنز دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔ 208 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت تین سو روپے ہے۔ ہندوستان کی تحریک و تاریخ آزادی اور اس تحریک کے رہنماؤں بالخصوص مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے دلچسپی رکھنے والے تو اس کتاب کا مطالعہ کریں گے ہی، مگر مطلق مطالعہ و کتب بینی کا ذوق رکھنے والوں کو بھی یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

سفر جاری ہے

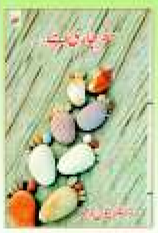

مرتب: ڈاکٹر کیول دھیر

صفحات: 263، قیمت: 300 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: سید اختیار جعفری، مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی

خیرادی ٹولہ، تاج گنج، آگرہ، یوپی

ڈاکٹر کیول دھیر ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حالانکہ وہ پنجاب صوبہ کے شعبۂ صحت سے 1966 میں جوائنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے لیکن یہ ان کا قابل ذکر تعارف نہیں ہے۔ ان کا تعارف یہ بھی نہیں ہے کہ وہ 1938 میں آزادی سے 11 برس پہلے موجودہ پاکستان کے ضلع منٹ گمری کے قصبہ گگو میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعارف یہ بھی نہیں ہے کہ وہ تقسیم ملک کے وقت لدھیانہ (پنجاب) میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ ان کا تعارف یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی وغیرہ زبانوں کے مستند ادیب و صحافی ہیں۔ کیول دھیر کا اصلی تعارف یہ ہے کہ وہ انسان اور انسانیت کے مدح خواں اور مرثیہ خواں اور قصہ خواں ہیں۔ ان کی یہ قصہ خوانی 100 کتابیں شائع کردینے کے باوجود جاری ہے۔

'سفر جاری ہے...' میں ڈاکٹر کیول دھیر نے ان خاکوں، مقالوں اور مکالموں (انٹرویوز) کو جمع کیا ہے جو بیشتر سرحد کے اس پار کے صحافیوں، ادیبوں، ناقدوں اور شاعروں وغیرہ نے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نویس، مترجم، صحافی، انشائیہ نگار، رپورتاژ نگار ہیں۔ ان کی پہلی اردو کہانی بیسویں صدی میں 1960 میں شائع ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے ان کا ادبی سفر تقریباً 60 برسوں کو محیط ہے۔ ان ساٹھ برسوں میں ہندوستان، پاکستان، انگلینڈ، فرانس، امریکہ اور کنیڈا سمیت بہت سے دیگر ممالک میں مقیم اردو کے شعرا، ادبا، نقادوں اور صحافیوں سے ان کے گہرے روابط قائم ہوئے۔ یہ روابط پروفیشنل سے زیادہ محبت کی بنیادوں پر استوار ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت اسی کو ملتی ہے جو محبت بانٹتا ہے۔ کیول دھیر نے اتنی محبت بانٹی کہ دور دراز سے محبت کے تمام دریاؤں کا رخ ان کی طرف ہوجانا فطری معلوم ہوگیا۔

زیرنظر کتاب میں خوشتر گرامی، ظفر احمد نظامی، ڈاکٹر ابدال بیلا، پروفیسر آزاد گلاٹی، بشریٰ رحمٰن، پرکاش پنڈت، راجہ مہدی علی خاں، عطاء الحق قاسمی، رضاء الجبار، عاشور کاظمی نے کیول دھیر کے خاکے لکھے ہیں جب کہ خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، مانک ٹالا، منشا یاد اور پروفیسر شبنم رومانی نے تفصیلی مقالات میں کیول دھیر کی شخصیت اور فکر و فن پر اظہار خیال کیا ہے۔ تیسرے حصے میں 'مکالمے' کے عنوان سے وہ انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں جو رسالہ 'چہارسو' راولپنڈی پاکستان کے مدیر گلزار جاوید، ماہنامہ شاعر ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی، اردو دنیا نئی دہلی کے سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر عبدالحی، آئینہ ادبی مکالمے بہار کے مدیر نثار احمد صدیقی، مکالمہ حیدرآباد کے مدیر ڈاکٹر شاہد حنیف، روزنامہ اوصاف لاہور حیدرآباد کے مدیر سرفراز سعید اور روزنامہ جنگ لاہور پاکستان کے مدیر رؤف ظفر نے مختلف اوقات میں لیے تھے۔ ان مضامین و انٹرویوز میں جہاں ہندو پاک کی ادبی روایات، معتقدات، نظریات اور ادبی سرگرمیوں پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے، وہیں کیول دھیر کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور ان کے فکر و نظر سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

بقول کیول دھیر یہ کتاب ان کی ذاتی اور ادبی زندگی کے سفر کی آدھی ادھوری کہانی ہے۔ حالانکہ کیول دھیر نے ان قلم کاروں کی زبانی من کی بات کہنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن ان مضامین سے من کی بات کم دنیا کی باتیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے طویل تعارفی اور پہلے مضمون 'من کی بات' میں کیول دھیر نے اپنے پاکستانی اسفار اور وہاں اپنے مداحوں اور ملاقاتیوں کا جس محبت بھرے انداز میں تعارف کرایا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ سرحد پاران کا جس گرم جوشی سے استقبال ہوا اور وہاں کے صف اوّل کے ادبا و شعرا اور صحافیوں نے جس والہانہ انداز میں ان کے اعزاز میں جلسے منعقد کیے اس سے ان کے خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ کیول دھیر کے ہر جملے سے ان کی بے پناہ محبت پھوٹی پڑتی ہے۔

دشتِ ادب کی سیاحی میں کیول دھیر صاحب نے 60 برس گزار دیے۔ اس درمیان ہر صنفِ ادب میں قابلِ قدر کتابوں، مقالات و مضامین کے ذریعے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اسی لیے وہ بیانیہ، افسانوی، صحافیانہ، خطیبانہ اور پیچیدہ ہر قسم کا لہجہ اختیار کرنے اور اپنے قاری یا سامع کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انڈو پاک کی ادبی سرگرمیوں، محبت کے رشتوں، ثقافتی و تہذیبی تعلقات اور کیول دھیر کے عاشقوں کے لیے یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہے۔

کتاب میں ڈاکٹر کیول دھیر کی ایک اور کتاب 'خوشبو کا سفر' کا تنقیدی جائزہ اور تعارف نامہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور ان کے فکر و فن سے واقفیت کے لیے یہ اچھی کتاب ہے۔

راکھ میں چنگاری

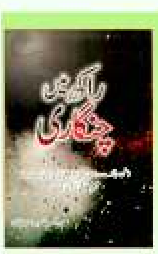

مصنف: پروفیسر طاہرہ وحید عباسی

صفحات: 212، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: عتیق النساخان، صدر شعبۂ اردو

سروجنی نائیڈو گورنمنٹ گرلس کالج، شیواجی نگر، بھوپال

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی فارسی کی استاد ہیں مگر اردو زبان و ادب سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ اردو کے جلسوں اور سیمناروں میں بڑے شوق سے شرکت کرتی ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں کے علاوہ عروس البلاد ممبئی میں بھی وہ مسلسل آتی جاتی رہتی ہیں۔ ممبئی کے ادبی منظرنامے سے ان کی دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے انھوں نے بجا طور پر یہ سوچنا شروع کیا کہ جس شہر میں اردو شاعروں، ادیبوں کی پوری کہکشاں آباد ہے وہاں کے حوالے سے کچھ تحریر کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے 'ممبئی اور ممبئی کے اردو مراکز' کے عنوان سے یہاں اردو کی صورت حال اور مراکز پر روشنی ڈالی ہے اور اسی دلچسپی کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب شمیم طارق جیسی متنوع شخصیت پر پڑی جو تخلیقی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے نمایاں ہیں جو صحافی بھی ہیں، کالم نگار بھی، ناقد بھی ہیں محقق بھی اور شاعری سے بھی خاص رشتہ ہے۔ انھوں نے شمیم طارق کی اسی ہمہ جہت شخصیت کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنی تحریر کا محور و مرکز بنایا اور 'راکھ میں چنگاری' کے عنوان سے علمی مراکز سے دور تنقید و تحقیق اور تخلیق کی شمع روشن کرنے والے شمیم طارق کی فکری جہات پر روشنی ڈالنے کے لیے کتاب مرتب کی۔ اس کتاب میں انھوں نے 'یہ تصنیف کیوں' کے عنوان سے بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ممبئی اور ممبئی کے ادبی مرکز، شگوفے اور سازشیں، ایک خاموش طبع ادیب و شاعر کی تخلیقی جہات، شمیم طارق بحیثیت شاعر، شمیم طارق بحیثیت محقق، شمیم طارق بحیثیت نقاد، شمیم طارق بحیثیت زبان داں، شمیم طارق بحیثیت کالم نگار، شمیم طارق بحیثیت منتظم یعنی انجمن اسلام کریمی لائبریری کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے، شمیم طارق اور مطالعہ تصوف، شمیم طارق اور تقابلی مطالعہ جیسے عنوانات کے تحت مفصل گفتگو کی ہے۔

'شمیم طارق: تقابلی مطالعہ' کے عنوان سے وہ لکھتی ہیں کہ ''وسیع مطالعہ اور تجزیاتی ذہن کے بغیر تنقیدی مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور نہ تقابلی مطالعہ۔ اردو میں علامہ شبلی نعمانی کی 'موازنہ انیس و دبیر' تقابلی مطالعے کی بہت اہم مثال ہے۔ بعد میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی 'حافظ اور اقبال' نے بھی اس روایت کو استحکام عطا کیا۔ کچھ دوسری کتابوں کے نام

بھی لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ اردو میں تقابلی اور تنقیدی مطالعے کی راہ روشن رہی ہے، بہت مشکل ہے۔ شمیم طارق کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تقابلی اور تنقیدی مطالعے میں اپنی راہ خود بنائی ہے اور پھر اس پر پوری سنجیدگی گامزن بھی رہے ہیں۔''

اس تعلق سے انھوں نے شمیم طارق کے مضامین 'شبلی اور اقبال کا مشترکہ عطیہ' اور ان کی تصنیف 'تصوف اور بھکتی' تنقیدی اور تقابلی مطالعے کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے۔

ضمیمہ کے عنوان سے کاروان ادب بھوپال، اور ارتقا کا شمیم طارق نمبر اور مختلف دستاویزات شامل کی گئی ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے کچھ اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس سے کتاب کی دستاویزی حقیقت اور معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ شمیم طارق نے یونیورسٹی کے اردو شعبہ سے دور رہ کر اتنا علمی کام کیا ہے اور ان کی شخصیت میں اتنے علمی و ادبی اوصاف جمع ہیں۔ طاہرہ وحید عباسی صاحبہ کا انداز بیان بہت سادہ مگر دلکش ہے۔ ان کی تلاش و جستجو کا اعتراف تو پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

کتاب کا مقدمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈین، فیکلٹی آف آرٹس اور سابق صدر شعبہ عربی پروفیسر مسعود انور علوی نے لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''زیر نظر کتاب 'راکھ میں چنگاری' کا شاید اس سے بہتر کوئی اور نام نہ ہوتا اس نام سے شمیم طارق صاحب کے علمی و ادبی، تنقیدی و تحقیقی فتوحات کے بیان کے ساتھ ہی وہ حالات اور ادبی منظر نامے بھی سامنے آجاتے ہیں جن میں رہ کر انھوں نے اپنے وجود اور برصغیر میں اپنی شناخت کو مستحکم کیا ہے۔'' (ص 15)

بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کی تحریر کتاب کی پشت پر دی گئی ہے۔ انھوں نے طاہرہ عباسی کی زبان و بیان کی شگفتگی پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''پروفیسر طاہرہ عباسی کی تحریر میں بڑی شگفتگی، روانی اور وفور ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ محض زبان و بیان پر ہی قدرت نہیں رکھتیں بلکہ موضوع کے ساتھ انصاف کے ہنر سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔''

کتاب ہر اعتبار سے اہم ہے جس کو پڑھنے سے پروفیسر طاہرہ وحید عباسی کی تلاش و جستجو کے نقوش بھی اجاگر ہوتے ہیں اور شمیم طارق کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی۔

سائنس

پلانٹ اناٹومی اور ایمبریولوجی

مصنف: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

صفحات: 152، قیمت: 96 روپے

ناشر: رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مبصر: پروفیسر جمال نصرت، 509 / 148، پرانا حیدرآباد، لکھنؤ

'پلانٹ اناٹومی' یعنی نباتیاتی علم کی وہ اہم شاخ جس میں پودوں کے مختلف اندرونی اعضا کو سمجھا جاتا ہے اور ایمبریولوجی وہ شاخ ہے جس میں درخت یا پودے سے دوسرے کی تخلیق اور تعمیر میں آنے والے طرح طرح کے مراحل سے بحث کی جاتی ہے۔

'پلانٹ اناٹومی اور ایمبریولوجی' کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دونوں علوم کو دو۔ دو ابواب میں بانٹا گیا ہے۔ پہلے باب میں پودوں کی ساخت' اس کے تمام حصوں، جڑ، تنا، پھول، پتی، شاخوں، کونپلوں کو 32 پلیٹوں اور نقشوں کی مدد سے آسان بنا کر سمجھایا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے باب میں پودوں کی ثانوی صورت کا بیان ہے۔ اس میں بھی 22 تصاویر اور اشکال ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ یہ کس طرح بڑھتے ہیں، اس کے نئے اور دوسرے جڑ کس طرح نمودار ہوتے ہیں۔ تنے کو ہی اگر دیکھا جائے تو ان کی قلمیں کیسی ہیں' درخت کی عمر اور ساخت کن باتوں پر منحصر ہے۔ لکڑی کی اجمالی ساخت کے بارے میں مصنف پیراگراف 2.4 میں بہت ہی جاذب انداز اور کم الفاظ میں بتاتے ہیں:

''انسان جنگلوں سے شہتیر کی شکل میں لکڑی حاصل کرتا ہے جو فلاح و بہبود کے لیے بہت قیمتی خام مال ہوتا ہے۔ جس کی تجارتی نقطہ نظر سے بہت اہمیت ہے... ابھی بھی لکڑی کا نعم البدل نہیں ہے۔ لکڑی نسبتاً سستی، وزن میں ہلکی ہوتی ہے جس کو آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ مختلف اوزار بنائے جاسکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ مضبوط، لچکدار، حرارت، برق کی کمزور موصل ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے صنعتی پیمانے پر اس کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی لکڑی سے بہت سارے دیگر فائدہ مند محاصلات بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔'' جب لکڑی کی میکانیکی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں تو تکنیکی الفاظ کا ترجمہ کرنے کی جگہ پر انگریزی کی ان عام فہم اصطلاحات کو اسی طرح اردو میں لکھ کر انگریزی میں بھی لکھ دیتے ہیں جس سے ان کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ایمبریولوجی کو لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں 13 اور چوتھے باب میں 33 پلیٹس ہیں اور بھی دوسرے پودے کے بننے کے مراحل کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں رکھا گیا ہے۔ چوتھے باب کے چھٹے حصے میں مصنف یوں لکھتے ہیں:

کچھ حالتوں میں ایمبریو Embryo کی تشکیل نیوکلیس کے نیوسیلس سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی عام مثال لیموں، آم، جامن وغیرہ ہیں۔ اسے انہوں نے شکل نمبر 4.19 سے سمجھایا ہے۔

کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ اور اس میں مشکل انگریزی الفاظ کے ہجے بھی درج ہیں جیسے پولی نیشن Pollination (پو+لی+ نے+شن) یا ایمبریو جی ناسس Embryogenesis (ایم+ بر+ یو+ جی+ نا+سس) اس طرح قاری بہ آسانی بول اور سمجھ سکتا ہے۔ کتاب 6X8 یعنی بڑے سائز میں 152 صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت صرف 96 روپے ہے۔

ملک کے دیگر زبان کے بولنے والوں کے لیے بھی یہ ایک اہم کام ہوگیا ہے۔ اب اس کا آسانی سے ترجمہ ممکن ہے جیسے اس کو تیلگو، تامل، مراٹھی، بنگلہ اور دیگر زبانوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر اردو میں سائنسی کتابوں اور مضامین کے لکھنے والوں میں اہم نام ہے۔ ان کو مہاراشٹر' یوپی' بنگال اردو اکادمی سے انعامات اور توصیفی سندیں بھی مل چکی ہیں اور وہ 250 سے زائد تحقیقی مضامین لکھ چکے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اردو میں اعلیٰ سائنس پیش کرنے کا جو دروازہ کتاب 'پلانٹ اناٹومی اور ایمبریولوجی' اور چند دیگر سائنسی کتابوں سے کھلا ہے وہ اور تیزی سے دیگر سائنسی کتابوں کے لیے نشان راہ ثابت ہوگا۔

فکشن

گمشدہ دولت

مصنف: طارق شبنم

صفحات: 176، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: جی این کے پبلی کیشنز، کشمیر

مبصر: عرفان رشید، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف کشمیر

طارق شبنم کشمیر میں معاصر اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک متعارف نام ہے۔ اصل نام طارق احمد شیخ ہے لیکن ادبی حلقوں میں طارق شبنم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز 2010 میں افسانہ 'مجبوری' سے کیا جسے 'ہند سماچار' جموں نے شائع کیا تھا۔ اب تک ان کے متعدد افسانے رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ ’گمشدہ دولت‘ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعہ کو جی این کے پبلی کیشنز (بڈگام، کشمیر) نے 2020 میں شائع کیا ہے۔ یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں 27 افسانے شامل ہیں جن میں بے درد زمانہ، اندھیرے اجالے، صدمہ، کہانی کا المیہ، دہشت کے سائے، اعتبار، گمشدہ دولت، مسیحا کی تلاش، نسخہ کیمیا، سنہرا پھندا وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانہ ’بے درد زمانہ‘ اس مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک مچھیرن ’سندری‘ کی زندگی پر مبنی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کہانی کے ذریعے ایک طرف سماج پر طنز کیا ہے کہ کس طرح سے ایک بے رحم سماج میں ایک مجبور، لاچار اور بے بس عورت کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس افسانے میں یہاں کے گورنمنٹ اسپتالوں کا حقیقی نقشہ بھی کھینچا گیا ہے جس میں ’سندری‘ جیسی سیکڑوں عورتیں استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔

کشمیر کی ثقافت پر لکھا ہوا افسانہ ’آبرو‘ ہے۔ جس میں ایک مفلوک الحال گھرانے کو موضوع بحث بنا گیا ہے۔ اس افسانے میں ایک طرف قالین بننے کے کام کو دکھایا گیا ہے تو دوسری طرف اس وقت کے سماج کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں پڑھائی کے بجائے چھوٹے بچوں کو قالین بننے کے کام پر لگایا جاتا تھا۔

طارق شبنم کے یہاں موضوعاتی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہاں کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی حالات کو افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے بلکہ انھوں نے ایسے افسانے بھی خلق کیے ہیں جو بین الاقوامی وسعت رکھتے ہیں۔ ایسا ہی ایک افسانہ ’اعتبار‘ ہے۔ حالانکہ افسانہ بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ لیکن موضوعاتی اعتبار سے یہ ایک اچھوتا افسانہ ہے۔

’گمشدہ دولت‘ ایک انوکھے موضوع پر لکھا ہوا افسانہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے جنرل ٹام کا ذکر کیا ہے جو مریخ سے اتر کر دنیا کا معاینہ کرنے آیا تھا۔ پہلے اسے انسان کی خوشحالی، سکون، آرام، دولت، خوبصورتی پر رشک آتا ہے لیکن جوں ہی وہ اس دنیا کا دوسرا رخ دیکھتا ہے جو جدید سائنسی ٹکنالوجی کا دور کہلاتا ہے جس میں ہتھیاروں اور ایٹم بموں کی وجہ سے ناحق انسانیت کا خون کیا جاتا ہے تو اس سے بے دل ہو کر اسے واپس مریخ پر جانا پڑتا ہے۔

یہ افسانہ موضوع کے لحاظ سے بہترین افسانہ ہے۔ جس میں عصر حاضر کے انسان کی نفسیاتی پیچیدگی کو عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

’سنہرا پھندا‘ بھی ایک اچھوتے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس میں انٹرنیٹ کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے راحیلہ کے ذریعے ہمارے سماج کی ان لڑکیوں پر سوال کیا ہے جو اس آفت کے ذریعے اپنے گھر کو جہنم بنا دیتی ہیں۔ موصوف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انٹرنیٹ ایک ایسا زہر ہے جس نے Youth کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ اور ایسی کئی ’راحیلہ‘ ہوں گی جو بظاہر نیک اور پرہیزگار ہوتی ہیں لیکن اس زہر کے آگے ہر انسان بے یار و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے تخلیق کار اپنے قارئین کو اس لعنت سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

’کیمیا گھر‘ اس مجموعے کی آخری کہانی ہے جس میں موجودہ COVID 19 اور لاک ڈاؤن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قرأت کے دوران یہ افسانہ افسانے سے کہیں زیادہ ڈراما معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں افسانہ نگار نے افسانہ پن کو برقرار رکھنے کے لیے ڈرامائی اسلوب اور مکالموں سے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

طارق شبنم کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ اس مجموعے میں موضوعاتی تنوع ہے۔ اسلوبی اور تکنیکی طور پر زیادہ باریک بینی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

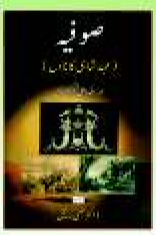

صوفیہ (عہد شاہی کا ناول)

ناول نگار: مرزا فدا علی خنجر لکھنوی، مرتب: ڈاکٹر سلمیٰ رفیق

صفحات: 152، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: احسن بکس، نئی دہلی

مبصر: سمیہ محمدی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو میں ناول کی تاریخ کوئی ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔ اس دوران کئی اہم ناول منظر عام پر آئے جس نے قارئین کے بڑے حلقے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ان ناولوں میں سے چند معمولی نوعیت کے ہیں تو چند ناول ایسے ہیں جو بلا مبالغہ دوسری زبانوں میں لکھے گئے ناولوں کے نہ صرف ہم پلہ ہیں بلکہ عالمی ادب کے سامنے سینہ تانے کھڑے ہیں۔ ممکن ہے میری اس بات سے کچھ لوگوں کو اعتراض بھی ہو، مگر ناول کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے ایسا کہنا غلط نہیں ہوگا۔ جب ہم ناول کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ چند ناول ایسے بھی ہیں جن پر کم گفتگو ہوئی یا بالکل ہی اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ اسی سلسلے میں مرزا فدا علی خنجر کا ناول ”صوفیہ: عہد شاہی کا ناول“ بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس ناول کو یکسر نظر انداز کیا گیا، ’صوفیہ: عہد شاہی کا ناول‘ ہے۔ اس ناول کی پہلی اشاعت بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی معاصرین میں سے چند نے اس ناول پر اپنی رائے ضرور دی ہے، مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس ناول کا ذکر بہت کم آتا ہے، جب کہ اسے تاریخی ناول کے زمرے میں رکھ کر اس کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت تھی۔

زیر نظر ناول ’صوفیہ: عہد شاہی کا ناول‘‘ کو ڈاکٹر سلمیٰ رفیق نے مرتب کیا ہے۔ ناول ’صوفیہ‘ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کی تصنیف ہے۔ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کی شناخت بیسویں صدی کے زود نویس قلمکاروں میں ہوتی ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اپنے زمانے کا ایک بڑا مصنف جس سے منسوب پانچ درجن سے زائد کتابیں ہیں اسے وہ شہرت نہیں ملی جس کے حقدار وہ تھے۔ ڈاکٹر سلمیٰ رفیق نے نہ صرف یہ کہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے بلکہ ادبی حلقے میں ان کی بازیافت کی بھی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سلمیٰ رفیق کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کی پیدائش 1890 میں ہوئی۔ کم عمری میں ہی شعر گوئی کی جانب متوجہ ہوئے، اور پھر شاعری کے ساتھ نثر بلکہ فکشن کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ جہاں تک مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کے ناول ’صوفیہ‘ کا تعلق ہے تو یہ 15 ابواب اور 109 صفحات پر مشتمل ایک مختصر ناول ہے۔ اس ناول کی اشاعت کب ہوئی اس سلسلے میں مرتب نے خاموشی اختیار کی ہے، مگر ایک اندازے کے مطابق یہ ناول 1910 کے آس پاس لکھی گئی ہوگی۔ ناول کے سرورق پر ”عہد شاہی کا سبق آموز و نصیحت خیز، امیر خاندانوں کا پُراسرار راز، ایثار و نفس و اخلاق حمیدہ کا نادر مرقع“ کا فقرہ درج ہے۔ اس مختصر فقرے سے بھی ناول کے موضوع کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول تاریخی نوعیت کا ہے جس میں ایک کامیاب ناول کی تمام خوبیاں موجود ہیں، اس ناول میں عہد شاہی سے وابستہ تاریخ بھی ہے اور جاسوسی ناولوں کا رنگ بھی۔ اس ناول میں اصلاح معاشرہ اور مسلمانوں کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کی عکاسی دیکھی جا سکتی ہے۔ ناول نصیر الدین حیدر غازی کے عہد حکومت کے آخری ایام سے شروع ہوتا ہے اور واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ انگریزی حکومت کے تسلط کے ذکر کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ تمام تفصیلات ناول میں درج ہیں۔ مرتب نے لکھا ہے کہ ناول ’صوفیہ‘ واجد علی شاہ کے دور کی تاریخی دستاویز کی

حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سلمٰی رفیق نے نہایت تفصیل سے ناول کا جائزہ لیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس ناول کے تمام کردار انسانی اور جیتے جاگتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام کردار ہمارے ارد گرد کے ہیں۔ ناول کی زبان کے تعلق سے ڈاکٹر سلمٰی رفیق نے لکھا ہے کہ ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ پورے ناول میں کہیں کوئی مقفّٰی مسجع عبارت نہیں ملتی، زبان کا ایک معیار ہے۔ ڈاکٹر سلمٰی رفیق نے مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کی زبان کے تعلق سے لکھا ہے کہ ان کی نثر سرسید احمد خان کی نثر سے متاثر نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر سلمٰی رفیق نے ایک صدی بعد اس ناول کو از سر نو شائع کر کے مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کے کام کو اردو دنیا کے سامنے روبرو کیا۔ مرتب نے لکھا ہے کہ ناول کی ترتیب اور مواد میں کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل متن کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ یہ ناول ایک صدی پہلے منظر عام پر آیا تھا اس لیے اس ناول میں موجود غیر واضح الفاظ کو مرتب نے الفاظ کو سیاق و سباق کی مدد سے درست کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی نشان دہی حاشیہ میں کر دی ہے۔ ظاہر ہے قاری کو اس حاشیے سے مدد ملے گی۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سلمٰی رفیق نے ایک ایسے متن کا انتخاب کیا جو قاری کے ذہن سے تقریباً محو ہو گیا تھا، یہ ناول چند ویب سائٹ پر ضرور موجود ہے مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے از سر نو شائع کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ تاکہ نئے قارئین بھی مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کے نام اور کام سے واقف ہو سکیں۔ ڈاکٹر سلمٰی رفیق یقیناً مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کو نئی نسل سے روبرو کرایا۔ امید کی جانی چاہیے کہ ڈاکٹر سلمٰی رفیق کی محنت اور اس تحقیقی کام کو پسند کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

رسائل و جرائد

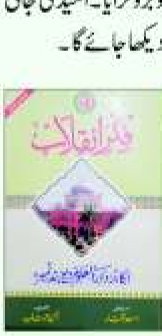

فکر انقلاب اکابر دیوبند نمبر

جلد: 9، شمارہ: 205

صفحات: 1008، قیمت: 500، سنہ اشاعت: جنوری 2021

ناشر: آل انڈیا تنظیم علمائے حق، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: عبدالمالک بلند شہری، A-126/5، شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

اکابر و اسلاف کے تذکرے و احوال کی اشاعت ہر دور میں اہم اور ضروری سمجھی گئی ہے اور آج کے مادہ پرستانہ و مفاد پسندانہ احوال کو دیکھتے ہوئے تو اس کی اہمیت و افادیت اور معنویت دو چند ہو جاتی ہے۔ ماضی قریب میں برصغیر کی علمی، مذہبی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی سطح پر جن شخصیات و افراد کے انمٹ نقوش ثبت ہوئے اور جن کے کارہائے نمایاں آج بھی دوسروں کو دعوت فکر و عمل دے رہے ہیں ان میں علمائے دیوبند کا کردار بہت نمایاں ہے۔

عہد رواں میں اردو زبان کے ذریعہ اکابر دیوبند کے حالات و کوائف کی ترویج و اشاعت میں جو کردار آل انڈیا تنظیم علما، حق دہلی ادا کر رہی ہے وہ لائق ستائش اور قابل تحسین ہے۔ تنظیم کے ذمہ دار جناب مولانا اعجاز عرفی اکابر شناسی کے حوالہ سے اپنی ایک منفرد اور اہم شناخت قائم کر چکے ہیں۔ اکابر دیوبند کے فیوض و کمالات کو عام کرنا، ان کے احوال و سوانحی کوائف سے نئی نسل کو روشناس کرانا ان کی زندگی کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ وہ حکیم الامت نمبر، شیخ الاسلام نمبر، امام العصر نمبر، شیخ الحدیث نمبر، انظر شاہ نمبر، مفکر اسلام نمبر، فقیہ الاسلام نمبر سمیت متعدد عظیم شخصیات کے فکر و فن پر انتہائی معیاری، دستاویزی خصوصی رسائل شائع کر کے سوانحی ادب میں اب تک گراں قدر اضافہ کر چکے ہیں جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

زیر نظر شمارہ اکابر دیوبند نمبر اسی درخشاں سلسلہ کی ایک بہترین اور تابناک کڑی ہے۔ اکابر دیوبند نمبر کے عنوان سے یہ مجلہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے جو اپنے گوناگوں مشمولات، تحقیقی مقالات کی وجہ سے لائبریری کی زینت بننے لائق ہے یہ دہ زیب طباعت، عمدہ ٹائٹل اور خوبصورت کاغذ کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت اور معنویت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

رسالہ مدیر تحریر کے اداریہ سے شروع ہوتا ہے جس میں وہ مختصر مگر جامع انداز میں اکابر دیوبند کی خدمات کو خراج تحسین عقیدت پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں ''دیوبند ہندوستان کی سب سے بڑی مذہبی اور تعلیمی تحریک ہے جس نے مسلمانوں کے مذہبی اور علمی وجود کو ایک مستحکم شناخت عطا کی اور علم کی روشنی ان تمام قصبات و قریات تک پہنچائی جو جہالت کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ دیوبند کی تحریک کا ہی اثر ہے کہ یہاں کے سرچشمہ علم و عرفان سے صرف ہندوستان نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں نے فیض حاصل کیا ہے۔''

اداریہ کے بعد پیغامات و مراسلات کا سلسلہ ہے جس میں علمی و ادبی دنیا کے مختلف شعبوں سے وابستہ سرکردہ شخصیات نے اس کاز کے تئیں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

پیغامات کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلا مضمون مولانا قاسم نانوتوی کی شخصیت کے متعلق ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی کا ہے۔ انھوں نے بہت ہی اختصار و جامعیت کے ساتھ قاسم نانوتوی کی شخصیت کا تعارف کرایا ہے، ان کے علاوہ قاسم شناسی کے حوالہ سے ڈاکٹر محمد اللہ خلیلی نے بھی اچھا مضمون لکھا ہے۔ اس موضوع پر مدیر محترم مولانا اعجاز عرفی کے بھی دو مضامین ہیں جو بڑے معلوماتی ہیں۔ ان کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم نانوتوی تعلیم کو ایک اکائی تصور کرتے تھے اور ہندی و سنسکرت کی تعلیم پر بھی زور دیتے تھے۔

اکابر رائے پور پر مفتی عبدالخالق آزاد نے بڑا جاندار، تفصیلی، مبسوط اور بہترین مضمون لکھا ہے جو ان اکابر کی زندگی کے تمام ہی گوشوں اور پہلوؤں سے بخوبی طور پر واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ سعید اکبر آبادی کے اسلوب نگارش کے عنوان سے حقانی القاسمی کا مضمون منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ مضمون میں حقانی صاحب کے سحر انگیز قلم کی جولانی عروج پر محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ سعید اکبر آبادی کے اسلوب کی خوبیوں اور محاسن سے نقاب کشائی کی ہے۔ حقانی القاسمی کا چونکہ فکری منطقہ بہت وسیع ہے اور ان کا اسلوب نگارش بڑا منفرد ہے اسی لیے ان کی دیگر نگارشات کی طرح مذکورہ مضمون میں بھی ان کے پرکشش اسلوب کا جلوہ مترشح ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ قاری ابوالحسن اعظمی کے بھی متنوع شخصیات کے حوالہ سے کئی مضامین ہیں جو انتہائی مختصر ہیں۔ قاری کو ان کی خواندگی کے بعد تشنگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے، مولانا ناصر الدین مظاہری کے بھی کئی مضامین ہیں جو تاثراتی نوعیت کے ہیں، مفتی تقی عثمانی کی بھی کئی رثائی تحریریں شامل کتاب ہیں، مولانا انظر شاہ کشمیری کے تعلق سے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کا مضمون دلچسپ ہے، ڈاکٹر ابرار اجراوی نے اپنی تحریر میں مولانا مناظر احسن گیلانی کے نثری اسلوب کی خصوصیات بھی بڑے بہترین انداز میں بیان کی ہیں، مفتی سعید احمد پالنپوری کے حوالہ سے مولانا نور عالم خلیل امینی کا مضمون زبان و بیان اور معلومات کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے۔ مولانا احمد علی سہارنپوری پر مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے بڑا معلومات افزا مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد اہل قلم کے متنوع افراد پر بہترین، دلچسپ اور معلومات آفریں مقالات ہیں۔ ضخامت کے بموجب اغلاط بھی در آئی ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے یہ ایک عمدہ اور لائق ستائش کاوش ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ اپنے سابقہ خصوصی شماروں کی طرح اہل علم و دانش سے داد و تحسین حاصل کرے گا اور اس کوشش کو ادبی و مذہبی حلقوں میں یکساں طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

اردو فکشن کی تاریخ خواتین تخلیق کاروں کے ذکر کے بغیر نامکمل: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'اردو فکشن: عورت کی کہانی عورت کی زبانی' کے زیرِ عنوان آن لائن مذاکرہ

نئی دھلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'اردو فکشن: عورت کی کہانی عورت کی زبانی' موضوع پر ایک آن لائن مذاکرہ کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں اردو فکشن میں خواتین کے کردار اور موجودہ صورت حال پر بھرپور مباحثہ ہوا۔ پروگرام کے شروع میں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے

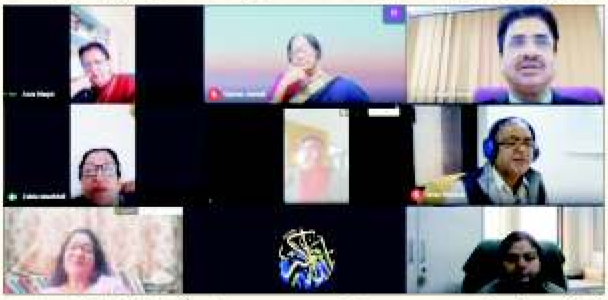

کہا کہ دنیا بھر کے دوسرے ادب کے مانند اردو ادب میں بھی خواتین کا ایک مضبوط کنٹری بیوشن رہا ہے، اردو ادب کی تاریخ کا کوئی گوشہ اور شعبہ ان کے ذکر و اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اردو فکشن کے موضوعات، مواد، عناصر و اجزا کو دائمی تحرک اور ترقی عطا کرنے میں خواتین افسانہ نگاروں کا اہم کردار رہا ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے اردو افسانے کے موجودہ منظرنامے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو افسانے کے حوالے سے کئی نئے نسوانی نام منظرِ عام پر آئے ہیں، جن کے افسانوں کو غور سے پڑھا جا رہا ہے اور انھیں قارئین و ناقدین کی خاصی توجہ حاصل ہو رہی ہے۔ آج کا یہ مذاکرہ ماضی سے لے کر عصر حاضر تک کی سرگرم خواتین افسانہ نگاروں اور ان سے متعلق مباحث و مسائل پر گفتگو کے لیے خاص کیا گیا ہے۔

مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے محترمہ ذکیہ مشہدی نے کہا کہ ہر ادیب اور تخلیق کار اپنے گرد و پیش کے حالات سے اثر قبول کرتا ہے اور اسی کے زیر اثر لکھتا ہے، البتہ عورت ان حالات کو مختلف انداز سے دیکھتی ہے اور اس کا طریقۂ اظہار بھی مختلف ہوتا ہے۔ خصوصاً عورت جب عورت کے بارے میں لکھتی ہے تو وہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی خواتین فکشن نگاروں کے ہاں موضوعات اور مواد کی بہتات ہے اور وہ عورتوں کے مسائل کے علاوہ دیگر سماجی و سیاسی موضوعات پر بھی لکھ رہی ہیں اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

محترمہ قمر جمالی نے کہا کہ خواتین کی فکری و تخلیقی آزادی کا دور اٹھارویں صدی سے شروع ہوتا ہے جب خواتین نے باقاعدہ اپنے وجود اور تشخص کے اظہار کا اعلان کیا اور اس کے بعد بتدریج سماج کے دیگر شعبوں کے ساتھ ادب میں بھی ان کی مضبوط حصے داری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اردو کی خواتین فکشن نگاروں کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 'تہذیب نسواں' سے شروع ہونے والا خواتین قلم کاروں کا قافلہ مسلسل آگے بڑھتا رہا اور آج وہ بہت اہم مقام پر ہے۔ آج خواتین کے ادب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ سماج کے دیگر شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش چلنے کے ساتھ ادب کے میدان میں بھی ان کے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی ہیں۔

محترمہ رینو بہل نے کہا کہ خواتین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی خاتون ادیب و فکشن نگار زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہے کیوں کہ وہ ان کے مسائل اور حالات کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی خواتین اچھا لکھ رہی ہیں، کہانی کے کرداروں کو حقیقی انداز میں پیش کر رہی ہیں اور عورتوں کے اصل کیرکٹر کو بلا کسی جھجھک کے اس کی خوبیوں اور خامیوں سمیت پیش کر رہی ہیں۔

محترمہ صادقہ نواب سحر نے کہا کہ خواتین افسانہ نگاروں کی ایک پوری تاریخ اور نفسیات ہے۔ انھوں نے نہ صرف عورتوں کے مسائل پر بہت اچھا لکھا ہے بلکہ مردوں کی نفسیات کے تعلق سے بھی انھوں نے خوب صورت افسانے لکھے ہیں۔ قلمکار کے طور پر عورت اور مرد میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی، ان کی تخلیقات میں بھی وہ تمام اوصاف و خصوصیات پائی جاتی ہیں جو مرد تخلیق کاروں اور ادیبوں کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

محترمہ عذرا نقوی نے اس پروگرام کی نظامت کا فریضہ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور موضوع کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ بنیادی طور پر عورتوں کی تخلیق کا مقصد ماضی سے لے کر آج تک اظہار ذات رہا ہے، کسی کی مخالفت ان کے پیش نظر نہیں رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کی افسانہ نگاری مختلف مراحل سے گزر کر آج اپنی بلندی پر پہنچ گئی ہے اور آج کی خواتین پہلے سے زیادہ بولڈ ہیں اور وہ ہر قسم کے مسائل پر کھل کر لکھ رہی ہیں۔ ان کے سامنے نہ موضوعات کا بحران ہے اور نہ اظہار خیال کی راہ میں انھیں کسی بندش کا سامنا ہے۔

اخیر میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل کی جانب سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محمد فیاض، نوشاد منظر، کونسل کے دیگر اسٹاف موجود رہے اور ویب ماسٹر محمد افروز نے ٹیکنکل سپورٹ فراہم کی، جبکہ کونسل کے فیس بک پیج کے ذریعے سیکڑوں اسکالرز اور دانشوران نے اس مذاکرے میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جنوری 2021

72ویں یومِ جمہوریہ کی مناسبت سے پرچم کشائی

نئی دہلی: یومِ جمہوریہ کی مناسبت سے آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے ہاتھوں پرچم کشائی کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے شیخ عقیل احمد نے ہندوستانی جمہوریت کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ ہمارے ملک کا آئین تمام شہریوں کو رہنے، کھانے پینے اور اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دیتا ہے، ساتھ ہی ملک کی فلاح و ترقی کے لیے مل جل کر جدوجہد کی تلقین کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم تمام شہریوں کو جہاں اپنے حقوق کا ادراک ہونا چاہیے، وہیں اپنی ذمے داریوں کا بھی احساس ہونا چاہیے اور بطور شہری ان کی ادائیگی پر توجہ دینی چاہیے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ 72ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر ہم سب یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنے ملک کی جمہوریت کی روح کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور اس کے وقار و اعتبار کو بلند کرنے، ساتھ ہی اس کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اپنا مطلوبہ کردار پورے اخلاص اور لگن کے ساتھ ادا کریں گے۔ پرچم کشائی کی اس تقریب میں کونسل کا پورا اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2021

قومی اردو کونسل میں ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی کی ڈراما شناسی' کا اجرا

نئی دہلی: مناظر عاشق ہرگانوی ہمارے دور کے ایسے مصنفین میں سے ہیں جنھوں نے ادب کی ہر صنف میں غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور اب تک ان کی دو سو سے زائد کتابیں منظر عام پر آکر ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں، ان کی تحقیقی و

تنقیدی سرگرمیوں کا سلسلہ اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی مؤلفہ کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی کی ڈراما شناسی' کے اجرا کے موقعے پر کیا۔ اجرا کی یہ تقریب کونسل کے صدر دفتر میں منعقد ہوئی تھی۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ مناظر عاشق ہرگانوی اپنی کثرتِ تصانیف کے سبب تمام اردو حلقوں میں معروف و متعارف ہیں اور پوری اردو دنیا میں ان کی تحریروں سے استفادہ کرنے والے پائے جاتے ہیں۔ تحقیق، تنقید، سوانح، ترجمہ، شاعری اور دیگر تمام ادبی شعبوں میں ہرگانوی صاحب کی ناقابل فراموش خدمات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے فکر و فن کی تفہیم و شناخت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے اور اب تک ان پر کئی کتابیں مرتب کی جاچکی ہیں، اسی سلسلے کی تازہ کڑی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تالیف 'مناظر عاشق ہرگانوی کی ڈراما شناسی' ہے جس میں مؤلف نے ہرگانوی صاحب کی ڈراما نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈرامے سے متعلق ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کو جمع کردیا ہے۔ یہ کتاب ہرگانوی صاحب کی ڈراما نگاری و ڈراما شناسی دونوں حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے اظہار خیال کرتے ہوئے مناظر عاشق ہرگانوی کو ہمہ جہت شخصیت قرار دیا اور کہا کہ وہ ایک وسیع النظر ادیب و قلمکار ہیں جنھوں نے تمام اصناف اردو کو اپنے نتائج افکار سے مالامال کیا ہے۔ کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، ڈاکٹر یوسف رامپوری، محمد زید اور ماعز القادری وغیرہ موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 فروری 2021

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

کشمیری لال ذاکر کی شخصیت اور ادبی خدمات

چاندپور: منڈلیہ وکاس سنستھان چاندپور و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے 'کشمیری لال ذاکر کی شخصیت اور ادبی خدمات' عنوان کے تحت ایک سیمینار 24 جنوری 2021 کو اسکائی لائن انسی ٹیوٹ چاند پور میں منعقد ہوا۔ سیمینار کی صدارت عالمی اردو ٹرسٹ کے چیرمین جناب اے رحمان ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نے کی۔ نظامت ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی اسسٹنٹ پروفیسر صدر شعبہ اردو مسلم پی جی کالج مرادآباد نے کی۔ سیمینار کا افتتاح چاند پور نگر پالیکا پرشد کے چیرمین محمد الیاس انصاری نے کیا۔ مہمان اعزازی یحییٰ سیفی، انجینئر خالد رشید علیگ رہے۔ مہمان خصوصی مظاہر خان ممبر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی رہے۔ متعدد اسکالرس نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر منور تابش نے کہا کہ کشمیری لال ذاکر کی شخصیت اپنے آپ میں ایک ادارہ ہے جو ہمارے ذہن کی نشو و نما کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ آپ احساس کی شدت اور جذبات کی ترجمانی کے بہترین شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ کشمیری لال ذاکر اردو ناول نگار، ڈراما نگار، افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار تھے۔ ان کا ادبی سفر غزل سے شروع ہوا لیکن بعد میں وہ فکشن کی طرف چلے گئے۔ وہ ہندی اور اردو دونوں میں لکھتے تھے۔ ان کو ہریانہ حکومت کی جانب سے فخر ہریانہ اعزاز سے نوازا گیا اور بھارت حکومت نے انھیں ملک کا چوتھا سب سے بڑے اعزاز پدم شری سے نوازا۔ ندیم راعی نے کہا کہ کشمیری لال ذاکر کا نام ترقی پسند فکر کے حامل ادیبوں اور شاعروں کی فہرست میں نمایاں ہے۔ ڈاکٹر شاعر حسین اصلاحی نے کہا کہ اردو فکشن کا نام بلند کرنے والے گنے چنے فنکاروں میں کشمیری لال ذاکر کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق برکاتی نے کہا کہ افسانہ، ناول اور شاعری کے علاوہ کشمیری لال ذاکر نے شخصی خاکے بھی تحریر کیے ہیں۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے کہا کہ کشمیری لال ذاکر اردو دنیا کا ایک چمکتا ستارہ ہیں جو ہمیشہ اپنی پہچان بنائے رکھیں گے۔ سیمینار کے صدر اے رحمٰن نے کہا کہ ان کے ادبی کاموں کی ابتدا اس وقت ہوئی جب وہ پرنس آف ویلز کالج میں طالب علم تھے۔ کالج کی ادبی میگزین کے مدیر بھی رہے۔ ان کا انداز جداگانہ تھا اور اپنے مضامین میں اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ قاری کس چیز کو پسند کرے گا۔ سیمینار کے کنوینر الیاس انجم نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ندیم راعی مرادآبادی، چودھری ہاؤس، مرادآباد، یوپی، 1 فروری 2021

آن لائن تدریس وقت کی ضرورت

نئی دہلی: باغ ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے سیمینار بعنوان 'آن لائن اردو تدریس وقت کی ضرورت' فاطمہ بارات گھر موج پور میں کیا جس میں مقالہ نگاروں نے آن لائن اردو تدریس کی ضرورت و اہمیت پر اپنے مقالے پیش کیے۔ بیشتر قلمکاروں نے زور دیا کہ آج کی برق رفتار زندگی میں سوشل میڈیا کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اگر اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو کم وقت اور کم خرچ میں کافی سودمند نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں، جس طرح دیگر کورسیز اور زبانوں کی ترویج میں آن لائن پروگرام کا استعمال ہو رہا ہے، اسی طرح اردوداں طبقہ کو بھی چاہیے کہ اس زبان کو گھر گھر تک پہنچانے کے لیے آن لائن اردو تدریس کا سلسلہ شروع کریں۔ انھوں نے کہا کہ لاک ڈاؤن میں طلبہ و طالبات کا تعلیمی سلسلہ یکسر منقطع ہوگیا۔ وقت کے ساتھ اداروں نے آن لائن کلاسز شروع کرکے بچوں کے تعلیمی سفر کو آگے بڑھانے کا کام کیا مگر اردو والے اس معاملے میں کافی پیچھے نظر آئے جس کا بڑا نقصان بچے اٹھا رہے ہیں اور اگر آئندہ دیگر زبانوں اور کورسیز کی طرح اس سلسلے کو رفتار نہ دی گئی تو اردو کے بچوں کو بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ جن شخصیات نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر ندیم احمد (اسسٹنٹ پروفیسر)، صادق شیروانی، ڈاکٹر اعجاز انصاری، ڈاکٹر سلیم احمد، ڈاکٹر علمہ اور آسیہ بیگم کے نام قابل ذکر ہیں۔ سیمینار کی نظامت معروف شاعر و نقاد ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے کی۔ باغ ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ریاض الحسن نے تمام مہمانان و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2021

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

جدید لسانیاتی تحقیق کی روشنی میں عربی زبان کی تعلیم

نئی دھلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'جدید لسانیاتی تحقیق کی روشنی میں عربی زبان کی تعلیم' کے موضوع پر پروفیسر عبدالماجد قاضی، صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں تعلیمی سال کے دوسرے توسیعی خطبے کا آن لائن انعقاد کیا گیا، جس میں مہمان خطیب کی حیثیت سے مراکش کے معروف دانشور، تخلیق کار، ماہر لسانیات اور قطر یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مصطفیٰ بوعنانی نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں توسیعی خطبوں کے کنوینر ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے مہمان خطیب، اساتذۂ کرام، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر مصطفیٰ بوعنانی کا تعارف پیش کیا نیز جامعہ کی تاریخ اور عربی زبان وادب کی تعلیم اور سلیبس پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آج کا توسیعی خطبہ اس وجہ سے اہمیت کا حامل اور منفرد ہے کہ عرب دنیا کے ایک ماہر لسانیات سے ہمیں اس موضوع پر خطاب سننے کا موقع مل رہا ہے۔ مہمان خطیب پروفیسر مصطفیٰ بوعنانی نے لسانیات اور صوتیات کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی، نیز عربی زبان کی عبارت خوانی کے دوران طلبہ کو پیش آنے والی دشواریوں کی نشاندہی کی اور اپنے طویل تجربات کی روشنی میں ان پریشانیوں کے ازالے کی تدبیریں مثالوں کے ساتھ واضح کیں۔ فاضل خطیب نے الفاظ کی صحیح ادائیگی کے زیر وبم سے واقف کرایا، موصوف نے علاقائی اور بین الاقوامی پس منظر میں مختلف تلفظ کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے مقامی تلفظ کی اثراندازی کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا نیز اس کے تدریجی ارتقا کے مختلف مراحل پر بھی بحث کی۔ پروفیسر مصطفیٰ کے خطبہ کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کی جانب سے موضوع سے متعلق سوالات کیے گئے جن کے جوابات فاضل خطیب نے تفصیل سے دیے۔ پروگرام کے آخر میں صدر جلسہ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے معلومات سے بھرپور اور ایک وقیع اور علمی لیکچر کے لیے پروفیسر مصطفیٰ بوعنانی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 جنوری 2021

ایران اور ہندوستان میں اسلامی علوم

نئی دھلی: 'اسلامک اسٹڈیز' اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہر چیز کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ اسلامی مذہبی علوم، مسلمانوں کی تاریخ، مسلم تہذیب وثقافت، مسلم فلسفہ، مسلم ممالک، اسلامی روحانیت، مسلم سائنسی ورثہ، معاشرتی علوم، مسلم معاشیات، مسلم نفسیات وسیاست، مسلم افکار ونظریات، اورینٹل ازم، گلوبلائزیشن، مسلم ایجوکیشن سسٹم، بین المذاہب نقطہ نظر کے ساتھ ایریا اسٹڈیز اور مسلم دنیا میں جدید پیش رفت، اسلامی عصری دنیا، کثیر الثقافتی معاشرے، تقابلی مذاہب، بین المذاہب مکالمہ جیسے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار صدر شعبہ پروفیسر سید شاہد علی شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا۔ انھوں نے کہا ہمارا ملک ہندوستان ایک مختلف تنوع کی سرزمین ہے۔ علاقائی تنوع، مذہبی تنوع، ثقافتی تنوع اور لسانی تنوع، گویا ہندوستان تنوع میں اتحاد کی ایک انوکھی مثال ہے۔ اسلامک اسٹڈیز ایک ایسا شعبہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے لیے ایک زبردست کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ واضح رہے کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور علامہ طباطبائی یونیورسٹی ایران کی شراکت سے 'ایران اور ہندوستان میں اسلامی علوم' کے موضوع پر یک روزہ بین الاقوامی ویبینار کا انعقاد ہوا۔ شعبہ کے ریسرچ اسکالر منور کمال کی تلاوت کلام اللہ سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ نظامت کے فرائض حنان شیریں، اقرا فاطمہ اور محمد اویس نے انجام دیے۔ پدم شری پروفیسر ایمریٹس اختر الواسع نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ ایران میں اسلامک اسٹڈیز کا فروغ غیر معمولی ہے، یہ انقلاب اسلامی ایران کے بعد دیکھنے کو ملتا ہے، قرآن فہمی کے تعلق سے ایران میں جو گہما گہمی ہے وہ غیر معمولی ہے، مغربی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں اسلامک اسٹڈیز کا منہج ایران میں مختلف ہے۔ ایران میں اسکول کے نصاب سے یونیورسٹی کے نصاب تک میں لازمی طور پر اسلامک اسٹڈیز کا نصاب شامل ہے۔ نامور ایرانی اسکالر ڈاکٹر علی زادہ موسوی نے کہا کہ ابومنصور ماتریدی، امام اشعری اور امام طحاوی کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ماتریدی شیعہ تھیالوجی سے قریب تر ہیں، فقہ میں امام ابوحنیفہ جب کہ امام ابومنصور ماتریدی علم کلام میں ایک اعلیٰ حیثیت کے حامل ہیں۔ پہلے سیشن کے اختتام پر پروفیسر اقتدار محمد خان ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے اپنے صدارتی خطبے میں اسلامک اسٹڈیز اور تھیالوجی کا فرق بتایا، انھوں نے کہا کہ ہندوستانی عربی مدارس میں قرآن وحدیث، فقہ وغیرہ کی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ تھیالوجی (دینیات) کہلاتی ہے جب کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے نام سے جو شعبہ قائم ہے اس میں مسلم تہذیب وثقافت، اسلامی تاریخ وغیرہ سے متعلق چیزیں نصاب میں شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 1976 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عرب ایرانین اسٹڈیز کے نام سے یہ شعبہ قائم تھا پھر 1988 سے مستقل ایک شعبہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 جنوری 2021

احمد امین بہ حیثیت ادیب وناقد

نئی دھلی: ریسرچ اسکالر فورم، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے آٹھویں ان ہاؤس سمینار کا صدر شعبۂ عربی پروفیسر عبدالماجد قاضی کی صدارت میں آن لائن انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالقدوس انچارج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالر محمد وسیم نے مہمان خصوصی، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کا استقبال کیا۔ اس کے بعد محمد یوسف میر نے 'استاذ احمد امین بہ حیثیت ادیب وناقد' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا، جس میں موصوف نے کہا کہ ہم احمد امین کو صرف ایک عربی ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن ان کی ادبی زندگی کا ایک اہم پہلو تنقید بھی ہے۔ ریسرچ اسکالر نے احمد امین کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ موصوف نے اپنے مقالے کے آخر میں کہا کہ استاذ احمد امین نے عربی ادب کے حوالے سے بہت اہم ادبی موضوعات پر قلم اٹھایا، جن میں لفظ ومعنی کی بحث اور عربی ادب میں

تجدید کی ضرورت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالر کی جانب سے کیے گئے سوالات کا نہایت ہی اچھے انداز میں مدلل جواب دیا۔ ریسرچ اسکالر فورم کے ایڈوائزر ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے ریسرچ اسکالر محمد یوسف میر کے اس قیمتی مقالہ کے لیے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ اتنے مشکل اور خشک موضوع کو آپ نے دلچسپ بنا کر پیش کیا نیز انھوں نے مقالہ نگاروں کو اپنی قیمتی آرا سے بھی نوازا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی ڈاکٹر عبدالقدوس نے اپنے خطاب میں احمد امین کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے تنقیدی پہلو کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے اپنے صدارتی خطبے میں احمد امین کے ادبی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی نیز ان کی فنی صداقت کو بیان کیا۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے مہمان خصوصی، اساتذہ اور تمام ریسرچ اسکالرز کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں شعبہ کے اساتذہ و ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جنوری 2021

کتابی سلسلہ 'اندازِ بیاں' پر مذاکرہ

نئی دھلی: حقانی القاسمی ہمارے عہد کے بہت ہی قابل قدر ادیب و نقاد ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ

اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ بھی لکھا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خالد محمود نے فورم برائے انٹلکچوئل ڈسکورس اور دی ونگس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام حقانی القاسمی کی انداز بیان کتابی سیریز 3 'میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات' کے حوالے سے منعقد مذاکرے کے صدارتی کلمات میں کیا۔ مہمان خصوصی ماہر امراض نسواں ڈاکٹر زرّیں حلیم نے میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات پر مبنی حقانی القاسمی کے اس رسالے کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ ایک معالج کے تخلیقی چہرے کو سامنے لانا ایک قابل تحسین عمل ہے۔ محمد خلیل سائنسداں نے حقانی القاسمی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے انھیں ایک بین العلومی شخصیت قرار دیا۔ حقانی القاسمی نے بتایا کہ یک موضوعی مجلّے کی اشاعت میرا ایک خواب اور جنون تھا۔ اس حوالے سے میں نے کوشش کی ہے کہ دنیا کے سامنے ایسے پیشوں سے وابستہ افراد کا تخلیقی چہرہ سامنے لایا جائے جن کی روزی روٹی کا تعلق اردو زبان سے نہیں رہا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے پیشے سے وابستہ اصطلاحات، تجربات اور نفسیات سے ادبی دنیا کو آشنا کیا ہے۔ مذاکرہ کے کنوینر ڈاکٹر خالد مبشر نے اس بات پر زور دیا کہ اردو زبان و ادب کا مختلف علوم وفنون سے بہت مضبوط رشتہ رہا ہے۔ مذاکرہ میں منظر امام، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر یوسف رامپوری، نایاب حسن، شارب ضیا رحمانی اور عبدالباری صدیقی نے مفصل تنقیدی و تجزیاتی مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے کہا کہ حقانی القاسمی کا ذہن حد درجہ اختراعی ہے۔ ان کی زبان و اسلوب نہایت سحرانگیز ہے اور انھوں نے یک موضوعی رسالہ انداز بیاں جاری کر کے خواتین کی خودنوشت، پولیس کا تخلیقی چہرہ اور میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات پر نہایت موقر و معتبر دستاویزات فراہم کیے ہیں۔ مذاکرے کا اختتام دی ونگس فاونڈیشن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر انوارالحق کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد اجمل، شکیل جمالی، عابد انور، ڈاکٹر فیضان شاہد، ڈاکٹر شاداب تبسم اور ڈاکٹر سلمان فیصل کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جنوری 2021

'مقدماتی ادب' پر مذاکرہ

نئی دھلی: مقدماتی ادب کی باضابطہ تحقیق و تنقید کے حوالے سے خالد مبشر کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ اعلیٰ ادبی مذاق اور گہرا تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خالد مبشر کی کتاب مقدماتی ادب پر فورم فار انٹیلکچول ڈسکورس اور دی ونگس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرے میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر خالد مبشر کا شمار جامعہ کے ان لائق و ذہین فرزندوں میں ہوتا ہے جن پر کوئی بھی تعلیمی ادارہ فخر کرسکتا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر کوثر مظہری نے خالد مبشر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ اپنے موضوع پر ایک شاہکار ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ طلبا اور اساتذہ ایسی تحقیقی و تنقیدی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مہمان اعزازی حقانی القاسمی نے کہا کہ نئی اصطلاحات وضع کرنے کے لیے جرأت و جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے اردو کو 'مقدماتی ادب' کے نام سے ایک نئی اصطلاح عطا کی ہے۔ ان کی یہ کتاب تحقیق و تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اس کتاب کی عمدہ زبان، واضح نظریے اور معیاری تحقیق و تنقید پر مصنف کی تحسین کی۔ عبدالمنان (مدیر ماہنامہ یوجنا) نے کہا کہ میرے نزدیک 'مقدماتی ادب' اکیسویں صدی کی اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل (جے این یو) نے مصنف سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خالد مبشر اوائل عمری سے ہی علمی و تحقیقی ذہانت کے مالک رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ کسی بھی علمی مسئلے پر سرسری نظر کے قائل نہیں۔ مشہور شاعرہ فوزیہ رباب نے اپنے تحریری تاثر میں کہا کہ ڈاکٹر خالد مبشر جیسی پختہ اور بامعنی نثر ان کے معاصرین میں بہت شاذ نظر آتی ہے۔ فوزیہ رباب کا تحریری تاثر سفیر صدیقی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر نعمان قیصر نے بتایا کہ خالد مبشر نے اس کتاب میں بت گری ہی نہیں بلکہ بت شکنی بھی کی ہے۔ منظر امام نے کہا کہ اس کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر خالد مبشر کے بین العلومی ذہن اور گہرے علمی و تحقیقی شعور و آگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فیضان شاہد نے خالد مبشر کی کتاب 'مقدماتی ادب' کا تعارف و تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسے اچھوتے موضوع پر یہ ایک قابل تحسین تصنیف ہے۔ منزہ شاہ نے اس کتاب پر مفصل مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کا آغاز جمیل سرور کی تلاوت اور اختتام ڈاکٹر انوار الحق کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 جنوری 2021

پروفیسر یعقوب یاور کی ادبی خدمات

نئی دھلی: آگہی ادب کی جانب سے غفار منزل جامعہ

نگر میں بعد نماز مغرب ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ مذاکرے میں مختلف تعلیمی درسگاہوں کے طلبہ و ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی اور 'یعقوب یاور کی ادبی خدمات' پر گفتگو کی۔ پروگرام میں پروفیسر یعقوب یاور بذات خود شریک تھے۔ بزم کا آغاز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر محمد شاہد کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ ان کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے ڈی اے وی کالج کی استانی تمنا شاہین نے کہا کہ یاور کی اب تک چالیس سے زیادہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ دل مَن، عزازیل، جہاد اور دھولد یپ ان کے ناول، الف وقلم گو یدان کی شاعری کے مجموعے اور امروز، تحریک وتعبیر ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مختلف زبانوں سے ڈھیروں تراجم بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ پروگرام میں یعقوب یاور کی غزل گوئی کے حوالے سے شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر مصطفیٰ علی نے اپنا پیپر پڑھا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کلیم احمد نے اپنا مقالہ پیش کیا جبکہ ان کے مشہور تاریخی ناول دل مَن کا تجزیہ جواں سال ناول نگار عمران عاکف خان نے پیش کیا۔ واضح رہے کہ یہ پروگرام آن لائن اور آف لائن دونوں موڈ میں منعقد ہوا جس کی وجہ سے حیدرآباد، بنگال، میرٹھ، مرادآباد، ممبئی، لکھنؤ، بنارس اور کانپور جیسے دور دراز علاقوں سے بھی لوگ شریک ہوئے۔ اس نشست کی نظامت کے فرائض شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر غفران حکیم نے انجام دیے جب کہ بزم کے روح رواں مصطفیٰ علی کے کلمات تشکر پر ادبی مذاکرے کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2021

اترپردیش

جمہوری نظام میں صحافت کا کردار

نئی دھلی: جمہوریت اور صحافت مل کر ایک مہذب سماج کی تشکیل میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار سینئر صحافی اور عالمی سہارا چینل کے ایڈیٹر لئیق رضوی نے شعبہ اردو، ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل کے ذریعے منعقدہ قومی ویبنار بعنوان 'جمہوری نظام میں صحافت کا کردار' میں کیا۔ لئیق رضوی نے اپنے کلیدی خطبے میں مزید کہا کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد صحافت کا رول سماج کے لیے نفع بخش رہا ہے۔ آج صحافت پیشہ ورانہ حیثیت کی حامل ہوگئی ہے لیکن آج بھی کلی طور پر اس کا رول مثبت ہے۔ آزاد صحافت اچھی جمہوریت کی بنیادی ضرورت ہے اور شناخت بھی۔ یہ چوتھا ستون ہی نہیں وہ واحد پل بھی ہے جو نظام اور جمہور کو منسلک کرتا ہے۔ قبل ازیں پروگرام کی ابتدا میں شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر نوید احمد خان نے کہا کہ یہ موضوع بہت ہی حساس ہے اور صحافت کے رول کی نشاندہی کرتا ہے کہ جمہوری نظام میں صحافت کی کیا ذمے داری ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر ریحان حسن شعبہ اردو و فارسی گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر نے کہا کہ صحافت سنت الٰہی ہے اور اللہ نے اپنے انبیا پر صحائف بھیج کر یہ پیغام دیا کہ ایک اچھے سماج کو صحافت کی ضرورت ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر راشد عزیز شعبہ اردو سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر سری نگر نے کہا کہ صحافی سماج، حکومت اور عوام کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے عوام کو بیدار کرنا صحافت کی سب سے بڑی ذمے داری ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عابد حسین حیدری پرنسپل ایم جی ایم کالج سنبھل نے کہا کہ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ خصوصاً اردو صحافت نے مولوی محمد باقر سے لے کر آج تک اپنی ذمے داری کو بخوبی نبھایا ہے اور آج بھی اردو صحافت نے سماج کے ہر مسئلہ پر غیر جانبدارانہ نظر رکھ کر جمہوری نظام کو مستحکم کرنے اور رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض شعبہ کے استاذ ڈاکٹر ریاض انور نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ جبکہ شعبہ کی استانی ڈاکٹر ہما فاطمہ نے پروگرام کے انعقاد میں خصوصی تعاون پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 جنوری 2021

مولانا عبدالماجد دریابادی کی حیات وخدمات

بارہ بنکی: مفسر قرآن، عالم دین، ادیب وصحافی مولانا عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا

ہوتی ہیں۔ مولانا مرحوم علوم عصریہ اور علوم دینیہ کے ماہر تھے۔ مولانا نے اپنے پیچھے جو گرانقدر علمی سرمایہ چھوڑا ہے وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے جس سے تشنگان علم فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا عبدالماجد کی حیات وخدمات کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مولانا شکیل احمد فرقانی نے کیا۔ بزرگ شاعر رہبر تابانی مہمان خصوصی اور قاضی محمد زبیر مہمان اعزازی تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا ایک باکمال ادیب اور بے باک صحافی تھے۔ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مولانا شکیل احمد ندوی نے کہا کہ مولانا مرحوم کی تحریروں میں بے پناہ حسن وجمال اور قوت کشش ہے۔ یوں تو مولانا مرحوم کو مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی مگر تاریخ وفلسفہ آپ کا خاص موضوع تھا۔ مرحوم نے قرآن مجید کی شرح وتفسیر کی جو عظیم خدمت انجام دی وہ اپنے آپ میں بہت ہی اہم ہے۔ مولانا عبدالماجد ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے صدر جنید شمس نے کہا کہ ہم دریاباد والوں کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ مولانا جیسی شخصیت اس چھوٹی سے بستی میں پیدا ہوئی جس نے عرب وعجم وامریکہ میں اس بستی کا نام روشن کیا۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری محمود احمد نے کہا کہ مولانا نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ اس موقعے پر سامعین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جنوری 2021

ولایت جعفری: شخصیت اور فن

لکھنؤ: ولایت جعفری کو افسانہ نگاری وڈراما نگاری کے فن میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ وہ عرصہ تک دوردرشن کے ڈائرکٹر رہے۔ یوں تو ان کی بڑی خصوصیات ہیں لیکن ان کا بنیادی امتیاز افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری ہے۔ انھوں نے تھیٹر کی دنیا کو بلندی عطا کی۔ ان کے لائٹ اینڈ ساؤنڈ ڈرامے نے پوری دنیا میں اپنی شناخت بنائی۔ یہ باتیں معروف نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے کہیں۔ 'ولایت جعفری: فن اور شخصیت' کے عنوان سے یہ سیمینار منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر مسٹر جی بی پٹنایک آئی اے ایس چیئرمین اترپردیش جل نگم نے شرکت کرتے ہوئے ولایت جعفری کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو عباس رضا نیر نے کہا کہ ولایت جعفری رشتوں کے رکھ رکھاؤ کے حسین ترین پیکر تھے۔ چاہے وہ باپ بیٹے کا رشتہ ہو، کاغذ قلم کا رشتہ، اسٹیج کا رشتہ، رنگ و روشنی کا رشتہ سبھی کو بحسن وخوبی نبھایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک اسٹیج رائٹر کو خاص طور پر ڈراما سے وابستہ شخص کو ہر چیز پر نفسیاتی طور پر گرفت ہونی چاہیے، جو ان میں بدرجہ اتم

موجود تھی۔ وہ لائٹ اینڈ ساؤنڈ ڈرامے کے موجد تھے۔ ان کے ڈراموں نے پوری دنیا میں دھوم مچائی۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا کہ انسانی رشتوں کا جو پاس و لحاظ ولایت جعفری کے یہاں ملتا ہے، وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ سعید مہدی نے لوگوں کا استقبال کیا اور کہا کہ ولایت جعفری ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن ان کے ذریعے کیے گئے کام ایسے ہیں جن کی وجہ سے ہم اور آپ ہمیشہ انھیں یاد کرتے رہیں گے۔ اہم خطیب ڈراما نگار ڈاکٹر اتل رستوگی نے ولایت جعفری کے ساتھ کیے گئے ڈراموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عظیم ہدایت کار تھے، ان کا کام بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی کی سابق وی سی روپ ریکھا ورما اپٹا کے جنرل سکریٹری راکیش، ریشماں پروین، للت پوکھریال، کنک سمیت دیگر لوگوں نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جنوری 2021

ریسرچ جرنل 'دستک' پر مذاکرہ

وارانسی: شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ریسرچ جرنل 'دستک' کے تازہ شمارہ پر خصوصی مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر زماں آزردہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے قاضی عبدالودود کو دیکھا ہے۔ وہ بیرسٹر تھے لیکن اردو کے لیے ان کی خدمات تاریخ ساز ہیں۔ انھوں نے ریسرچ جرنل دستک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم جن تحریروں پر تنقید لکھتے ہیں کل اسی طرح ہماری تحریروں پر تنقیدی تحریریں لکھی جائیں گی۔ اس لیے ہمیں محنت کرکے تحریریں لکھنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ ادب کے حوالے سے ہم بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ چند دنوں میں کتابیں لکھنے والے بہت ہیں لیکن زماں آزردہ کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے لکھا تو بہت کم ہے لیکن جو بھی لکھا ہے وہ بہت اہم ہے۔ انھوں نے مرزا دبیر پر جو کام کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ ڈاکٹر مشرف علی نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور ریسرچ جرنل 'دستک' کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ تازہ شمارے پر اظہار خیال کرتے ہوئے شعبہ فارسی کے استاذ ڈاکٹر مغیث احمد نے رسالے میں شامل اداریے پر خصوصی گفتگو کی۔ ڈاکٹر افضل مصباحی نے کہا کہ یہ رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے مشمولات بے حد اہم ہیں۔ ڈاکٹر قاسم انصاری نے کہا کہ اردو کے تمام رسائل قاری کی تلاش میں ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ لوگوں میں مطالعے کی عدم دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد استاذ شعبہ فارسی نے کہا کہ ہمارے منتشر خیالات کو یکجا کرکے دستک میں شامل کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق اور تنقید پر جو مضامین دستک میں شائع کیے گئے ہیں وہ بے حد معلوماتی ہیں۔ انھوں نے رسالے میں شامل تحقیقی مضمون 'یادگار غالب: چند تحقیقی مباحث' پر خصوصی گفتگو کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر سید عباس حسن نے کہا کہ ہماری یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے جو یہ علمی، تحقیقی اور تنقیدی رسالہ شائع کیا جارہا ہے اسے طلبہ دلچسپی کے ساتھ پڑھیں اور اساتذہ کے قدم بہ قدم ساتھ رہیں اور ان سے استفادہ کریں۔ پروفیسر شاہینہ رضوی نے کہا کہ غالب کی شخصیت پر کوئی مقالہ نظر آتا ہے تو اسے پڑھنے کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ اس رسالے میں شائع مقالے میں غالب کے حوالے سے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بہت اہم ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر رقیہ بانو کے مضمون 'لداخی زبان: لسانی بحث' پر خصوصی گفتگو کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر احسان حسن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عبدالسمیع نے پروگرام کی نظامت کی۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر اشفاق احمد، ڈاکٹر قمر، ڈاکٹر ریحان، ڈاکٹر رشی کمار، پروفیسر تعبیر کلام، ڈاکٹر راہل چترویدی، بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات اور ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 فروری 2021

بہار

اردو ملازمین کے لیے ورکشاپ

مظفر پور: ضلع پریشد مظفر پور کے کانفرنس ہال میں اردو ڈائریکٹوریٹ کی ہدایت پر ضلع اردو اکائی مظفر پور کے زیر اہتمام ایک مسابقتی پروگرام اور اردو ملازمین کے لیے ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح ایڈیشنل کلکٹر راجیش کمار نے کیا اور صدارت جناب فیاض اختر اردو انچارج افسر نے کی۔ نظامت ڈاکٹر مطیع الرحمٰن عزیز نے کی۔ راجیش کمار نے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی ترویج و اشاعت میں صوفی سنتوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان کا نام اردو سے پہلے ہندوی ریختہ اور ہندوستانی بھی رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آج سائنسی ترقی کے دور میں ہم زبان کی تعلیم سے دور ہوتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے اردو ہندی دونوں زبانوں کا نقصان ہو رہا ہے جبکہ سچائی یہ ہے کہ جو زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کو ہر جگہ سرخروئی حاصل ہوتی ہے اور ان کو نوکری بھی ملتی ہے۔ جناب فیاض صاحب نے اردو زبان کی اہمیت اور اس کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ آپ اس زبان کے عمل درآمد میں اپنا رول ادا کریں اور روزانہ اپنی ملازمت میں دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ کم سے کم ایک گھنٹہ اردو کے لیے وقت ضرور نکالیں۔ آپ اپنی موجودگی کا احساس اردو عوام کو ضرور کرائیں۔ پروفیسر حسن رضا نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے کہا کہ اردو اگر صرف مسلمان کی زبان ہوتی تو بنگالی مسلمان، بنگالی، کرناٹک کے مسلمان کنڑ اور مہاراشٹر کے مسلمان مراٹھی نہیں بول رہے ہوتے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں بولی جانے والی سب سے بڑی زبان اردو اور ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 31 جنوری 2021

ایک شام اردو زبان کے نام

مونگیر: رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر میں ایک شام اردو زبان کے نام منعقد پروگرام میں 'جنگ آزادی میں اردو کا کردار' کے عنوان پر جہاں مقالے اور تقریریں پیش کی گئیں، وہیں نظم و غزل کا بھی دور چلا، اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے صفدر امام قادری صدر شعبۂ اردو کامرس کالج پٹنہ، شریک ہوئے، امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی کی صدارت میں منعقد اس پروگرام میں ڈی ٹی او مونگیر اوما شنکر، پروفیسر اقبال حسن آزاد، پروفیسر شبیر حسن، پروفیسر شہزاد انجم برہانی، جگجیون کالج، آرہ، پروفیسر راشد طراز، وکاس کمار سنہا، ڈاکٹر رام چندن جی، جامعہ رحمانی کے اساتذہ اور شہر مونگیر کے معززین شریک ہوئے۔ اس موقعے پر امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی کے ہاتھوں پانچ کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔ بنگلہ دیش کو ہم نے دیکھا (سفرنامہ از صفدر امام قادری) میرے والدین از صفدر امام قادری، روشن ہے رہگزار مرتب صفدر امام قادری و جاوید دانش، جانے پہچانے لوگ سوانحی خاکے صفدر امام قادری مرتبہ عابدہ پروین و نیلوفر ثالث سہ ماہی مدیر اقبال حسن آزاد۔ جنگ آزادی میں اردو کا کردار پر بولتے ہوئے مہمان خصوصی صفدر امام قادری نے کہا کہ یہ زبان جنگ آزادی میں کارگر ہتھیار بن کر اس لیے سامنے آئی کہ اس میں لوگوں کو جوڑنے اور اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت موجود ہے، اس کی شیرینی لوگوں کے کانوں میں رس گھول دیتی ہے اور سننے والوں کو پر جوش کر دیتی ہے،

پروفیسر شبیر حسن نے کہا کہ اردو نے وطن دوستی، انگریزوں کی مخالفت اور فرقہ وارانہ اتحاد کا ایسا ماحول بنایا کہ استعماری قوت کو اس ملک کو آزاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ڈاکٹر ابوسفیان نے کہا کہ شعرا اور صحافیوں نے خاص طور سے اردو زبان کے ذریعے ملک کو آزاد کرنے میں حصہ لیا۔ ڈی ٹی او مونگیر اوماشنکر نے کہا کہ ہمیں اردو کی حفاظت کے لیے خود آگے آنا چاہیے، اردو کوئی یتیم زبان نہیں ہے کہ وہ دوسرے کے سہارے زندہ رہے۔ پروفیسر شہزاد انجم برہانی جگ جیون کالج آرہ نے کہا کہ اردو ایک انقلابی زبان ہے اس میں آج بھی انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اپنے صدارتی خطاب میں مولانا محمد ولی رحمانی نے کہا کہ آزادی کی جدوجہد میں اردو کے شعرا، ادبا، صحافیوں اور قلمکاروں کی آزادی کی جدوجہد میں کردار کو بیان کرنے کے لیے دفتر چاہیے، دکھ کی بات ہے کہ ہماری اس طرف بھرپور توجہ نہیں ہوئی۔ ضرورت ہے کہ ہم اردو کو پڑھیں، پڑھائیں اور اپنی نسلوں کو اس زبان سے واقف کرائیں! ساتھ ہی اپنی انجمنوں کے اداروں اور مختلف تہذیبی و ثقافتی پروگراموں کے ذریعے اسے زندہ رکھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 جنوری 2021

ایک شام جمال اویسی کے نام

دربھنگہ: جمال اویسی، سنہ 1980 کے بعد شعری افق پر نمودار ہونے والے شعرا میں اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا جمالیاتی رنگ و آہنگ انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ جمال اویسی کی شاعری میں انسانیت کا نوحہ تو ہے ہی ساتھ ہی زوال پذیر تہذیبی اقدار پر بھی انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے احساسات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ یہ باتیں سی ایم کالج دربھنگہ کے پروفیسر سید محمد احتشام الدین نے 27 جنوری کی شام المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے دفتر میں منعقدہ ایک پروگرام 'ایک شام جمال اویسی کے نام' کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی شاعری میں وجودی تجربات کی وسعت نے انھیں انفرادی اہمیت عطا کی ہے۔ ان کی نظموں میں ایک ایسی کشش ہے جو قاری سے خود کو پڑھوانے کی طاقت رکھتی ہے۔ جمال اویسی پرانے موضوعات کو اپنے انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اس شعری نشست میں ایم آر ایم کالج میں استاد ڈاکٹر جمال اویسی نے اپنی کچھ نمائندہ نظمیں سنائیں اور خوب داد وصول کی۔ نشست میں عبدالحی نے ڈاکٹر جمال اویسی کا مختصر تعارف پیش کیا اور ان کی شاعری پر بھی اظہار خیال کیا۔ ملت کالج دربھنگہ میں شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر شاہنواز عالم نے جمال اویسی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں ان کی اپنی ذات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں، غزلوں میں کچھ اس طور سے موجود ہیں کہ انھیں ان کی تخلیق سے الگ نہیں کیا جاسکتا، عموماً شاعر یا تخلیق کار اپنی تخلیق سے الگ ہوجاتا ہے جب کہ جمال اویسی صاحب اپنی تخلیق کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 29 جنوری 2021

جشن سلطان شمسی

دربھنگہ: ملک کی آزادی ہمارے بزرگوں کی قربانیوں کا صدقہ اور ان کی طویل جدوجہد کا نتیجہ رہی ہے اور ہمیں اس ملک میں ان ہی راہوں پر چل کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے جن پر چلنے کا عہد ہمارے پرکھوں کے ذریعے آج سے 72 سال پہلے کیا گیا تھا تب ہی اس ملک میں قومی یکجہتی کو یقینی بنانے کی راہ آسان ہوسکتی ہے۔ یہ باتیں علم و ادب کی بستی جالے میں منعقد تقریب جشن سلطان شمسی میں خطاب کرتے ہوئے صدر مشاعرہ مرزا قاری نصیر احمد بیگ نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہر سال یوم جمہوریہ کی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ اس دن کو تاریخی بنانے کے لیے جالے کی ادبی سرزمین پر جس طرح کی ادبی نشست منعقد ہورہی ہے اس کا نئی نسل میں مثبت پیغام جائے گا۔ مشہور سماجی کارکن جاوید اقبال عرشی کے صحن میں منعقد اس تقریب کی صدارت مرزا قاری نصیر بیگ نے کی، نظامت کا فریضہ نامور ناظم مشاعرہ جاوید اقبال عرشی نے نبھایا اور حسنین اقبال عرشی کنوینر مشاعرہ رہے جب کہ اس موقعے پر مہمان خصوصی ابوظفر رحمانی اور مہمان اعزازی مولانا صفات احمد کے علاوہ مولانا غلام مذکر خان جالوی، اسلامک مشن اسکول کے ڈائرکٹر مولانا محمد ارشد فیضی قاسمی، عامر اقبال، محمد صادق آرزو، اڑان ایجوکیشنل ٹرسٹ کے روح رواں مفتی عامر مظہری، مفتی رضوان قاسمی، دوگھرا پنچایت کے سابق مکھیا نور عالم، سابق ضلع پارد حبیب اللہ ہاشمی، صحافی محمد رفیع ساگر، ذاکر حسین دوگھرا، مشہور تاجر گلریز خان، حافظ محمد سفیان، محمد منا، غضنفر جلال موجود رہے اور سلطان شمسی، انور کمال، غفران راشد، گیت کار گنیش، رماشنکر رائے، سرور عالم، بابا جہانگیر جالوی نے اپنے کلام پیش کیے جن کا سامعین نے خوب لطف اٹھایا، جاوید اقبال عرشی نے اپنی افتتاحی گفتگو میں کہا کہ سلطان شمسی نے اپنی شاعری کے ذریعے انفرادی صلاحیت کے جو جوہر بکھیرے ہیں ہمارے لیے آج خوشی کا دن ہے کہ ہم ان کی موجودگی میں ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف کرنے کے لیے یہاں جمع ہیں۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 29 جنوری 2021

تلنگانہ

علامہ شبلی نعمانی کی کتاب 'الفاروق' پر مذاکرہ

حیدرآباد: علامہ شبلی نے مسلمانوں کو نفسیاتی بیماری سے نجات دلانے کے لیے سیرت نگاری کا سہارا لیا۔ مغربی مورخین نے اسلام کی اہم شخصیات کی شبیہ مسخ کرنے کے لیے دانستہ طور پر ان حکمرانوں کی تاریخ لکھی جو نام نہاد مسلمان تھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد اکرام الدین نے بازگشت آن لائن ادبی فورم کی جانب سے گوگل میٹ پر منعقدہ علامہ شبلی نعمانی کی بے مثال تخلیق 'الفاروق' کے منتخب حصوں کی پیش کش اور گفتگو پر مبنی پروگرام میں بہ حیثیت مہمان خصوصی اظہار خیال کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ الفاروق تاریخ نگاری کی روایت اور اصولوں پر پوری طرح کھری اترتی ہے۔ شبلی نے عربوں کی تاریخ نویسی کی روایت اور درایت سے کام لیتے ہوئے سیرتیں لکھیں۔ سیرت نگاری کا نقش اول الفاروق اتنا مکمل، معیاری اور عمدہ ہے کہ یہ آج بھی بہترین سوانح تسلیم کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب خصوصاً کلاسیکی متون کی قرأت اور تفہیم کے حوالے سے بازگشت آن لائن ادبی فورم کی پیش رفت قابل رشک ہے۔ پروفیسر بیگ احساس، نامور افسانہ نگار اور سرپرست بازگشت آن لائن ادبی فورم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ شبلی چاہتے تو حالی کی طرح غالب اور سرسید جیسی کسی شخصیت کا انتخاب کرسکتے تھے لیکن شبلی نے 'ہیروز آف اسلام' کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا مقصد نوجوانوں کے ضمیر میں ملت کی خودی کا احساس جگانا اور اجتماعی شعور کو اسلامی نہج پر لگانا تھا۔ شبلی اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھیں تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی کا خیال پیدا ہوا۔ ڈاکٹر ابوشہیم خاں، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے کہا کہ شبلی نے تاریخی شعور اور علم و آگہی کو بروئے کار لاکر فن تاریخ نویسی اور فن سیرت نگاری کا بہترین امتزاج پیش کیا۔ انھوں نے الفاروق لکھ کر فن تاریخ نویسی کا حق ادا کردیا۔ شاہد رضا ریسرچ اسکالر، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد نے نہایت موثر انداز و اسلوب میں الفاروق کے منتخب اقتباسات پیش کیے۔ ابتدا میں ڈاکٹر فیروز عالم استاد شعبۂ اردو

مانو نے علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) کی حیات و خدمات کا مختصر تعارف پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 جنوری 2021

اعزاز واکرام

سید توقیر زیدی

نئی دھلی: بالی ووڈ کے معروف نغمہ نگار اور شاعر سید توقیر زیدی کو اردو زبان و ادب کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں ملک زادہ منظور ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ انھیں ان کے اعزاز میں منعقدہ 'فن اور شخصیت' پر لائیو پروگرام میں دیا گیا۔ اردو زبان کے شعبہ میں گراں قدر خدمات کے عوض توقیر زیدی کے اعزاز میں ان کی فنی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک لائیو تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں انھیں یہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ملک زادہ جاوید نے توقیر زیدی کی شخصیت اور فن پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ توقیر زیدی کے بہت سے نغمات کے البم ریلیز ہو چکے ہیں جن میں میری چنری اڑ اڑ جائے (فالگنی پاٹھک)، جان من (پنکج ادھاس)، پیار کا موسم (منہر ادھاس)، ہلکی چاندنی (روپ کمار راٹھو، سونالی)، جوان ہوگئی ہو (امیت کھنہ)، نینوا (گلشن کمار ٹی سیریز) نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے سنگم کی لہریں (1990)، صحرا (1992)، غربت (2000) شائع ہو چکے ہیں جب کہ زیر طبع مجموعوں میں آہ و فغاں (نوحے، مرثیے)، موت و حیات (مثنوی)، منظوم (بھگوت گیتا) اور ڈرامہ جوش ملیح آبادی (13 قسطیں) شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 فروری 2021

مظفر حنفی کے نام پر عالمی اردو ایوارڈ شروع کرنے کا اعلان

جموں: عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار، مترجم، شاعر اور نقاد مظفر حنفی کے نام پر عالمی تحریک اردو تنظیم نے مظفر حنفی عالمی اردو ایوارڈ شروع کرنے کا اعلان کیا ہے جو اپریل 2021 کے پہلے ہفتے میں دیا جائے گا۔ یہ اطلاع تنظیم کی طرف سے جاری کردہ پریس ریلیز میں دی گئی ہے۔ ریلیز کے مطابق عالمی تحریک اردو کے صدر ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی نے عالمی تحریک اردو کے فیس بک لائیو پر اس ایوارڈ کا اعلان کیا۔ انھوں نے بتایا کہ عالمی تحریک اردو کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس 30 جنوری کو منعقد ہوا تھا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس سال سے عالمی تحریک اردو مظفر حنفی عالمی اردو ایوارڈ شروع کرے گی۔ انھوں نے بتایا کہ ایوارڈ کے طور پر 35 ہزار روپے کی رقم کے علاوہ ایک سرٹی فکیٹ اور ٹرافی بھی دی جائے گی اور آن لائن یا آف لائن پروگرام میں کسی ادبی شخصیت کو اس ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ عالمی تحریک اردو کے صدر نے تنظیم کے چیچ پر 25 صفحات پر مشتمل ایوارڈ کتابچہ بھی جاری کیا جس میں ایوارڈ کی مکمل تفصیل دی گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عالمی سطح پر اردو کے ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں، نقادوں، فنکاروں کے کام کا جائزہ لینے کے لیے 5 رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس میں نہ صرف ہندوستان کے ممبران شامل ہیں بلکہ ہندوستان سے باہر کے کچھ ادیبوں کو بھی کمیٹی ممبر کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی سے کہا گیا ہے کہ وہ 15 مارچ سے قبل اپنی سفارشات پیش کریں کہ 30 یا 31 مارچ کو اس بات کا اعلان کیا جائے گا کہ یہ ایوارڈ کس کو دیا جانا چاہیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 فروری 2021

رسم اجرا

اے ایم یو وائس چانسلر کے ہاتھوں آٹھ کتابوں اور نیوز لیٹر کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے آٹھ کتابوں اور نیوز لیٹر کا اجرا کیا۔ ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے صدی نمبر کے ساتھ ہی 'ریونیو میونل آف راجستھان' اور 'جل، جیون اور سماج' (ترتیب و تدوین: ڈاکٹر جبرئیل، شعبۂ تاریخ)، 'ری اسیسنگ گاندھین تھاٹ' (ترتیب: ڈاکٹر عامر ریاض اور شاہد الحق شعبۂ فلسفہ)، 'پروپیگیشن اینڈ جینیٹک مینوپولیشن آف پلانٹس' (ترتیب و تدوین: ڈاکٹر ارم صدیقی، شعبۂ نباتیات)، 'ٹرپل طلاق ان اسلام۔ جوڈیشیری، پالیٹکس اینڈ میڈیا' (سمینار مقالات، شعبۂ اسلامی علوم، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر عبیداللہ فہد، ڈاکٹر اعجاز احمد اور ڈاکٹر بلال احمد کٹی)، علی گڑھ جرنل آف لنگوسٹکس، صدی شمارہ اور اے ایم یو جرنل آف لینگویج اینڈ میڈیا ڈسکورس (شعبۂ لسانیات)، لاء سوسائٹی نیوز لیٹر 2020، خاموشی جرم ہے (محمد حنیف، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو) کا اجرا وائس چانسلر نے کیا۔ ریونیو مینول آف راجستھان میں راجستھان کے ریونیو ریکارڈ کے بنیادی ماخذ 'ارہ سٹا' پر بحث کرتے ہوئے علاقہ کی زراعت، ماحولیات، بینکنگ اور اکاؤنٹنگ نظام، کسانوں کے احتجاج، جرم و سزا، آبادی اور سماجی و شہری تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'جل جیون اور سماج' میں مختلف ماہرین ماحولیات کے مضامین شامل ہیں۔ دونوں کتابوں کے اجرا کے موقعے پر مصنفین کے ساتھ شعبۂ تاریخ کے سربراہ پروفیسر عشرت عالم اور پروفیسر یعقوب علی خان موجود تھے۔ فلسفہ شعبہ کی کتاب 'ری اسیسنگ گاندھین تھاٹ' میں گاندھی جی کے افکار و نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں سولہ ابواب ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر سیدہ نزہت زیبا (ڈین، فیکلٹی آف آرٹس)، شعبۂ فلسفہ کے سربراہ پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی، ڈاکٹر عامر ریاض اور شاہد الحق موجود تھے۔ نباتیات شعبہ کی کتاب 'پروپیگیشن اینڈ جینیٹک مینوپولیشن آف پلانٹس' میں ادویاتی و خوشبویاتی پودوں کے جینیاتی عمل اور تبدیلیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے اجرا کے موقعے پر ڈاکٹر ارم صدیقی اور فیکلٹی آف لائف سائنس کے ڈین پروفیسر وسیم احمد، شعبۂ نباتیات کے سربراہ پروفیسر نفیس اے خان، پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی اور دیگر اساتذہ موجود تھے۔ 'ٹرپل طلاق ان اسلام۔ جوڈیشیری، پالیٹکس اینڈ میڈیا' شعبۂ اسلامی علوم کے سمینار مقالات کا مجموعہ ہے، جس کے اجرا کے موقعے پر ڈاکٹر عبیداللہ فہد، ڈاکٹر اعجاز احمد اور ڈاکٹر بلال احمد کٹی موجود تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 4 فروری 2021

اردو صحافت کا شمس

اریہ: صحافی عبدالقادر شمس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دانشوروں نے کہا کہ دہلی کی آرام دہ زندگی چھوڑ کر گاؤں کی تنگ گلیوں کی فکر اور اسے سنوارنے کی کوشش وہی شخص کر سکتا ہے جو ایمانی جذبہ اور پہاڑ جیسا عزم رکھتا ہو۔ یہ بات مرحوم کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب 'اردو صحافت کا شمس' کے اجرا کے موقعے پر متعدد دانشوران نے کہیں۔ دانشوروں نے کہا کہ صحافی ڈاکٹر مولانا عبدالقادر شمس کی شخصیت کچھ ایسی ہی تھی، وہ سکھ کی زندگی چھوڑ کر سیمانچل کی پسماندگی کے خاتمے اور نئی نسل کو پروان چڑھانے کے لیے ہمہ وقت بے چین رہتے تھے۔ انھوں نے جہاں صحافت کی بلندیوں کو چھوا، پوری دنیا میں اپنی اہمیت کا پرچم لہرایا، وہیں ارریا ضلع میں دعوت ٹرسٹ کے زیر اہتمام مدرسہ، اسکول، ہیلتھ سنٹر اور رفاہی کاموں کے ذریعے اپنے مشن کا آغاز کیا۔ انکم ٹیکس کمشنر مسٹر اسلم حسن نے کہا کہ بھائی عبدالقادر میری زندگی کا حصہ اور میرے مشن کے یار تھے۔ وہ ہمہ وقت میرے سماج کو پروان چڑھانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، ان کے مشن کی تکمیل کے لیے میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ جماعت اسلامی کے سابق امیر حلقہ بہار الحاج نیر الزماں نے کہا کہ سیمانچل نے ڈاکٹر عبدالقادر شمس اور ریٹائرڈ جج زبیر الحسن غافل کی

شکل میں دو ہیرے کھودیے ہیں۔ ان کے ناموں پر تعلیمی اور ادبی ادارے قائم کرکے کام کیا جائے۔ ماہر تعلیم الحاج محمد محسن نے کہا کہ دونوں مرحومین کو جو بھی مہلت ملی، اسے انھوں نے اچھے کاموں میں لگایا۔ تعارفی کلمات میں مرحوم کے رفیق کار اور دعوت ٹرسٹ کے معتمد مولانا محمد عارف قاسمی نے کہا کہ مولانا عبدالقادر شمس اور جج زبیرالحسن غافل ہمیں اس طرح بیچ راستے میں چھوڑ کر چلے جائیں گے، سوچا نہیں تھا، لیکن وہ اپنے حصے کا کام کرگئے، اب اس کی آبیاری اور تکمیل ہم سبھوں کے کاندھوں پر ہے۔ صحافی پرویز عالم، دین رضا اختر، طارق ابن ثاقب، مفتی عبدالوہاب، مفتی انعام الباری، مرحوم کے فرزند عمار جامی متعلم جے این یو کے علاوہ متعدد دانشوران نے خطاب کیا۔ صحافی عبدالواحد رحمانی نے کتاب کے مولف صحافی شاہ عالم اصلاحی کی کوششوں کو سراہا۔ نظامت کی ذمے داری مولانا شاہد عادل نے نبھائی اور شیخ الحدیث مفتی علیم الدین قاسمی کی دعا پر مجلس ختم ہوئی۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 4 فروری 2021

خاموشی جرم ہے

علی گڑھ: اردو زبان کا رسم الخط سیکھنا نہ صرف ہم سب کے لیے ضروری ہے بلکہ یہی اس زبان کی بقا اور تحفظ کی ضمانت ہے۔ جب تک لکھنا انسان کو نہیں آئے گا اس وقت تک کسی بھی زبان کی حفاظت نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ باتیں آج یہاں ایڈمنسٹریٹو بلاک میں واقع اپنے دفتر میں 'خاموشی جرم ہے' کی رسم اجرا کے دوران وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر طارق منصور نے کہیں۔ وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور، صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد علی جوہر اور سرسید ہال ساؤتھ کے پرووسٹ بدرالدجی خان کے ہاتھوں شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر محمد حنیف خان کے اخبارات میں شائع شدہ کالموں کے مجموعے کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر طارق منصور نے اس بات پر زور دیا کہ طلبا کو ابتدائی درجات سے ہی اردو کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ ملک کی ریاستوں بہار، بنگال، مہاراشٹر وغیرہ میں اردو کی صورت حال پر بھی انھوں نے گفتگو کی۔ شعبہ اردو کی اردو خدمات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ ہم اس بات کے لیے مسلسل کوشاں ہیں کہ شعبہ اردو مزید ترقی کرے، جس کے لیے فنڈ وغیرہ کی کمی نہیں آنے دی جائے گی۔ انھوں نے مصنف کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ شعبہ اردو صرف ادب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ سماجی سروکاروں سے بھی اتنا ہی تعلق رکھتا ہے جتنا ادب اس کے لیے اہمیت کا حامل ہے جس کی دلیل یہ کتاب ہے۔ اس سے قبل پروفیسر بدرالدجی خان اور پروفیسر محمد علی جوہر نے کتاب سے متعلق اظہار خیال کیا۔ وائس چانسلر کے ذریعے اردو کے لیے کی جانے والی کوششوں کو سراہا۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ میری نگرانی میں محمد حنیف خان اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اسی دوران دو کتابوں کی اشاعت خوشی کی بات ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 فروری 2021

کبیرالدین فاران کی تین کتابوں کا اجرا

پانی پت: خانقاہ عالیہ مجددیہ سرہند شریف کے سجادہ نشین خلیفہ سید محمد صادق کے ہاتھوں مولانا کبیرالدین فاران مظاہری کی 'خطبات فاران'، 'فاران ریڈیائی تقریریں' اور 'استاذ فرش سے عرش تک لے جانے والی ذات' کا اجرا ہوا۔ قابل ذکر ہے کہ ریڈیائی تقاریر میں ہادی عالم کی سیرت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور خاص کر برادران وطن کی نظر میں آنحضرتؐ کی سیرت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان ریڈیائی تقاریر کا انداز تو مکمل تقریری ہے، تاہم ان میں مضبوط دلائل کے ساتھ کلام کیا گیا ہے۔ خطبات فاران میں حضرت مجدد الف ثانی کے دور کا خاصا تذکرہ ہے، کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حضرت مجدد کو اس وقت آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ تیسری کتاب میں استاد کے مقام و مرتبہ سے گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک استاد کو مربی ہونا بھی ضروری ہے اور ماہر نفسیات بھی! تاکہ بچوں کی درست تعلیم ہوسکے۔ اس موقعے پر خلیفہ سید صادق نے کہا تینوں کتابیں اپنی اشاعت کے کئی ایڈیشنوں میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ تقریب میں مولانا ندیم الواجدی دیوبند، مولانا عمران مجددی، مولانا ارشد کبیر، سعید اسعد، ماسٹر حفظ الباری، مولانا ولی الدین ولی شمالی وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2021

'تعلیمی سفر' کے ڈاکٹر م ق سلیم نمبر کی رسم رونمائی

حیدرآباد: الحنا ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی حیدرآباد کی جانب سے سائبان اردو ہال میں ممتاز ادیب و نقاد، ماہر تعلیم ڈاکٹر م ق سلیم پر ماہنامہ 'تعلیمی سفر' کے خاص نمبر کی

اشاعت پر ایک تقریب کا اہتمام پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو کی صدارت میں ہوا جس میں مہمان خصوصی، ڈاکٹر فاروق شکیل، ممتاز مزاحیہ شاعر شاہد عدیل، ممتاز افسانہ نگار محمد مجیب احمد، صاحبزادہ مجتبیٰ فہیم مدیر رنگ و بو، محبوب خان، اصغر ممتاز صحافی ایف ایم سلیم نے شرکت کی۔ رسم اجرا صدر جلسہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انھوں نے ڈاکٹر م ق سلیم کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے باک اور حقیقت پسند قلم کار ہیں جو مسلسل لکھ رہے ہیں اور انھوں نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ پورے ہندوستان میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ انھوں نے مدیر رسالہ ڈاکٹر خلیل صدیقی کو مبارکباد دی اور کہا کہ یہ ادب کی خدمت ہے۔ مہمان خصوصی ممتاز شاعر جانشین عدیل نے کہا کہ ڈاکٹر م ق سلیم کی شخصیت ہمہ پہلو ہے۔ وہ شاعری چھوڑ کر ہر صنف میں لکھتے ہیں۔ ممتاز شاعر شاہد عدیلی نے ان پر ایک خوبصورت نظم سنائی جس میں ان کے کارناموں کا ذکر کا اور ان کے تمام اوصاف کا احاطہ کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر میم۔ قاف۔ سلیم، حیدرآباد، 5 جنوری 2021

ایک مختصر علمی سفر

سہارنپور: جامعہ رحمت الفت نگر گھگھروڑی میں واٹس ایپ اور ٹیلی گرام چینل کی دنیا میں مشہور گروپ 'علم و کتاب' کے کامیابی کے چار سال پورے ہونے اور اس کے نگراں اعلیٰ مولانا عبدالمتین منیری بھٹکلی کے دہلی و اطراف کے ایک مختصر علمی سفر کی رونمائی کے موقعے پر شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں علم و کتاب سے وابستہ معروف دینی و عصری جامعات کے اساتذہ و اہل دانش نے شرکت کی۔ قاری محمد اسجد کی تلاوت اور مولانا ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی ناظم و کنوینر کی نعت و خیر مقدمی کلمات سے باضابطہ پروگرام شروع ہوا۔ بعد ازاں محمد ساجد کھنجناوری نے انعقاد تقریب کی غرض و غایت کے ذیل میں سوشل میڈیا کے جائز اور ضروری استعمال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے علم و کتاب کو افادہ و استفادہ کا ایک سنجیدہ فورم بتایا، دریں اثنا مولانا منیری کے سفرنامہ اور مغیثی کیلنڈر 2021 کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس موقعے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ ہمیں علم و مطالعہ کے فروغ کی ممکنہ کاوشوں اور ترجیحات کے تعین سے گریزاں نہیں ہونا چاہیے، اب جبکہ مقتدر علمی شخصیات کا کال پڑ رہا ہے اور دانش و فکر کے حقیقی سرچشمے خشک ہوا چاہتے ہیں تو نئی نسل کی راست تعلیم و تربیت کا مسئلہ بڑا اہم ہو جاتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا منیری اپنی

بساط بھر کوششوں سے فیضان و افادے کی صدا لگا رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے استاذ مفتی اشرف عباس قاسمی نے کہا کہ یوں تو سفرنامہ کی تاریخ صدیوں کا سفر طے کرچکی ہے لیکن اردو میں بھی سفرنامہ کی روایت اب کافی پرانی ہوگئی ہے، بازارِ علم میں بے شمار نئے پرانے سفرنامے دستیاب ہیں جن کی اپنی خصوصیات ہیں۔ مولانا منیری کا یہ سفرنامہ گو مختصر ہے لیکن اپنی جامعیت کے لحاظ سے خوب سے خوب تر کا مصداق ہے۔ پروگرام کی صدارت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مفتی محمد ساجد کھجناوری اور ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ مولانا عبدالخالق مظاہری نے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 جنوری 2021

حرف امتیاز

سہارنپور: دہلی روڈ پر واقع کے آر پلازہ کے ہال میں عالمی شہرت یافتہ مشہور مصنف، ادیب اور شاعر انیس میرٹھی، حاجی یونس کوثر ایڈوکیٹ، راؤ منفیت علی خاں ایڈوکیٹ، طارق مرزا ایڈوکیٹ، شاہ عالم ایڈوکیٹ، سابق سی ایم اتراکھنڈ ہریش راوت کے سی ای او سید قاسم، ڈاکٹر قدسیہ انجم اور سابق ممبر اسمبلی راؤ نعیم خان نے ایک ساتھ معروف وکیل اور شاعر سید رونق علی کے اردو مجموعہ کلام حرف امتیاز کا اجرا کرتے ہوئے مصنف کو دلی مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی انیس میرٹھی نے کہا کہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ ہندی انگریزی میں بھی جو کچھ آپ نے لکھا اور پڑھا وہ کافی سراہا گیا ہے۔ سینئر صحافی عیسیٰ اسعدی نے اس موقعے پر رونق شیرکوٹی اور ان کے مجموعہ کلام کی بھرپور تعریف کی عیسیٰ اسعدی نے اور کہا کہ قانونی مشیر کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد بھی اردو سے بے پناہ محبت اور اردو شاعری سے لگن کا ثبوت پیش کرتے ہوئے شائع کروا کر عمدہ مجموعہ کلام لکھنا اور اس کو کڑی محنت سے عوام کے ہاتھوں میں سونپنا ایک بڑے حوصلے کا کام ہے۔ روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 جنوری 2021

عوامی مرثیے کی روایت

نئی دہلی: معروف صحافی و ادیب لئیق رضوی کی تصنیف 'عوامی مرثیے کی روایت' پر ایک مذاکرے کا انعقاد غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی کے زیر اہتمام اکادمی آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ منعقدہ مذاکرے کی صدارت سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر خالد محمود نے کی، بطور مہمان خصوصی آیت اللہ سید عقیل الغروی نے شرکت کی، جبکہ مذاکرے کا افتتاح مولانا آزاد یونیورسٹی جودھ پور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے کیا۔ مقررین میں اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ پروفیسر احمد محفوظ نے کتاب کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ جاوید مشری نے سلام پیش کیا جب کہ مشہور شاعر معین شاداب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ آیت اللہ سید عقیل الغروی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لئیق رضوی نے پچیس برسوں کی محنت کے بعد یہ کتاب تالیف کی۔ یہ کتاب پچیس برسوں کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع کو پروجیکٹ بنا کر اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ تمام اصناف سخن اپنے انداز سے تربیت کرتی ہیں، لیکن مرثیہ آپ کو شقی القلب بننے سے روک لیتا ہے۔ عوامی مرثیے میں غریب، نادار اور ناآسودہ حضرات کے برجستہ جذبات ملتے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ عوامی مرثیے کی روایت کو لئیق رضوی نے جلا بخشی ہے۔ عوامی مرثیے کی روایت ہمیں بتاتی ہے کہ کربلا ہمارے شعور کا نہیں بلکہ لاشعور کا حصہ ہے۔ اس کتاب کے اندر خاص بات یہ ہے کہ شمالی ہند، پنجاب، اودھ اور دکن وغیرہ میں بھی روایات اور نمونے موجود ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ کتاب میں لئیق رضوی نے جو محنت کی ہے، وہ اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ میں لئیق رضوی کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، عوامی اظہارات کے مختلف طریقے ہیں، عوامی مرثیوں میں جو سچائی نظر آتی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ شہپر رسول نے کتاب کے مختلف ابواب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے لئیق رضوی کی صحافتی وابستگی اور اس کتاب کے تعلق سے بات کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی 16 جنوری 2021

ترفعات اور تذکرہ محدثین

گلبرگہ: راہی فدائی کی شاعری نئے مزاج، نئے ذائقے، نئی تلقیط اور انوکھے بیان کے ثروت مندانہ اسلوب سے عبارت ہے۔ وہ روایت اور جدیدیت سے ہم آہنگ نئی شعری بصیرت کو عصری حسیت سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کی شاعری کی تہہ داری اور گہرائی کے ساتھ نئی دریافت اور نئی بلاغت کا انفراد اور امتیاز عیاں ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جدید فکشن کے نمائندہ ممتاز اور منفرد ادیب و دانشور پروفیسر حمید سہروردی (سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ) نے کیا۔ وہ 31 جنوری کو گلبرگہ کی درسگاہ رحمانیہ میں جنوبی ہند کے معروف نقاد و محقق اور شاعر علامہ ظہیر احمد باقوی راہی فدائی کے شعری مجموعہ 'ترفعات' کی رسم اجرا انجام دے رہے تھے۔ اس موقعے پر ان کی تصنیف 'تذکرہ محدثین جنوب' کی رسم اجرا مولانا محمد یحییٰ باقوی نے انجام دی۔ ممتاز ادیب و صحافی جناب حامد اکمل ایڈیٹر روزنامہ 'ایقان' ایکسپریس نے افتتاحی خطاب میں ڈاکٹر راہی فدائی کو حقیقی معنوں میں نابغہ عصر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان اگلی نسلوں کو ہم پر فخر کرنے کا موقع اس لیے ملے گا کہ ہم نے راہی فدائی کو دیکھا ہے۔ معروف عالم و محقق ڈاکٹر عبدالحمید اکبر (صدر شعبہ اردو خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی گلبرگہ) نے اپنی تقریر میں کہا کہ راہی فدائی کی شاعری روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ہے۔ اس میں ان کا غیر معمولی تبحر علمی بھی کارفرما ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید اکبر نے کہا کہ ان کی دوسری کتاب 'تذکرہ محدثین جنوب' کو ان کے وسیع مطالعہ کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب جنوبی ہند کے 600 سالہ دور پر مشتمل ہے جس میں محدثین کے کردار اور کارناموں کو نہایت تحقیق اور تدقیق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابنائے باقیات گلبرگہ کے زیر اہتمام منعقدہ اس جلسہ رسم اجرا کا آغاز مولانا عبدالقادر رشادی کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ حافظ محمد اقبال نے نعت شریف پیش کی۔ مولانا عبدالحکیم باقوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا گیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ابنائے باقیات گلبرگہ کی جانب سے ڈاکٹر راہی فدائی اور مہمان مقررین کی شال پوشی کی گئی۔ قاضی اسد ثنائی کی دعا پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ طلبا و تلامذہ کے علاوہ ادب دوست حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

ہفت روزہ 'گواہ' گلبرگہ، فروری 2021

وفیات

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

برصغیر کے نامور محقق و مصنف ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے کراچی میں زندگی کی آخری سانس لی۔ ان کا خاندان اصلاً یوپی کے شاہجہاں پور سے تعلق

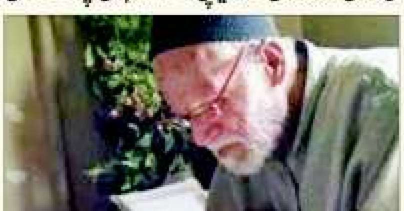

رکھتا ہے جہاں وہ 1940 میں پیدا ہوئے۔ جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں حفظ قرآن مجید کی تکمیل کی اور وہیں ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ شروع ہی سے اپنے چچا مولانا عبدالہادی خان جو مفتی کفایت اللہ دہلوی کے شاگرد رشید تھے، کے زیر تربیت رہے۔ تقسیم وطن کے بعد 1950 میں پاکستان چلے گئے اور باقی زندگی وہیں گزاری۔ پاک وہند کی سیاسی تاریخ، تحریک ولی اللہی، آزادی کی تحریکات، تنظیمات، شخصیات اور ان تحریکوں کے نشیب وفراز ان کی تحقیق کے خاص میدان رہے۔ ان موضوعات پر ایک سو پچاس سے زائد کتابوں کی تالیف کے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ کی زندگی، فکر، فلسفے اور سیاست پر وقیع کتابیں لکھیں۔ انھوں نے برصغیر کی دو اہم شخصیات مولانا حسین احمد مدنی سے متعلق آٹھ جلدوں پر مشتمل 'سیاسی ڈائری' اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد پر 'آثار و نقوش' لکھ کر ان کی سیاسی، مذہبی خدمات وجدوجہد پر انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا ہے۔

روزنامہ سچ کی آواز دہلی، 3 فروری 2021

پروفیسر حنیف کیفی

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سابق صدر اور اردو ادب کے مشہور نقاد اور محقق پروفیسر حنیف کیفی کا ہولی فیملی اسپتال میں 27 جنوری بروز بدھ صبح ساڑھے دس بجے انتقال ہوگیا۔

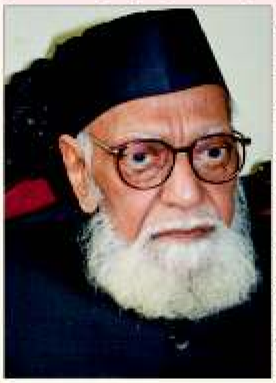

ان کے صاحب زادے محمد سراج عظیم کے مطابق ان کو 24 جنوری کو ہولی فیملی کے آئی سی یو میں داخل کرایا گیا تھا جہاں وہ جاں بر نہ ہوسکے اور بدھ کی صبح ساڑھے دس بجے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کا جامعہ میں سنہ 1972 میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا تھا اور سنہ 1998 میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر حنیف کیفی کی پیدائش سنہ 1934 میں اتر پردیش کے شہر بریلی میں ہوئی تھی۔ پروفیسر حنیف کیفی ایک سلجھے ہوئے نقاد و محقق تھے۔ ان کی پہلی تحقیقی کتاب اردو شاعری میں سانٹ تھی اور دوسری معرکۃ الآرا کتاب اردو میں نظم معرا آزاد نظم ہے، جس کی ادبی دنیا میں بہت پذیرائی ہوئی۔ کیفی صاحب تقریباً پندرہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، سراج عظیم، ڈاکٹر قمر سلیم قیصر، نعیم معراج، وسیم رضوان، حشیم منہاج، مستقیم اور امریکہ میں فائز تمیم صاحبزادگان ہیں ان کی ایک بیٹی اور بیٹے کا انتقال پہلے ہوچکا ہے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 28 جنوری 2021

ضیاءالدین احمد شکیب

حیدرآباد: فرزند دکن، ماہر اقبالیات و دکنیات معروف صوفی اسکالر ڈاکٹر ضیاءالدین احمد شکیب کا لندن میں انتقال ہوگیا۔

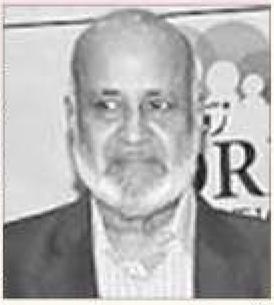

شہر حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیت ڈاکٹر ضیا الدین شکیب نے علم و ادب کے علاوہ شعر وشاعری میں بھی اپنا منفرد مقام بنایا تھا۔ وہ ماہر اقبالیات کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی تصوف وصوفی ازم سے بھی قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب ایک مخلص تاریخ داں رہے اور قلمی نسخوں کی شناخت میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ حضرت معزالدین ملتانی سے کافی قربت رکھتے تھے۔ 1933 میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب ریاست آندھراپردیش کے محکمہ آرکائیوز میں بھی کچھ مدت تک خدمات انجام دے چکے تھے لیکن کافی عرصہ سے وہ لندن میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے قطب شاہوں کے ایران سے تعلق اور گولکنڈہ میں ایرانی تہذیب پر بھی کافی تحقیقی کام سرانجام دیا ہے۔ مرحوم نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ہارون خان شیروانی سنٹر فار دکن اسٹڈیز کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا اور وہ اس سنٹر کے پہلے مشاورتی بورڈ کے رکن بھی رہے۔

نریندر لوتھر

حیدرآباد: معروف مورخ نریندر لوتھر کا 88 سال کی عمر میں 19 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وہ حیدرآباد کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں فریکچر کے باعث زیر علاج تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے علمی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے ان کے جسد خاکی کو وسپر ویلی، ویکھنا مہاپرستھانم لے جایا گیا۔ نریندر لوتھر ہوشیار پور پنجاب

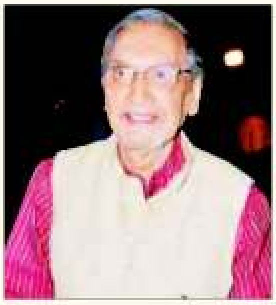

میں 1932 میں پیدا ہوئے، 1959 میں وہ آئی اے ایس افسر بن کر حیدرآباد آئے اور یہاں اپنی زندگی کا لمبا وقت گزارا اور بڑے پیمانہ پر کام کیے۔ انھوں نے گنگا جمنی تہذیب کے فروغ کے لیے اپنے آپ کو گویا وقف کیا ہوا تھا۔

نریندر لوتھر کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع رہا ہے، وہ مورخ اور شاعر ہونے کے ساتھ ایک مصنف، سماجی خدمت گزار، کالم نگار اور آئی اے ایس آفیسر بھی تھے۔ حیدرآباد کی تاریخ پر انھوں نے تیرہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتاب 'محمد قلی قطب شاہ' کو زیادہ مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی اور ان کی اردو کتاب 'بندکواڑ' کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ اردو میں ان کی متعدد کتابیں اور مضامین ومقالات ہیں، جن کے لیے انھیں کئی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ ان کی کئی کتابوں کا ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

رحمٰن جامی

حیدرآباد: استاد شاعر جناب رحمٰن جامی کا 20 جنوری

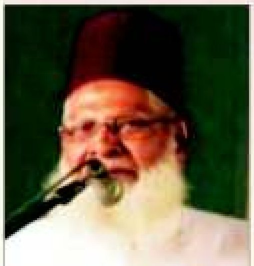

کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 87 سال تھی۔ ان کا شمار حیدرآباد کے بزرگ شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کا نام عبدالرحمٰن تخلص، جامی اور قلمی نام رحمٰن جامی ہے۔ وہ 18 اکتوبر 1934 کو ضلع محبوب نگر میں پیدا ہوئے۔ وہ کثیرالتصانیف شاعر کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے۔ اب تک ان کے 12 شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظرعام پر آچکے ہیں اور ان سب پر وہ انعامات واعزازات سے نوازے گئے۔ رحمٰن جامی کا متعدد اداروں سے بھی گہرا تعلق تھا۔ علاوہ ازیں مختلف انجمنوں سے بھی وہ وابستہ رہے۔ ان کی متحرک شخصیت سے اہل اردو نے بھرپور استفادہ کیا۔ اردو کے فروغ کے حوالے سے بھی انھیں یاد کیا جائے گا۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ آنے والی نسلیں ان سے دیر تک استفادہ کرتی رہیں گی۔

اردو لنکس، فروری 2021

منظور عثمانی

دیوبند: دیوبند کے نامور ادیب طنز ومزاح نگار منظور عثمانی کا مختصر علالت کے بعد 4 فروری کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ مولانا زبیر مدنی نے پڑھائی اور اوکھلا میں واقع قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ تدفین میں بڑی تعداد میں لوگ شریک تھے۔ مرحوم کا تعلق دیوبند کے قدیم عثمانی خانوادے سے تھا اور آپ ایک طویل مدت سے دہلی میں مقیم تھے۔

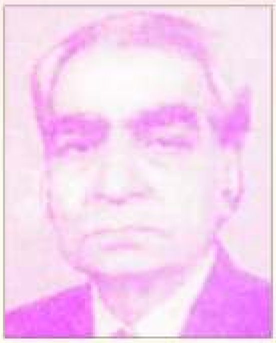

مرحوم کی پیدائش 1935 میں دیوبند میں ہوئی، مرحوم کی تقریباً 20 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں خوشبوئے وطن، یادیں میرے اپنوں کی، درس حیات کے نام قابل ذکر ہیں۔ گذشتہ کافی وقت سے وہ بیمار تھے۔ان کا آبائی مکان لال مسجد پر واقع ہے۔ان کے انتقال کو یہاں کے دانشوران، ادیبوں اور صحافیوں نے ادب کا نقصان قرار دیا۔ اس سلسلے میں ان کے انتقال پر معروف عالم دین مصنف مولانا ندیم الواجدی نے اپنے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ منظور عثمانی کی وفات تعلیمی اور ادبی دنیا کے لیے بڑا سانحہ ہے۔ اگر ان کی وفات کو اردو کے طنز ومزاح کے ایک عہد کے خاتمے سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ اور ممتاز ادیب مولانا نسیم اختر شاہ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ منظور عثمانی دیوبندی مرحوم شگفتہ قلم پختہ نگارش اور خوبصورت اسلوب کے مالک تھے۔ان کی طنز ومزاح سے بھرپور تحریریں گہری بصیرت اور طویل تجربات کا آئینہ ہوتیں،لطیف پیرائے میں لکھنے کا سلیقہ اور ہنر تھا،وابستگی تدریس کے پیشے سے تھی۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یوپی رابطہ کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مرحوم انتہائی وضعدار اور رشتوں کو نباہنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 فروری 2021

عادل صدیقی

دیوبند: آل انڈیا ریڈیو دہلی کے سابق ملازم، دارالعلوم دیوبند کی منتظمہ کمیٹی کے رکن، صحافی اور ادیب عادل صدیقی کا طویل علالت کے سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

عادل صدیقی 1930 میں دیوبند کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم مکمل ہونے کے بعد سہارنپور، مظفرنگر اور سیوہارہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعدازاں وہ حکومت ہند کے اطلاعات ونشریات کے محکمہ سے بطور اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر منسلک رہے اور 1981 میں اپنے رٹائرمنٹ کے بعد قومی آواز، الجمعیۃ اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔'یوجنا' اور 'آجکل' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ عادل صدیقی اردو اور انگریزی زبانوں کے ماہر تھے۔ ملک میں مختلف رسائل، میگزین اور اخبارات میں ان کے مضامین اور تجزیے تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہتے تھے۔ انھوں نے انگریزی زبان کی متعدد کتب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد عادل صدیقی دیوبند واپس آگئے اور دارالعلوم دیوبند کے دفتر محاسبی کے ناظم اور ادارہ کے ترجمان کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران وہ آل انڈیا ریڈیو کے مخصوص پروگرام 'اردو سروس'، 'اردو مجلس' اور اردو نیوز کے مختلف پروگراموں میں عرصہ دراز تک شرکت کرتے رہے۔ عادل صدیقی کی وفات پر متعدد شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 جنوری 2021

زبیر الحسن غافل

ارریا: طنز ومزاح کے ممتاز شاعر اور سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ سیشن جج زبیر الحسن غافل کا پٹنہ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں مختصر علالت کے بعد 27 جنوری 2021 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 77 سال تھی۔ پسماندگان

میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے ایک بیٹی ہیں۔ ان کی نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں کی کملداہا میں ادا کی گئی۔ ذرائع کے مطابق اچانک طبیعت بگڑی تو پورنیہ کے اسپتال میں داخل کرائے گئے اور طبیعت زیادہ بگڑی تو پٹنہ کے پارس اسپتال میں بھرتی کیا گیا اور شام ساڑھے سات بجے مالک حقیقی سے جاملے۔ وہ طویل عرصے سے گردے کے عارضہ میں مبتلا تھے اور ان کے گردے کی پیوندکاری بھی ہوئی تھی۔ مسٹر زبیر الحسن غافل طنز ومزاح کے مشہور شاعر تھے اور سیمانچل میں اپنی شناخت رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش 7 جنوری 1944 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے 1966 میں پورنیہ کالج سے بی ایس سی اور پٹنہ یونیورسٹی سے 1968 میں ایل ایل بی کیا تھا اور اپنے آبائی شہر ارریہ میں 1969 میں وکالت شروع کی تھی۔ اس کے بعد وہ جج منتخب کیے گئے اور مختلف مقامات پر انھوں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ 2004 میں ریٹائرمنٹ کے بعد لوک عدالت کے جج بھی رہے۔ ان کے انتقال پر علمی وادبی دنیا کی سرکردہ شخصیات نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ بہار اردو اکیڈمی کے سابق سکریٹری اور سابق بیوروکریٹ مشتاق احمد نوری نے کہا کہ وہ دیرینہ مشفق اور ہمدرد سے محروم ہوگئے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے انتقال سے ارریہ کے ایک زریں ادبی دور کا خاتمہ ہوگیا۔ حقانی القاسمی نے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے زبیر الحسن غافل کے انتقال کو سیمانچل کا ایک عظیم خسارہ قرار دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 جنوری 2021

اے ڈی راہی

جودھپور: معروف شاعر اے ڈی راہی کا 14 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے 40 برسوں تک اردو درس وتدریس کی

خدمت انجام دیں۔ راہی صاحب کے تین شعری مجموعے برف کا جسم، دھوپ کا سائبان اور منزلیں دور کہاں منظر عام پر آچکے ہیں۔ راجستھان کے وزیراعلیٰ اشوک گہلوت نے بھی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی اور سماجی خدمات کو یاد کیا۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر نثار راہی، مدھیہ پردیش، 6 جنوری 2021

غلام مصطفیٰ خان

ممبئی: مشہور کلاسیکی گلوکار اور موسیقار استاد غلام مصطفیٰ خان کا 89 برس کی عمر میں 17 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ انھوں نے ممبئی کے باندرہ میں واقع اپنی رہائش گاہ میں آخری سانس لی۔ استاد غلام مصطفیٰ خان کی وفات پر لتا

منگیشکر نے تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ خان استاد غلام مصطفیٰ خان پر 15 سال قبل دماغی فالج کا حملہ ہوا تھا جس کے بعد سے وہ مسلسل علیل تھے اور چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ حکومت ہند نے انھیں 1991 میں پدم شری 2006 میں پدم بھوشن اور 2018 میں پدم وبھوشن کے اعزازات سے نوازا تھا۔ وہ 3 مارچ 1931 کو اتر پردیش کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئے۔ غلام مصطفیٰ خان نے اپنا پہلا فلمی گانا مراٹھی زبان میں 1951 میں گایا۔ پھر انھوں نے مراٹھی اور گجراتی فلموں میں گانا شروع کردیا۔ انھوں نے اپنی 70 سے زیادہ دستاویزی فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگایا اور بہت سے قومی اور بین الاقوامی اعزازات حاصل کیے۔ انھوں نے اپنے چاروں بیٹوں کو بھی موسیقی کی تعلیم دی اور وہ بھی پیشہ ورانہ گلوکار ہیں۔ ان کے پوتے فیض اور عامر نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2021

خورشید انور

پٹنہ: محکمہ راج بھاشا کے سابق سرکردہ ملازم اور نامور شاعر و ادیب ڈاکٹر خورشید انور کا 18 جنوری کو حرکت قلب بند ہوجانے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 61

سال تھی۔ پسماندگان میں بیوی و والدہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ خورشید انور کا شمار ریاست کے معروف شاعر، ادیب اور بہترین ناظم مشاعرہ کے طور پر ہوتا تھا۔ وہ اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ میں اردو مترجم کے عہدے پر مامور تھے اور ایک مہینے قبل ہی اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ انھوں نے گیا سے میٹرک پاس کیا تھا جبکہ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ معروف ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کی نگرانی میں انھوں نے پروفیسر آل احمد سرور پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے منعقد ہونے والے شعری پروگراموں کی اکثر نظامت بھی کیا کرتے تھے۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور ان کی کئی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں جس میں عزم سفر کافی مقبول ہوئی۔ وہ کئی سالوں تک بہار اسٹیٹ حج کمیٹی سے بھی وابستہ رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جنوری 2021

غلام نبی شیدا

سری نگر: وادی کشمیر کے سینئر صحافی اور اردو روزنامہ 'وادی کی آواز' کے مالک و مدیر غلام نبی شیدا طویل علالت کے بعد انتقال کرگئے۔ وہ 70 برس کے تھے۔ ذرائع نے تفصیلات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ سینئر صحافی غلام نبی شیدا سری نگر

میں واقع اپنی رہائش گاہ پر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان کے پسماندگان میں صرف ایک بیٹی ہے جبکہ ان کی اہلیہ سال 2015 میں راہی ملک عدم ہوچکی ہیں۔ مرحوم صحافی کو آبائی وطن جنوبی کشمیر کے ضلع پلوامہ کے گوری پورہ گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 20 جنوری 2021

سمیع قریشی

ممبئی: ممبئی اور مہاراشٹر کے معروف سماجی کارکن اور صحافی سمیع احمد قریشی کا 73 سال کی عمر میں 4 فروری کو دورہ قلب کی وجہ سے وسطی ممبئی کے دادر علاقے میں واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ماہم قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا، پسماندگان میں دو بیٹے اور بیوہ ہیں۔ سمیع احمد قریشی نے ایک سماجی خدمت گار کی حیثیت سے کریئر کی شروعات کی اور آخر وقت تک خدمت خلق اور لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے سرگرداں رہے۔ ممبئی ہی نہیں بلکہ ملک بھر کے اردو اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس سے قبل وہ روزنامہ اردو ٹائمز اور ہندوستان سے وابستہ رہے تھے۔ وہ مسلم معاشرے کی اصلاح اور تعلیمی اور سیاسی بیداری کے مقصد سے لکھتے تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 5 فروری 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات جوش (جلد دوم، سوم)

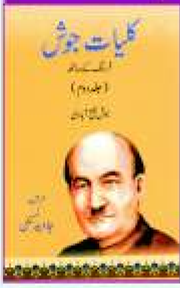

مرتب: جاوید نسیمی
صفحات: 974 (دوسری جلد)
514 (تیسری جلدی)
قیمت: 425 روپے (دوسری جلد)
240 روپے (تیسری جلد)

دکن میں اردو

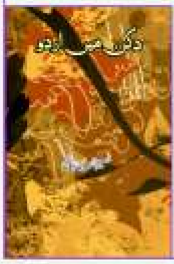

مصنف: نصیر الدین ہاشمی
پانچویں طباعت: 2020
صفحات: 945
قیمت: 340 روپے

اردو کی صوتی لغت

مصنف: نصیر احمد خاں
دوسری طباعت: 2020
صفحات: 1232
قیمت: 665 روپے

ہندوستانی نظام قانون

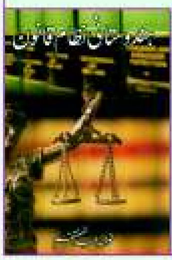

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
دوسری طباعت: 2020
صفحات: 381
قیمت: 190 روپے

کشمیر کی وادی

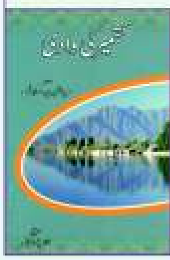

مصنف: سر والٹر روپرٹ لارنس
مترجم: غلام نبی خیال
دوسری طباعت: 2020
صفحات: 587، قیمت: 217 روپے

زراعت اور پیشہ ورانہ تعلیم

مصنف: سہراب علی، مترجم: ابوعبداللہ منصور
پہلی اشاعت: 2020
صفحات: 338
قیمت: 165 روپے

تعلیمی نفسیات

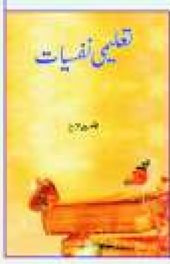

مصنف: طلعت عزیز
تیسری طباعت: 2020
صفحات: 242
قیمت 130 روپے

منٹو کے نادر خطوط

تحقیق و ترتیب: فاروق اعظم قاسمی
دوسری طباعت: 2020
صفحات: 62
قیمت: 55 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, March-2021, Vol.23, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/02/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

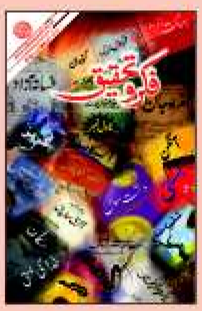
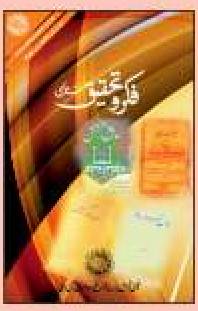

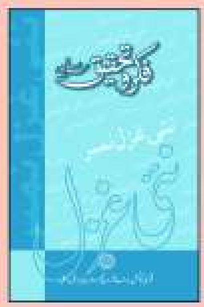
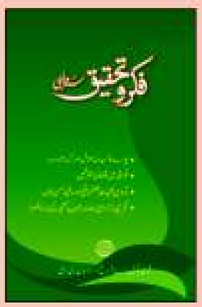

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025